جب ایمان کی بہار آئی

مجاہدِ کبیر حضرت سیّد احمد شہیدؒ (۱۲۴۶ھ) اور آپ کے عالی ہمّت و رُفقاء کے ایمان افروز واقعات جن کی کوششوں سے ہندوستان میں ایمان کی بہار آئی اور اسلام کی ابتدائی صدیوں کی یاد تازہ ہوگئی

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی

مجلس نشریاتِ اسلام
۱۔ کے ۔۳۔ ناظم آباد، ۱ کراچی ۱۸

سلسلۂ مطبوعات

۱۵

جب ایمان کی بہار آئی

مجاہد کبیر حضرت سید احمد شہید (م ۱۲۴۶ھ) اور آپ کے عالی ہمت رفقاء کے ایمان افروز واقعات جن کی کوششوں سے ہندوستان میں ایمان کی بہار آئی اور اسلام کی ابتدائی صدیوں کی یاد تازہ ہوگئی

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

مجلس نشریاتِ اسلام ۱/K/۳ ناظم آباد مینشن نزد برف خانہ ناظم آباد ۱ کراچی ۱۸

نام کتاب ——— جب ایمان کی بہار آئی
مصنف ——— مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی
کتابت ——— ظہیر احمد کاکوروی
سال اشاعت ——— ۱۹۷۷ء
طباعت ——— تنویر پریس
صفحات ——— ۲۸۰
تعداد ——— ایک ہزار
قیمت ——— ۱۸ روپے

ناشر

فضلِ ربّی ندوی

مجلس نشریات اسلام ۱/K-۳- ناظم آباد مینشن کراچی ۱۸
نزد برف خانہ۔ ناظم آباد

فہرست عنوانات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

تاریخ اسلام میں جب کبھی ایمان کی ہوائیں چلیں تو عقائد، اعمال اور اخلاق تینوں شعبوں میں حیرت انگیز واقعات بلکہ عجائبات کا ظہور ہوا اور شجاعت و جوانمردی، یقین و اعتماد، عفت و امانت، ایثار، خودشکنی، ہمدردی و جذبۂ خدمت، ایمان و احتساب، خارجی آرائش و زیبائش کی بے وقعتی، خودداری اور بلند نگاہی نیز عدل و انصاف، رحم دلی اور محبت اور وفاداری و جان نثاری کے ایسے نادر نمونے اور زندہ نظیریں یا تصویریں لوگوں کے سامنے آئیں، جو انسانیت کے حافظہ سے رفتہ رفتہ محو ہوتی جارہی تھیں اور جن کی تجدید و احیاء کی کوئی اُمید باقی نہ رہی تھی۔

ایمان کے یہ دلنواز جھونکے تاریخ کے مختلف وقفوں میں چلے، کبھی کم مدت کے لئے کبھی زیادہ عرصہ کے لئے، تاہم کوئی دورِ خزاں ان سے خالی نہ رہا اور تجدید و احیاء اور دعوت اسلامی کی تاریخ میں ان سب کا ریکارڈ اچھی طرح محفوظ ہے۔

ہندوستان میں ایمان کی یہ بادِ بہاری اور نسیم جانفزا تیرہویں صدی ہجری کے آغاز میں اس وقت چلی جب سید احمد شہیدؒ اور ان کے عالی ہمت رفقا نے اس ملک میں توحید، تجدید دین اور جہاد فی سبیل اللہ کا علم بلند کیا اور اسلام کی ابتدائی صدیوں کی یاد تازہ کر دی۔

سید صاحب نے دینِ خالص کی دعوت پر اپنی بنیاد رکھی انھوں نے مسلمانوں میں ایمان و یقین، جذبۂ اسلامی اور جہاد فی سبیل اللہ کی روح پھونک دی، ایک بڑی جماعت کو داعیانہ و مجاہدانہ بنیادوں پر منظم کیا اور ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کو اپنی دعوت و جہاد کا مرکز بنایا ان کا منصوبہ دراصل یہ تھا کہ آگے چل کر وہ پورے ملک سے انگریزوں کو بے دخل کرنے کی کوشش کریں گے اور کتاب و سنت کی بنیاد پر یہاں حکومت شرعیہ قائم کریں گے، ان مجاہدین نے پنجاب میں سکھوں کو (جو پنجاب پر قابض تھے اور جنھوں نے وہاں کے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا) کئی معرکوں میں شکست فاش دی۔

ان مجاہدین نے صوبۂ سرحد، پشاور اور اس کے اطراف میں عملی طور پر ایک اسلامی حکومت قائم کی، حدود شرعیہ کا اجرا عمل میں آیا اور اسلام کا نظام مالی و دیوانی بے کم و کاست قائم کیا گیا لیکن وہاں کے قبائل نے اپنی ذاتی اغراض اور قبائلی عادات و روایات کی خاطر اس نظام کا بالآخر خاتمہ کر دیا، آخر میں بالاکوٹ کے میدان میں ان سر بکف مجاہدین کی سکھوں سے آخری جنگ ہوئی اور اس معرکہ میں سید صاحب اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب اور ان کے بہت سے جلیل القدر رفقا اور مجاہدین نے جام شہادت نوش کیا۔

جماعت مجاہدین کے باقی ماندہ افراد پہاڑی علاقہ میں پناہ گیر ہوئے، ان جوانمردوں اور ہندوستان میں ان کے رفقا کار نے جہاد و قربانی اور ایمان و یقین کی شمع برابر روشن رکھی

انگریزوں نے بھی ان کا تعاقب برابر جاری رکھا، ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے۔ ان کی زمینیں اور مکانات ضبط کئے اور مقدمات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔[1] لیکن ان مجاہدین نے یہ سارے مصائب صبر و ضبط کے ساتھ اور ایمان و احتساب کے جذبہ سے برداشت کئے اور ان سے ادنیٰ درجہ کے اضطراب اور پریشانی کا اظہار نہیں ہوا۔

۱۳۷۲ھ (مطابق ۱۹۵۳ء) کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں یہ بات ڈالی کہ ایمان و احیاء دین کی اس عجیب اور اثر انگیز تاریخ کو ہلکے پھلکے ادبی انداز میں عربی زبان میں مرتب کیا جائے اور بغیر کسی مبالغہ اور رنگ آرائی کے اصل واقعات کو سادگی کے ساتھ اس طرح پیش کیا جائے کہ اس تحریک کے قائد کا اصل مرتبہ و مقام عرب دوستوں کے سامنے آجائے اور ان کو اندازہ ہو کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے کیسی وہبی صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں اور ان کے گرد کیسے طاقتور عناصر جمع تھے، تربیت اور تزکیۂ نفس کے شعبہ میں، نیز اخلاص، دعوت میں فنائیت، اور مقصد سے عشق میں ان کا مقام کتنا بلند تھا، اس سے ان کو اس مومن اور مجاہد اسلامی نسل کے اعلیٰ کردار، اخلاقی بلندی، اور سیرت کی پختگی نیز اُن کے پیرووں اور متبعین میں اسلامی دعوت اور ایمانی تربیت کے نمایاں اثرات کا بھی اندازہ ہو جو انکی کوششوں کے نتیجہ میں تیار ہوئی تھی، اس سلسلہ کے چند مضامین مصر کے مشہور ماہنامہ "المسلمون" میں جو اس وقت قاہرہ سے نکلتا تھا ۱۹۵۳ء میں شائع ہوئے، پھر تصنیف و تالیف کی دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے مجھے اس طرف توجہ کرنے کا موقع نہ مل سکا، اور اس واقعہ پر بیس سال گزر گئے۔

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے "THE GREAT WAHABI CASE" اور "INDIAN MUSALMANS" از W. W. HANTER

حال میں میرے بعض عزیزوں[ا] نے اس سلسلۂ مضامین کی طرف میری توجہ مبذول کی اور اس کے ادبی و واقعاتی پہلو اور انداز بیان کی اثر انگیزی کا ذکر کیا، میرے لئے اس عظیم شخصیت پر عربی زبان میں نئے سرے سے کوئی تصنیف اور نئی و مفصل تاریخ مرتب کرنا (جیسا کہ اس سے پہلے میں اُردو میں کر چکا تھا[۲]) موجودہ حالات میں بہت مشکل تھا، اس لئے مجھے یہی مناسب معلوم ہوا کہ اس سلسلہ کو مکمل کر دیا جائے، اور اس طویل تاریخ (جو ہزاروں صفحات[۳] پر پھیلی ہوئی ہے اور جس کا زمینی رقبہ ہزاروں میل سے اور زمانی رقبہ ایک صدی سے کسی طرح کم نہیں[۴]) کا خلاصہ جستہ جستہ واقعات کی شکل میں پیش کیا جائے۔

ایک ذہین و فہیم انسان ان متفرق اور منتشر شہ پاروں سے واقعات کی ایک پوری لڑی بآسانی تیار کر سکتا ہے اور اندازہ کر سکتا ہے کہ اس ایمانی مدرسہ نے کیسے کیسے گوہر شب چراغ پیدا کئے اور کیسے کیسے ناتراشیدہ پتھروں کے جوہر کو چمکایا اور ان کی قیمت کہیں سے کہیں پہونچا دی، مجھے امید ہے کہ یہ کتاب جدید اسلامی کتب خانہ کے

۱؎ بالخصوص محمد الحسنی وسعید الاعظمی ندوی مدیران البعث الاسلامی۔

۲؎ راقم سطور کی اردو کتاب "سیرت سید احمد شہیدؒ" مراد ہے جو دو حصوں میں ہے اور تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے (اس کا تازہ ایڈیشن مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ سے شائع ہو رہا ہے۔)

۳؎ مولانا غلام رسول کی کتاب "سید احمد شہید" جو چار حصوں میں ہے اور ۱۹۲۱ صفحات پر مشتمل ہے۔

۴؎ یہ تاریخ درحقیقت ۱۲۲۵ھ سے شروع ہوتی ہے جب سید صاحب نے اپنی مبارک جدوجہد کا آغاز کیا اور ۱۳۲۰ھ تک اس کا باقاعدہ سلسلہ قائم رہتا ہے، جس میں مولانا عبد اللہ بن ولایت علی صادقپوری امیر جماعت مجاہدین نے انتقال کیا، یہ پورا دور جماعت کی سرگرمی اور اولوالعزمی کا دور ہے اور جماعت کی قیادت و رہنمائی اس پورے زمانہ میں بغیر کسی توقف کے جاری رہی۔

خلا کو پُر کرنے گی، اور اس سے ان اہل درد وطلب کی تشنگی کسی حد تک دُور ہوگی جو جہاد اسلامی کے اس تابناک باب اور ہندوستان میں تجدید دین کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔

میں نے طالب علمی کے دور میں ابوالفرج اصبہانی کی مشہور کتاب "اغانی" کا بہت ذوق وشوق سے مطالعہ کیا تھا اور یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ اس کے ادب، فصیح زبان اور بہترین تعبیرات نے مجھے اس کتاب کا گرویدہ بنا لیا تھا، لیکن یہ دیکھ کر مجھے بڑی غیرت آئی کہ یہ زبان (جس میں قرآن نازل ہوا، اور جس زبان میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ گفتگو فرماتے تھے) نہایت حقیر اغراض کے لئے استعمال کی گئی ہے، اور نغمہ وآہنگ کے لئے وقف ہوگئی ہے، اور اس سے صرف اسلامی معاشرہ کے کمزور پہلوؤں کو نمایاں کرنے اور عیوب کے اظہار کا کام لیا گیا ہے، میری تمنا تھی کہ یہ قادر الکلامی یہ ذخیرۂ الفاظ اور حسن تعبیر اور قصوں کا ہلکا پھلکا اسلوب جو کتاب کی خصوصیت ہے، اعلیٰ مقاصد کے لئے استعمال ہو اور اس سے کسی حسین وجمیل تاریخ کے رخ زیبا سے پردہ اٹھایا جائے۔

میں نے ان واقعات میں جو بہت عجلت میں انتخاب کئے گئے ہیں، اسی اسلوب کی پیروی کی ہے، اگر میں اس کوشش میں کامیاب نہیں تو کم از کم حسن نیت اور جستجو وآرزو کا صلہ انشاء اللہ مجھے ضرور ملے گا۔

ان ایمان افروز واقعات کا اہم پہلو یہ ہے کہ اس سے اس شخصیت (روحی فداہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے جس کے دم سے بلکہ جس کے قدم کی برکت سے اس تاریخ کی پیشانی روشن اور تابناک ہے، جس کی وجہ سے سارے عالم میں ایمان کا نور پھیلا اور دعوت وعزیمت اور تجدید واحیاء دین کا سلسلہ قائم ہوا، تاریخ اسلام

کے تمام مجددین، مصلحین اور قائدین آپ ہی کی تربیت و دعوت کا رشحۂ فیض ہیں، دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جب درسگاہ نبوت کے طالب علم ایمان و اخلاص کے اس معیار پر تھے اور ان کی تاثیر و انقلاب آفرینی کا یہ حال تھا تو خود حضور اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حال کیا ہوگا، جن کو اللہ تعالےٰ نے ہدایت اور دین حق کے ساتھ مبعوث فرمایا، وحی سے سرفراز کیا، ابدی و لافانی کتاب عطا کی اور روح القدس جبرئیل امینؑ کے ذریعہ آپ کی مدد فرمائی، اس کے بعد آپ کے ان وفادار و جان نثار اصحاب کرام کا معیار کتنا بلند ہوگا جنھوں نے آپ کے دامنِ عاطفت میں پرورش پائی اور جن کی تربیت آپ کی نگاہوں کے سامنے ہوئی۔

اِن اخیر صدیوں میں ایسے مجددین و مصلحین کا وجود اور مرکز اسلام سے اتنی دور ہونے کے باوجود ان کی یہ اثر انگیزی دراصل اسلام کی ابدیت کی علامت ہے، اور اس بات کی دلیل کہ اس میں آج بھی ہر میدان کے لئے نئے مردانِ کار پیدا کرنے کی پوری صلاحیت ہے، اس کا سرسبز و سدا بہار درخت برابر پھل پھول دے رہا ہے، اور اسُ کا خزانہ اسی طرح معمور ہے۔

عالم نشود ویراں تا میکدہ آباد است

سید صاحب نے جو مبارک جماعت تیار کی خصوصیات میں سب سے نمایاں اور لائق ذکر بات اس کی جامعیت ہے، اس میں جہاد اصغر (تزکیۂ نفس) بھی تھا، اور جہاد اکبر (جہاد و قتال) بھی، خدا سے محبت بھی خدا کا خوف بھی، خدا کے لئے محبت بھی، خدا کے لئے نفرت بھی، زہد و عبادت بھی اور دینی حمیت اور اسلامی غیرت بھی، تلوار بھی اور قرآن بھی، عقل بھی اور جذبات بھی، گوشۂ مسجد میں تسبیح و مناجات بھی، اور گھوڑے کی پیٹھ پر تکبیر مسلسل،

بھی، یہ وہ صفات و کمالات جو اکثر سوانح نگاروں کی نظر میں ایک دوسرے سے متضاد اور متصادم نظر آتے ہیں، لیکن یہ سب در حقیقت اُس صحیح دینی فہم اور دینی شعور کا کرشمہ تھا، جو سید صاحب کی شخصیت اور صحیح تربیت کی وجہ سے جماعت مجاہدین میں پختہ اور راسخ ہو چکا تھا، اور زندگی کے سارے شعبوں پر حاوی تھا، اس کا دوسرا بڑا سبب یہ تھا کہ یہ دینی جماعت یا تحریک دینی تربیت کے اہم مرحلہ سے سرسری طور پر نہیں گزری تھی، اور بغیر تیاری کے اس نے کارزار حیات میں قدم نہیں رکھا تھا، اس نے ان معاملات میں بہت سوچنے سمجھنے کے بعد ہاتھ ڈالا تھا، اور اس کے لئے وہی راستے اختیار کئے تھے، جو منزل مقصود تک لے جاتے ہیں، یہ ایک صاحب یقین اور مجاہد نسل کی بہترین تصویر اور اخلاص وللّٰہیت کا وہ صحیح معیار اور دلکش نمونہ ہے، جو ہر زمانہ میں مطلوب اور شریعت کا مقصود ہے۔

یہ کتاب شعبان ۱۳۹۳ھ (۱۹۷۳ء) میں "إذا هبت ريح الإيمان" کے نام سے دار عرفات، دائرہ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی کی طرف سے ندوۃ العلماء کے عربی پریس میں شائع ہوئی، اور ممالک عربیہ میں اس نے بہت جلد شہرت و مقبولیت حاصل کر لی، ایسا معلوم ہوا کہ جیسے وہ ایک اہم خلا پر کرتی تھی، اور عرصہ سے اس کا انتظار تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو ہزار کا ایڈیشن چار مہینے کے قلیل عرصہ میں نکل گیا، مؤقر عربی اخبارات و رسائل میں اس پر تبصرے شائع ہوئے، اور عرب ناشرین نے اس کی دوبارہ اشاعت کی پیش کش کی، مناسب معلوم ہوا کہ اس کو اردو کے قالب میں بھی پیش کیا جائے، کہ وہ اس تحتی براعظم کے مسلمان نوجوانوں اور جدید نسل کی تربیت کے کام میں بڑی مدد دے سکتی ہے۔

اس کام کو مصنف کے برادر زادہ عزیز مولوی محمد الحسنی سلمہٗ نے بہت خوش اسلوبی سے انجام دیا، انھوں نے مصنف کی اصل کتاب "سیرت سید احمد شہید" (۱-۲) سامنے رکھی،

جس سے اس عربی کتاب کا اصل مواد لیا گیا تھا، انھوں نے کوشش کی کہ زیادہ سے زیادہ اصل کتاب کے الفاظ اور پیرایۂ بیان محفوظ رہے، اور ترجمہ میں تصنع اور انشاء پردازی سے کام لینے کے بجائے کتاب کے وہی الفاظ نقل کئے جائیں جن کے متعلق اندازہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اہل واقعہ کی زبان میں ادا کئے گئے ہیں، اور ان کے زیادہ سے زیادہ الفاظ محفوظ رکھے گئے ہیں، امید ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے اس جماعت کی سچی تصویر سامنے آجائے گی، اور ایمان میں تازگی اور روح میں بالیدگی پیدا ہوگی جس کا سامان ہماری نئی ادبیات میں روز بروز کم سے کم ہوتا چلا جا رہا ہے۔

مناسب معلوم ہوا کہ اصل کتاب سے پہلے ایک ایسے مضمون کا اضافہ کیا جائے۔ جس میں حضرت سید صاحب کی سیرت اور زمانہ مربوط و مسلسل طریقہ پر ناظرین کے سامنے آجائے تاکہ وہ ان متفرق واقعات کے درمیان ربط و وحدت پیدا کر سکیں، اور ان کو ان کے درمیان کوئی خلا اور ناہمواری ... محسوس نہ ہو، یہ کام بہت مشکل تھا اس لئے کہ سید صاحب کی محض سیرت اور سوانح "سیرت سید احمد شہید" ایک ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، اور اگر اس کے ساتھ جماعت کی تاریخ، ممتاز خلفاء و اہل تعلق کے کارناموں کو بھی شامل کر لیا جائے تو وہ اس سے بھی بڑے رقبہ کو گھیر سکتی ہے، چنانچہ مولانا غلام رسول مہرؔ جیسے کہنہ مشق ادیب اور مورخ کا قلم بھی اس کو ۱۹۲۱ صفحات سے کم صفحات میں سمیٹ نہیں سکا، اس دریا کو کوزہ میں بند کرنا بہت مشکل تھا، لیکن مصنف کے خواہر زادۂ عزیز مولوی سید محمد ثانی حسنی مدیر "رضوان" نے اس کام کو بڑے سلیقہ اور محنت سے انجام دیا، اور کم سے کم صفحات میں سید صاحب کی سوانح کا ضروری لیکن مختصر خاکہ پیش کر دیا، اس کو اس کتاب میں ایک مقدمہ یا ضمیمہ کے طور پر شامل کر دیا گیا ہے؛

امید ہے کہ اس سے قارئین کو اس کتاب کے واقعات کے پس منظر سمجھنے میں مدد ملے گی۔

ابوالحسن علی ندوی

دائرہ شاہ علم اللہ حسنیؒ
رائے بریلی

۲۰ ربیع الاول ۱۳۹۴ھ
۱۴ اپریل ۱۹۷۴ء یکشنبہ

حضرت سیّد احمد شہیدؒ

ولادت تا شہادت

۱۲۰۱ھ / ۱۷۸۶ء — ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء

ترتیب و تلخیص مولوی سید محمد ثانی صاحب حسنی مدیر ماہنامہ "رضوان" لکھنؤ

تیرہویں صدی میں ہندوستان کی حالت

تیرہویں صدی ہجری (اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل) میں ہندوستان سیاسی، مذہبی، اور اخلاقی حیثیت سے زوال کی آخری حد تک پہونچ چکا تھا، سلطنت مغلیہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا، سارے ہندوستان پر یا تو ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط تھا، یا اس کے حلیفوں کا، بچا کھچا ملک رئیسوں اور سرداروں کے قبضے میں تھا، جو یکے بعد دیگرے شکست کھاتے، اور اپنے اپنے علاقے انگریزوں کے حوالہ کرتے چلے جا رہے تھے، سلطنت مغلیہ کے فرماں روا شاہ عالم (جن کے عہد میں حضرت سید احمد شہیدؒ پیدا ہوئے) صرف نام کے بادشاہ رہ گئے تھے، دکن سے لے کر دہلی تک سارا علاقہ مرہٹوں کے رحم و کرم پر تھا، پنجاب سے لے کر افغانستان کے حدود تک سکھوں کا راج تھا، جن کی دستبرد سے

ہندوستان کا شمالی اور وسطی حصہ بھی محفوظ نہ تھا، دہلی اور اطراف دہلی مرہٹوں اور سکھوں کی غارت گری کا نشانہ بنے رہتے تھے، مسلمانوں کی سیاسی ساکھ گر چکی تھی، ان کا کوئی قائد اور شیرازہ بند نہ تھا، ان کو کمزور پا کر بیسیوں فتنے سر اٹھاتے، اور ان کو پامال کر کے رکھ دیتے۔

ملک میں مسلمانوں کی اخلاقی حالت اتنی گر چکی تھی کہ فسق و معصیت کی بہت سی باتیں آداب و تہذیب میں داخل ہو گئی تھیں، اور اس پر علانیہ فخر کیا جاتا تھا، شراب نوشی کوئی نادر بات نہ تھی، ارباب نشاط کا ہر طرف دور دورہ تھا، امراء اور متوسط طبقہ سے لے کر غرباء تک اسی معاشرت کا شکار تھے، اخلاقی انحطاط اور قومی بے حسی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ تیرہویں صدی کے آغاز میں کہ انگریزوں کے قدم پوری طرح جمے نہ تھے، متعدد مسلمان عورتیں یورپین تاجروں اور حکام کے گھروں میں تھیں، شرک و بدعت مسلمانوں میں کثرت سے موجود تھی، قبروں اور مردوں کے متعلق ایک مستقل شریعت وجود میں آ گئی تھی، بزرگان دین کے متعلق وہ سارے عقائد و خیالات دلوں میں گھر کر چکے تھے، جن کے لئے نصرانی اور یہودی اور مشرکین عرب بدنام ہیں، ہندوؤں اور شیعوں کے بکثرت رسوم اہل سنت کی معاشرت کا جزء بن گئے تھے، سنت و شریعت کو لوگ بھولتے جا رہے تھے، اسلامی شعائر اٹھتے جا رہے تھے، اچھے اچھے دیندار، اور علمی گھرانوں میں بھی قرآن و حدیث کے احکام کا لحاظ نہیں کیا جاتا تھا، بیوہ کا نکاح، میراث میں لڑکیوں کو حصہ دینا، اور سلام مسنون کو بہت جگہ معیوب سمجھا جاتا تھا، اسی طرح حج جیسے اسلام کے اہم رکن کی، راستہ کی تکلیف اور بدامنی کی بناء پر فرضیت ساقط کر دی گئی تھی قرآن شریف ایک چیستان سمجھا جانے لگا تھا جس کا سمجھنا، اور سمجھانا، اس پر غور و تدبر کرنا غیر علماء کے لئے ناممکن، اور شجر ممنوعہ قرار دیدیا گیا تھا۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہوگا کہ علمی، سیاسی، دینی اور روحانی حیثیت سے تیرہویں صدی کا یہ زمانہ بالکل تاریک اور ویران تھا، اور اس ملک میں کہیں زندگی کے آثار، اور کہیں روشنی کے مینار نہیں پائے جاتے تھے، تیرہویں صدی کا ابتدائی زمانہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا قابل ذکر عہد ہے، اس میں بعض ایسی باکمال اور ممتاز ہستیاں موجود تھیں، جن کی نظیر گذشتہ صدیوں میں بھی آسانی سے اور بکثرت نہیں ملے گی، دینی و علمی کمالات و سنت کے وسیع علم اور صحیح ذوق، ذکاوت واستعداد، وملکۂ علمی، درس وتدریس، تصنیف وتالیف، تبحر علمی، شعر وشاعری، تصوف وسلوک اور دوسرے علوم وفنون میں کمال رکھنے والی منفرد شخصیتیں اس صدی میں موجود تھیں، ان کے علاوہ اس دور قحط الرجال میں بھی دین کی اتنی طلب اور قدر باقی تھی، کہ ملک میں مکاتب، مدارس کا جال پھیلا ہوا تھا، چپہ چپہ پر خانقاہیں، اور روحانی مرکز تھے، علماء ملک کے مختلف شہروں میں علم ودین کی اشاعت کا کام کر رہے تھے، اور تصنیف وتالیف میں مشغول تھے، مدرسے طلباء علوم دینیہ سے، اور خانقاہیں مردانِ خدا سے معمور تھیں، اکابر اہل درس اور اہل طریق میں سے ہر ایک، ایک مستقل اور آباد مدرسہ اور خانقاہ تھا، اور کہیں کہیں یہ دونوں مرکز جمع تھے۔

یہ ضرور ہے کہ دین وعلم کے یہ بڑے بڑے ذخیرے جو سلف کی کوششوں سے جمع ہوئے تھے، مسلسل خرچ اور عرصہ سے آمد بند ہونے کی وجہ سے گھٹتے گھٹتے ختم ہوتے جا رہے تھے، اور اضافہ وترقی کا دروازہ بند معلوم ہوتا تھا، بہترین صلاحیتیں اور جوہر موجود تھے، مگر ضائع ہو رہے تھے، زندگی کا صحیح مقصد، اور قوتوں کا صحیح مصرف نہ ہونے کی وجہ سے شجاعت اور دلیری، حوصلہ مندی، غیرت وحمیت، اور دوسری اعلیٰ صفات حقیر مقاصد میں صرف ہو رہی تھیں، اور جذبات نے غلط رخ اختیار کر لیا تھا، افراد تھے، مگر جماعت نہ تھی،

اوراق تھے مگر کتاب نہ تھی، زندگی کی چول اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی تھی، اس لئے عام اور مفید حرکت نہ تھی۔

ایسے وقت میں ایسے شخص اور جماعت کی ضرورت تھی، جو دین، علم اور صلاحیت کے اس سرمایہ سے وقت پر کام لے، اور اس کو ٹھکانہ لگائے، جو خانقاہوں کا حال، اور درگاہوں کا قال، وہاں کی حرارت، اور یہاں کی روشنی سارے ملک میں عام کر دے، جس کے جلو میں چلتی پھرتی خانقاہیں ہوں، اور دوڑتے بھاگتے مدرسے، گھوڑوں کی پیٹھ پر عالم ہوں، اور محرابوں میں مجاہد جو دلوں کی بجھتی ہوئی انگیٹھیاں دوبارہ دہکا دے، افسردہ دلوں کو ایک بار پھر گرما دے، اور ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک طلب، اور دین کی تڑپ کی آگ لگا دے، جو مسلمانوں کی خداداد صلاحیتوں کو ٹھکانہ لگائے، جس کی نگاہ دوررس، اور جس کی ذات مسیحا نفس، کسی بیکار چیز کو بھی بیکار نہ سمجھے، جو امت کے ذخیرے کے ہر دانہ، اور خیابان کے ہر تنکہ سے پورا پورا کام لے، جو شخص ان اوصاف کا جامع ہو، اس کو اسلام کی اصطلاح میں "امام" کہتے ہیں، اور یہ مقام تیرہویں صدی کے تمام اہل کمال، اور مشاہیر رجال کی موجودگی میں سید صاحب کو حاصل تھا جن کے چیدہ چیدہ حالات وحکایات، اور ان کی عزیمت و جہاد، فیض وتاثیر، اور انقلاب انگیزی کے جستہ جستہ واقعات اس کتاب میں پیش کئے گئے ہیں۔

خاندان

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے پوتے محمد ذوالنفس الزکیہ شہیدؒ کی بارہویں پشت میں سید رشید الدین کے فرزند رشید شیخ الاسلام سید قطب الدین محمد المدنی ایک عالم وعارف اور عالی ہمت بزرگ تھے، جن کو اللہ تعالےٰ نے علم وتقویٰ کی دولت کے ساتھ ساتھ

شجاعت کا جوہر، اور جہاد کا جذبہ عطا فرمایا تھا، آپ غزنی کے راستہ سے مجاہدین کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ ہندوستان آئے، مختلف مقامات میں ٹھہرتے ہوئے کڑہ (الٰہ آباد) کو فتح کرنے کے بعد اسکو اپنا مستقر بنایا، وہیں انتقال کیا، اور وہیں مدفون ہوئے، سید قطب الدین کی اولاد کو اللہ نے سیادت و امارت کے ساتھ علم و فضل، اور زہد و تقویٰ کی دولت سے بھی مالا مال کیا، سید قطب الدین کے اخلاف میں ایک بزرگ حضرت شاہ علم اللہؒ گذرے ہیں، جو عہد عالمگیری کے مشہور عالم ربانی، اور صاحب سلسلہ شیخ تھے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مشہور خلیفہ حضرت سید آدم بنوری کے مجاز تھے، نہایت متقی، اور متبع سنت بزرگ تھے، انھوں نے ۱۰۹۶ھ ۱۶۸۴ء میں انتقال کیا، اور اپنے قائم کئے ہوئے دائرہ واقع رائے بریلی میں مدفون ہوئے۔

ولادت

سید صاحب ان کی پانچویں پشت میں ہیں، دائرہ شاہ علم اللہؒ میں صفر ۱۲۰۱ھ نومبر ۱۷۸۶ء میں پیدا ہوئے، والد کا نام سید محمد عرفانؒ، اور دادا کا نام سید محمد نورؒ تھا، چار سال کے ہوئے تو مکتب میں بٹھائے گئے مگر باوجود کوشش کے آپ کی طبیعت علم کی طرف راغب نہیں ہوئی، اور کتابی علم میں کچھ ترقی نہ کی، آپ کو بچپن ہی سے مردانہ اور سپاہیانہ کھیلوں کا شوق تھا، سن بلوغ کو پہونچے تو خدمت خلق کا ایسا ذوق پیدا ہوا کہ اچھے اچھے بزرگ انگشت بدنداں رہ گئے، ضعیفوں اور اپاہجوں، اور بیواؤں کی خدمت کرنے کا جذبہ اس کے ساتھ عبادت، ذکر الٰہی کا ذوق بہت بڑھا ہوا تھا، ورزش اور مردانہ کھیلوں کا بہت شوق تھا، پانچ پانچ سو ڈنڈ لگاتے تھے، اور تیس تیس سیر کے مگدر ہلاتے، پیرنے اور

پانی میں دیر تک ٹھہرنے کی بھی مشق بڑھائی تھی۔

تلاش معاش میں لکھنؤ کا سفر

جب آپ کی عمر بارہ[۱۲] سال کی ہوئی تو والد ماجد مولانا محمد عرفانؒ کا انتقال ہو گیا، حالات کا تقاضہ تھا کہ آپ ذمہ دارانہ زندگی میں قدم رکھیں، اور تحصیل معاش کی فکر کریں، تقریبًا سولہ[۱۶] سترہ[۱۷] سال کی عمر میں آپ اپنے سات[۷] عزیزوں کے ساتھ فکر معاش میں لکھنؤ چلے، لکھنؤ رائے بریلی سے انچاس[۴۹] میل ہے، سواری صرف ایک تھی جس پر سب باری باری بیٹھتے مگر سید صاحب اپنی باری کے وقت دوسرے عزیز کو باصرار سوار کرا دیتے تھے، اسی طرح راستہ بھر ساتھیوں کی خدمت کرتے، اور اصرار سے ان کا سامان خود لے کر چلتے، اسی خدمت اور محنت کے ساتھ لکھنؤ پہونچے، اس وقت نواب سعادت علی خاں خلف نواب شجاع الدولہ کا عہد حکومت تھا، نواب ایک بلند حوصلہ منتظم فرمانروا تھے، اس کے باوجود صاحب جاگیر اشخاص، اور بڑے تاجروں کے سوا بے روزگاری اور پریشانی عام تھی، لکھنؤ پہونچ کر سب ساتھی روزگار کی تلاش میں مشغول ہو گئے، روزگار عنقا تھا، باوجود محنت، اور دن کی مشغولیت کے بھی قوت لایموت بھی مشکل سے میسر آتی، صرف سید صاحب ایک امیر کے یہاں مقیم تھے، جو ان کے خاندان سے محبت و عقیدت رکھتے تھے، امیر کے یہاں سے جو کھانا آتا، آپ اپنے ساتھیوں کو کھلا دیتے، اور خود دال دلیہ پر گذر کرتے۔

شاہ عبد العزیزؒ کی خدمت میں

چار ماہ اسی حال میں گذرے، ایک بار والی لکھنؤ سیر شکار کے لئے پہاڑوں کی طرف

روانہ ہوا، اس کے ساتھ وہ امیر بھی گئے، جن کے یہاں سید صاحب مہمان تھے، سید صاحب بھی اپنے عزیزوں کے ہمراہ امیر کے ساتھ ہوگئے، اور اسی طرح خدمت کرتے ہوئے یہ سفر کیا، اس سفر میں سخت مصیبتیں اٹھانی پڑیں، راستہ بھر سید صاحب اپنے ہمراہیوں کو دہلی چلنے، اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے استفادہ کرنے کی ترغیب دلاتے رہے، اور پھر خود تن تنہا دہلی کی طرف روانہ ہوگئے۔

پورے سفر میں پیادہ پا، ..... مسافروں کی خدمت کرتے ہوئے بھوکے پیاسے چلتے رہے، چلتے چلتے پاؤں میں چھالے پڑ گئے، کئی روز کے بعد دہلی پہونچے، اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ صاحب کے سید صاحب کے بزرگوں سے قدیم سے روحانی و علمی تعلقات تھے، مصافحہ اور معانقہ، اور تعارف کے بعد بڑی خوشی کا اظہار کیا، اور اپنے بھائی شاہ عبدالقادر صاحب کے پاس ٹھہرایا۔

تکمیل باطنی، اور اجازت و خلافت

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، اور شاہ عبدالقادرؒ کی صحبت و خدمت میں رہ کر آپ نے اس قدر باطنی ترقی کی، اور وہ بلند مقامات حاصل کئے جو بڑے بڑے مشائخ کو بڑی بڑی ریاضتوں، اور مجاہدوں سے حاصل ہوئے ہیں، کچھ عرصہ کے بعد شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے اجازت و خلافت لے کر وطن رائے بریلی واپس ہوئے، دو سال وطن میں قیام کیا، اور شادی کی۔

امیر خاں کے لشکر میں

اللہ تعالےٰ نے سید صاحب کو جس عظیم مقصد کے لئے تیار کیا تھا، اور جہاد کا

جو جذبہ آپ کو ملا تھا، اور آپ نے جن مقاصد کو پیش نظر رکھا تھا، ان کی تکمیل، مزید پختگی اور عملی مشق و تربیت کی متقاضی تھی، اس کے لئے کسی محاذ جنگ کی ضرورت تھی۔

۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء میں آپ نے دہلی کا دوسرا سفر کیا، دہلی میں چند روز قیام کرنے کے بعد شاہ عبدالعزیز صاحب کے مشورہ سے نواب امیر خاں (جو راجپوتانہ اور مالوہ میں لشکرکشی، اور ترک تازی میں مشغول تھے) کے لشکر میں شامل ہو گئے، اور جنگی تربیت حاصل کرنے، اور ان کو بامقصد جدوجہد، اور انگریزی اقتدار کے بڑھتے ہوئے خطرہ کا مقابلہ کرنے کی راہ پر لگانے کیلئے انکی معیت ورفاقت اختیار کی، نواب امیر خاں سنبھل (روہیلکھنڈ) کے ایک حوصلہ مند افغانی النسل سردار تھے، جنھوں نے اپنے گرد حوصلہ مند، مہم جو، اور وفادار ساتھیوں کی ایک اچھی خاصی تعداد جمع کرلی تھی، اور ایسی اہمیت اختیار کرلی تھی کہ والیان ریاست کو بھی ان کی مدد کی ضرورت پڑتی رہتی تھی، اور انگریز بھی اس ابھرتی ہوئی طاقت کو نظرانداز نہیں کر سکتے تھے۔

سید صاحب امیر خاں کے لشکر میں چھ سال رہے، آپ اپنی عبادات وریاضات اور سپاہیانہ زندگی کے ساتھ اصلاح وارشاد میں مشغول رہے، آپ کی توجہ، محنت اور کوشش سے پورا لشکر دعوت و تبلیغ کا وسیع میدان بن گیا، اور سپاہیوں کی بڑی اصلاح ہوئی، خود امیر خاں کی زندگی میں بڑا انقلاب آیا۔

دہلی واپسی اور تبلیغی دورے

چھ سال کے قیام کے بعد جب امیر خاں نے بعض حالات سے مجبور ہو کر، اور اپنے بعض قریبی ساتھیوں کی بے وفائی کی وجہ سے انگریزوں سے صلح کرنی چاہی، تو آپنے

اس کی شدید مخالفت کی اور جب آپ کی مخالفت کے باوجود امیر خاں نے انگریزوں سے معاملہ کر لیا، اور ٹونک کی ریاست قبول کر لی، تو آپ ان سے مایوس ہو کر دہلی تشریف لے آئے۔

اس مرتبہ آپ کی طرف غیر معمولی رجوع ہوا، اس قیام کے دوران خاندان ولی اللہی کے دو ممتاز افراد، اور رجید عالم مولانا عبد الحی، اور مولانا محمد اسماعیل آپ سے بیعت ہوئے، ان دونوں کے بیعت ہونے سے دہلی کے عوام وخواص، علماء و مشائخ کا ایسا رجوع ہوا کہ شاید و باید، روز بروز آپ کی مقبولیت اور شہرت بڑھتی چلی گئی، آپ نے تبلیغی و اصلاحی دورے شروع کئے، سب سے پہلے مظفر نگر اور سہارنپور کے مردم خیز اور تاریخی قصبات، اور مسلمان شرفاء و علماء کے مرکزوں، نیز گڑھ مکتیشر، دوآبہ کے علاقے میں رام پور، بریلی، شاہجہانپور، اور دوسرے مقامات کا دورہ کیا، ان مقامات میں سیکڑوں خاندانوں، اور آدمیوں نے بیعت کی، شرک و بدعت سے تائب ہوئے، علماء مشائخ حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے، سہارنپور میں حاجی عبد الرحیم صاحب جو اپنے وقت کے بڑے مشائخ میں تھے، اور ہزاروں آدمی ان کے مرید تھے حضرت سید صاحب سے بیعت ہوئے، اور اپنے مریدوں کو بیعت کرایا، آپ کا یہ سفر باران رحمت کی طرح تھا، کہ جہاں سے گذرتا ہے۔ سرسبزی و شادابی، بہار و برکت چھوڑ جاتا ہے، دیکھنے والوں کا متفقہ بیان ہے کہ جہاں آپ نے تھوڑا سا بھی قیام کیا، وہاں مساجد میں رونق آگئی، اللہ اور رسول کا چرچا ایمان میں تازگی، اتباع سنت کا شوق، اسلام کا جوش، اور شرک و بدعت سے نفرت پیدا ہو گئی، اور رفض و تشیع کا خاتمہ ہو گیا، اس پورے سفر میں مولانا محمد اسماعیل اور مولانا عبد الحی ہم رکاب رہے، ان کے مواعظ سے بڑا انقلاب، اور بڑی اصلاح ہوئی۔

وطن میں

اس دورے کے بعد آپ اپنے وطن رائے بریلی تشریف لائے، یہ دن قحط اور خشک سالی کے تھے، ہر طرف پریشانی، فاقہ، غربت اور افلاس کا دور دورہ تھا، اس حال میں بھی آپ پر ستّر آدمیوں کے خورد نوش کی ذمہ داری تھی، لیکن در و دیوار پر سکینت الٰہی اور توکل کی فضا چھائی ہوئی تھی، آپ کی صحبت میں اس وقت ہندوستان کے بڑے بڑے علماء اور صوفیاء اور اہل سجادہ حاضر تھے، اور ہر ایک باوجود اپنے علم و فضل کے آپ سے استفادہ کرتا، اسی طرح آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ خدمت خلق کے کاموں میں شریک رہتے، یہ چھوٹا سا گاؤں ایک ہی وقت میں ایک آباد اور معمور خانقاہ، ایک دینی مدرسہ اور میدانِ جہاد بنا ہوا تھا، یہ زمانہ بڑے ذوق و شوق، کیف و مستی، لذت و حلاوت، اور جفاکشی کا تھا، وطن کے اس قیام کے دوران آپ نے الٰہ آباد، بنارس، کانپور، اور سلطان پور کا سفر بھی کیا، تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر جوق در جوق لوگ ملتے، اور بیعت ہوتے۔

لکھنؤ کا تبلیغی و اصلاحی سفر

لکھنؤ کی چھاؤنی میں پٹھانوں کی ایک اچھی خاصی آبادی تھی، جو سید صاحب کے بزرگوں، اور خود سید صاحب کی معتقد تھی، جن میں خاص طور پر نواب فقیر محمد خاں قابل ذکر ہیں، ان حضرات کی خواہش پر آپ نے نفع و اصلاح کی توقع پر ایک سو ستّر آدمیوں کے قافلہ کے ساتھ لکھنؤ کا سفر کیا، آپ کے اس سفر میں مولانا محمد اسماعیل، اور مولانا عبدالحی بھی ساتھ تھے، یہ زمانہ نواب غازی الدین حیدر کی بادشاہی، اور نواب معتمد الدولہ آغا میر کی وزارت کا تھا،

اس زمانہ میں لکھنؤ میں دولت ستانی، بدنظمی، حق تلفی، اور تعیش کا دور دورہ تھا، عیش و عشرت، لہو و لعب، ہنسی مذاق کی تمام گلزار بہار پر تھی، اس کے ساتھ اہل شہر میں اثر پذیری کی صلاحیت بھی تھی، دین کی عظمت و وقعت بھی تھی، لکھنؤ علمار و مشائخ کا مرکز بھی تھا قصبات اور شریف خاندانوں کا جوہر بھی لکھنؤ منتقل ہو گیا تھا، انسانوں کے اس ذخیرہ میں صدہا کام کے موتی تھے، جو گویا ایک نظر کیمیا اثر کے منتظر تھے۔

سید صاحب اور آپ کے رفقار گومتی کے کنارے شاہ پیر محمد کے ٹیلہ پر ٹھہرے، آپ کے پہونچتے ہی لوگوں کا رجوع اور ہجوم ہوا، صبح سے رات گئے تک لوگ جمع رہتے، مولانا محمد اسماعیل اور مولانا عبدالحی کے مسلسل اور مؤثر وعظوں سے لکھنؤ کے مقامی لوگوں میں بڑا انقلاب پیدا ہوا، ہزاروں انسانوں کی حالت بدل گئی، لوگ اٹھ اٹھ کر توبہ کرتے، اور نئی ایمانی زندگی میں قدم رکھتے، سید احمد شہید اور ان کی بابرکت جماعت کے چند روزہ قیام سے اہل لکھنؤ کو بہت روحانی فیوض و برکات حاصل ہوئے، بڑے بڑے علمار و مشائخ حاضر ہوتے، اور بیعت سے مشرف ہوتے، ہر جمعہ کو مولانا عبدالحی اور مولانا محمد اسماعیل کا وعظ ہوتا، مختلف برادریوں نے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی، اور شرک و بدعت سے توبہ کی، بے شمار دعوتیں ہوئیں، اور دعوتوں میں کرامتوں کا ظہور رہا، جن کو دیکھ کر اہل سنت کے علاوہ شیعہ اور غیر مسلم، اہل حکومت سبھی متاثر ہوئے، شرک و بدعت کا بازار سرد ہوا، جرائم پیشہ اور فسق و فجور میں مبتلا رہنے والے تائب ہوئے، سید صاحب کی طرف اس رجوع عام سے، اور شیعیت سے عمومی طور پر توبہ کرنے والوں کی کثرت کی وجہ سے حکومت اور اہل حکومت کو پریشانی لاحق ہو گئی، اور انھوں نے اس کے اشارے بھی دیئے مگر آپ نے اور آپ کے ساتھ علمار نے کلمۂ حق کے کہنے، اور صحیح دین کی طرف متوجہ کرنے میں

کسی بات کی پرواہ نہ کی، اور مستقل مزاجی سے اپنا کام کرتے رہے۔

ایک مہینے کے بعد وطن واپس ہوئے، وطن کے قیام میں پنجاب کے مسلمانوں کی مظلومی سے جہاد کی ضرورت کے احساس میں (جو شروع سے تھا) بہت شدت پیدا ہوگئی اور اس نے بے چین بنادیا، جس کو مضبوط، توانا، اور اچھے ڈیل ڈول کا دیکھتے، فرماتے کہ "یہ ہمارے کام کا ہے"، آپ اکثر اسلحہ لگاتے، تاکہ دوسروں کو اس کی اہمیت معلوم ہو، جنگی مشقیں ہوتیں، نشانہ بازی' اور فنون سپہ گری کی پوری مشق کی جاتی۔

حج

اس زمانہ میں اسلام کے دوسرے شعائر کے کمزور ہونے کے ساتھ ساتھ حج جیسا اہم رکن علماء کے فقہی عذر کی بناء پر یکسر متروک، یا غفلت کا شکار ہوگیا تھا، بعض علماء نے ہندوستان کے مسلمانوں کے ذمہ سے اس کے ساقط ہونے کا فتوی دیدیا تھا، سید صاحب نے اس فتنہ کا سد باب کیا، اور اس کی فرضیت کی زور شور سے تبلیغ کی، آپ نے اس کو زندہ کرنے کے لئے عملی قدم اٹھانا ضروری سمجھا، اور علماء و مشاہیر کے ایک جم غفیر کے ساتھ حج کا سفر کیا، مختلف مقامات پر حج کی تبلیغ کے سلسلہ میں خطوط لکھوائے، آپ کے اعلان حج، اور مکاتیب سے مختلف مقامات سے حج کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا، لوگ پروانوں کی طرح امنڈ آئے، آپ یکم شوال ۱۲۳۶ھ ۲ر جولائی ۱۸۲۱ء میں عید کی نماز کے بعد چار سو آدمیوں کے ساتھ اپنے وطن سے حج کے لئے روانہ ہوئے۔

آپ رائے بریلی سے دلمئو تشریف لے گئے، اور وہاں سے کشتیوں کے ذریعہ کلکتہ کی طرف روانہ ہوئے، راستہ میں جابجا آپ کے، اور مولانا محمد اسماعیل، اور مولانا عبدالحی، نیز قافلہ

کے علماء کے وعظ ہوتے، شرک و بدعت کی تردید، اور عقائد و اعمال کی اصلاح ہوئی الٰہ آباد میں ہزاروں ہزار مرد اور عورتوں نے بیعت کی، بعض لوگوں کا اندازہ تھا کہ شاید شہر میں کوئی مسلمان باقی نہیں رہا، مرزا پور میں تقریباً پورا شہر بیعت ہو گیا، بنارس میں ہزاروں اشخاص مرید ہوئے، اور علماء و مشائخ داخل سلسلہ ہوئے، شرک و بدعت پر ضرب کاری لگی، آپ غازی پور، دانا پور ہوتے ہوئے پٹنہ پہونچے، پٹنہ میں دو ہفتہ قیام کیا، اس قیام میں شریعت کی اشاعت و ترویج اور شرک و بدعت کی تردید کا کام پوری قوت سے جاری رہا، عظیم آباد میں چند تبتیوں کو آپ نے تبلیغ کے لئے ان کے وطن تبت کو روانہ کیا، جنکی کوششیں چین تک وسیع ہوئیں، عظیم آباد کے بعد کلکتہ پہونچے، تین مہینے کلکتہ میں قیام رہا، آپ کے قیام نے کلکتہ میں جو اس وقت ہندوستان کا عظیم ترین شہر، اور انگریزی حکومت کا مستقر تھا، ایک دینی انقلاب برپا کر دیا، برادریوں، اور خاندان کے چودھریوں، اور سرداروں نے اپنے اپنے خاندان میں اعلان کر دیا کہ جس نے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت نہ کی، اور شرعی پابندی اختیار نہیں کی، اس سے برادرانہ تعلقات منقطع ہیں، اس اعلان پر توبہ کرنے والوں کی قطاریں لگ گئیں، میخانوں میں خاک اڑنے لگی، عیش و عشرت، اور فسق و فجور کے مرکزوں میں سناٹا نظر آنے لگا سلطان ٹیپو کے پوتوں نے بھی جن کے بزرگوں کا تعلق سید صاحب کے بزرگوں سے رہا تھا، آپ کی توجہ سے فائدہ اٹھایا، تین مہینے کے بعد کلکتہ سے روانہ ہوئے، اس وقت آپ کے ہمراہ حج کرنے والوں کی تعداد سات سو پچہتر (۷۷۵) تھی، زیارت کرنے والے مسلمانوں، عیسائیوں، اور ہندوؤں کا ایسا ہجوم تھا کہ راستے بند ہو گئے تھے، اور آدمی کا گذرنا مشکل تھا، راستہ میں مختلف بندرگاہوں، اور ساحلی مقامات پر اترتے رکتے، اور وعظ و تلقین کرتے ہوئے، ۲۳ شعبان بروز چہار شنبہ ۱۲۳۷ھ مطابق ۱۶ مئی ۱۸۲۲ء میں جدہ پہونچے، اور ۲۸ شعبان کو حرم میں

داخل ہوئے۔

اس مقدس مقام میں بھی آپ کا فیض جاری رہا، امام حرم، اور مفتی مکہ، اور دوسرے عرب علماء آپ کے مرید ہوئے، اور دوسرے ممالک اسلامیہ کے عمائد اور سربر آوردہ علماء نے آکر آپ سے فیض حاصل کیا، رمضان مبارک مکہ مکرمہ میں گذرا، ایام حج میں عقبۂ اولیٰ میں جہاں انصار کی پہلی جماعت نے حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیعت کی تھی، اور ہجرت کی بنیاد پڑی تھی، ساتھیوں سے آپ نے جہاد کی بیعت لی۔

مکہ مکرمہ سے آپ نے مدینہ منورہ کا عزم کیا، اور وہاں قیام فرمایا، وہاں بھی علماء و مشائخ، اور عوام و خواص کا رجوع عام ہوا، مدینہ سے آپ مکہ واپس ہوئے، آپنے دوسرا رمضان بھی مکہ معظمہ میں گذارا، اور دوسرا حج ادا کر کے رائے بریلی یکم رمضان ۱۲۳۹ھ ۳۰ اپریل ۱۸۲۴ء کو واپس ہوئے۔

وطن کے مشاغل

یکم رمضان ۱۲۳۹ھ ۳۰ اپریل ۱۸۲۴ء سے ۷ جمادی الآخرہ ۱۲۴۱ھ ۱۷ جنوری ۱۸۲۶ء تک ایک سال دس مہینے رائے بریلی قیام رہا، یہ زندگی کا آخری قیام تھا، اس زمانۂ قیام کے اہم مشاغل میں جہاد کی ترغیب و دعوت، اور رفقاء کی ایمانی اور عملی تربیت شامل تھی، یہ مدت ایسی فضا اور ماحول میں گذری جس میں ایک طرف دینی جذبات، اور ایمانی کیفیات کی ترقی اور نشو و نما کا سامان تھا، اور دوسری طرف جفاکشی، مجاہدے، سادہ اور سپاہیانہ زندگی، اور خود شکنی کی تعلیم تھی، اس پوری مدت میں آپ کا گاؤں (دائرہ شاہ علم اللہ) علمی و روحانی تربیت گاہ بنا رہا۔

ہجرت کی ضرورت

ہندوستان میں اس وقت اسلام کی بے کسی، اور اہل علم و دین کی بے بسی کا جو حال تھا، اس کا پورا نقشہ سید صاحب کی آنکھوں میں تھا، غیر اسلامی قوتوں کا غلبہ آپ دیکھ رہے تھے، خصوصاً پنجاب کے مسلمانوں کی مظلومیت ناقابل برداشت حد تک پہونچ چکی تھی، وہاں کے مسلمان غلامی کی ذلیل زندگی گذار رہے تھے، اور پوری قوم بے اعتمادی، محرومی، اور بے عزتی کا شکار تھی، مسلمانوں کی املاک و جائیداد بات بات پر ضبط ہو جاتی تھی، لاہور کی مشہور شاہی مسجد کے حجروں میں شاہی اصطبل تھا، متعدد مقامات پر اذانوں پر پابندی اور بہت سے اسلامی شعائر پر بندش تھی، اس غلامی اور حقارت آمیز طرز عمل سے مسلمانوں میں مایوسی اور بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔

اس وسیع سرحدی صوبہ میں جو فوجی قابلیت رکھنے والی مسلمان نسلوں کا مرکز تھا، اور وہاں مسلمان واضح اکثریت میں تھے، مسلمانوں کی ذلت و محکومیت اور ایسی غیر مسلم طاقت کو جس کو مسلمانوں سے خصوصی عناد تھا، آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا، یہ دہلی کے مرکز اور پورے شمال مغربی ہندوستان کے لئے نیز صوبہ سرحد اور افغانستان کے لئے بھی ایک مستقل خطرہ تھا، سید صاحب اور ان کے رفقاء کی بہت بڑی دوربینی اور سیاسی بصیرت تھی کہ انھوں نے اس خطرہ کو محسوس کیا اور اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں میں پنجاب کو اولیت دی۔

ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط، مسلمانوں کی آپس میں خانہ جنگی، اور انتشار، اور اسلام کے زوال کے مشاہدہ نے آپ کو بے چین کر دیا، آپ کے نزدیک اعلاء کلمۃ اللہ، اور

بلاد اسلامیہ کے استخلاص کی ضرورت ہر غیور اور فرض شناس مسلمان سے جہاد کا مطالبہ کر رہی تھی، آپ کی نظر میں جہاد دین کا ایک نہایت اہم شعبہ اور تکمیلی قدم تھا، اور جہاد کا مقدمہ ہجرت کو سمجھتے تھے، اس لئے کہ اس وقت کے حالات میں جہاد بغیر ہجرت کے مشکل تھا، آپ کو قرآن مجید کی صریح آیات اور واضح احادیث کے پیش نظر تعمیل کے جذبہ نے اس پر ابھارا، رضا اور محبت الٰہی کے شوق نے آپ کے دل کو گدگدایا، ان حقائق نے آپ کے دل میں جہاد کا عزم راسخ پیدا کر دیا۔

سید صاحب کے نزدیک اگرچہ مقصود اصلی ہندوستان تھا، جیسا کہ آپ کے بہت سے خطوط سے جو آپ نے ہندوستان کے والیان ریاست، اور بیرون ہند مسلمان فرمانرواؤں کو لکھے، واضح ہوتا ہے، لیکن پنجاب میں جس پر رنجیت سنگھ کی باقاعدہ حکومت قائم ہو گئی تھی، اور مسلمان ظلم وستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے، اس لئے ان کی فوری امداد کی ضرورت تھی، نیز فوجی مصالح، اور سیاسی تدبر کا تقاضہ تھا کہ یہ مہم ہندوستان کے شمالی مغربی سرحد سے شروع کی جائے، جو طاقتور اور پرجوش افغانی قبائل کا مرکز تھا، جن کے بہت سے اعزہ، افراد خاندان آپ سے بیعت وارادت کا تعلق رکھتے تھے، اور آپ کے لشکر میں شامل تھے، انھوں نے امید دلائی تھی، کہ وہ قبائل اس مقصد کے سلسلہ میں آپ کی رفاقت ونصرت کریں گے، نیز وہاں سے آزاد اسلامی ممالک کی ایک زنجیر شروع ہوتی تھی، جو ترکی تک چلی گئی تھی، آپ شروع ہی سے اس کام کے لئے اپنے کو، اور اپنی جماعت کو تیار کر رہے تھے۔

ہجرت

دو شنبہ، ۷ رجمادی الآخرہ ۱۲۴۱ھ ۱۷ جنوری ۱۸۲۶ء میں اپنے وطن رائے بریلی کو

خدا حافظ کہا، ہندوستان کے شمالی مغربی سرحد پہونچنے کے لئے آپ نے صوبجات متحدہ مالوہ کے علاقوں، اور راجپوتانہ، مارواڑ، سندھ، بلوچستان، افغانستان اور صوبہ سرحد کے ریگستانوں، میدانوں، پہاڑوں، دروں، جنگلوں اور دریاؤں اور دلدلی علاقوں کو طے کیا، جن کو طے کرنا ایک مستقل جہاد تھا، بعض جگہ پانی کی قلت، سامان خوراک کی کمی، راہ کی خستگی، مقامات کی دشوار گذاری، قزاقوں کا خطرہ، بھوک اور پیاس کی شدت، اجنبی قوموں، اجنبی ملک، نئی زبانوں، نرم گرم مزاجوں کا سامنا کرنا پڑا، ان کے علاوہ شبہات اور اندیشے، تحقیقات و تجسس یہ تمام چیزیں پیش آئیں، آپ کے قافلہ میں دہلی اور اودھ، دوآبہ کے شرفاء سادات، علماء و مشائخ، امیر گھرانوں کے ناز پروردہ اشخاص، اور بانکے جوان، اور جوش جہاد سے سرشار نحیف و ناتواں جسم رکھنے والے بھی تھے، یہ قافلہ چھ سو افراد پر مشتمل تھا۔

آپ نے پہلی منزل دلمئو میں کی، پھر فتح پور، باندہ، جالون، ....، گوالیار، ٹونک تشریف لے گئے، ہر جگہ اور ہر مقام پر لوگوں نے خوش آمدید کہا، اور بیعت و ارادت سے مشرف ہوئے، گوالیار میں مہاراجہ کی خواہش پر شرف ملاقات بخشا، مہاراجہ نے نذر پیش کی، گوالیار سے ٹونک تشریف لے گئے، ٹونک کے نواب امیر خاں نے (جن کے لشکر میں آپ چھ سال رہ چکے تھے) پر جوش استقبال کیا، اور آگے کے سفر میں دور تک مشایعت کی، ٹونک سے اجمیر اور پالی ہوتے ہوئے مارواڑ کا نہایت دشوار گذار صحرا قطع کر کے مختلف مقامات پر ٹھہرتے ہوئے حیدرآباد سندھ پہونچے، راستہ میں ہزارہا مردوں، عورتوں نے بیعت کی، اور بہت سے لوگ ساتھ ہوئے، اس وقت سندھ خود مختار حکمرانوں کے ماتحت تھا، جو ایک ہی خاندان کے افراد تھے، اور جن کے

حدودِ حکومت میں لاکھوں کی تعداد میں جنگ جو، اور جنگ آزما آباد تھے، اسی طرح ایک بڑی تعداد ان مشائخ کی تھی، جن کے ماننے والے پورے سندھ میں پھیلے ہوئے تھے، ان سارے حضرات نے سید صاحب کا استقبال کیا، اور حمایت کا یقین دلایا، حیدر آباد کے والی میر محمد اور عمائد و مشائخ نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

حیدر آباد میں ایک ہفتہ قیام کر کے آپ پیر کوٹ گئے، اور وہاں دو ہفتے قیام کیا، ..... پھر شکار پور تشریف لے گئے، سندھ کے بزرگوں اور مشائخ سے ملاقاتیں کیں۔

شکار پور سے چل کر مختلف مقامات پر ٹھہرتے ہوئے، اور جہاد کی دعوت دیتے ہوئے چھتر بھاگ، اور ڈھاڈر گئے، ان تمام علاقوں میں علماء صوفیاء، اور اہل ملک نے دست بوسی اور زیارت کا شرف حاصل کیا، آپ نے پورے قافلے کے ساتھ درۂ بولان کا تنگ اور خطرناک راستہ طے کیا، درۂ بولان ایک قدرتی راستہ ہے، جو قدرت الٰہی نے اولوا العزم فاتحین، اور ضرورت مند مسافروں کے لئے اس طویل سلسلۂ کوہ کے اندر پیدا کر دیا ہے، جو ہندوستان کو افغانستان سے جدا کرتا ہے، درۂ بولان سے گذر کر آپ شال (کوئٹہ) پہونچے شال کے امیر نے بڑی ارادت مندی کا اظہار کیا، اور علماء نے بیعت کی۔

افغانستان میں

شال سے چل کر قندھار تشریف لے گئے، اس وقت افغانستان پر بارک زئی بھائیوں کا قبضہ تھا، جو دُرّانی کہلاتے تھے، قندھار پر پُردل خاں، غزنی پر میر محمد خاں، کابل پر دوست محمد خاں، اور سلطان محمد خاں، اور پشاور پر یار محمد خاں حاکم تھے، ان بھائیوں کے درمیان بڑی نااتفاقیاں تھیں، اور وہ آئے دن خانہ جنگیوں کا شکار ہوتے رہتے تھے،

سید صاحب کا ایک عظیم کام یہ بھی تھا کہ وہ ان بھائیوں کے درمیان اتفاق پیدا کر کے ان کو مخالفین اسلام سے جہاد کرنے پر آمادہ کریں۔

آپ جب قندھار پہونچے تو حاکم قندھار نے آگے بڑھ کر استقبال کیا، اسی طرح شہر کے ہزارہا علماء، شرفا پاپیادہ استقبال کے لئے نکلے، ہجوم سے سڑکیں بند ہو گئیں، چار دن قندھار میں قیام رہا، ہر شخص آپ کے ساتھ جہاد میں شریک ہونے کے لئے بیتاب، اور بے قرار تھا، آپ قندھار سے غزنی تشریف لے گئے، چار سو کے قریب علماء فضلاء مدارس کے طلبہ، اور خانقاہوں کے مشائخ جوش جہاد سے سرشار، سر دینے کے لئے تیار ہو کر آپ کے ہمراہ ہو لئے، آپ نے ان میں سے دو سو ستر کا انتخاب کیا، اور اپنے ساتھ لے لیا، قندھار اور غزنی کے راستے آپ نے میر محمد خاں حاکم غزنی، اور سلطان محمد خاں حاکم کابل کو خطوط لکھوائے، اور اپنی آمد کی اطلاع، اور مقصد کا اظہار، اور تعاون کی خواہش کی، جب آپ غزنی پہونچے، تو رؤسائے شہر، اور اہل علم و فضل، اور بے شمار آدمیوں نے سوار اور پاپیادہ دو کوس نکل کر آپ کا استقبال کیا، آپ نے سلطان محمود غزنوی کے مزار سے متصل لشکر کا پڑاؤ ڈالا، اور وہاں بکثرت لوگ بیعت ہوئے۔

غزنی دو روز قیام کر کے کابل تشریف لے گئے، رؤسا اور عمائد سلطنت، اور ہزارہا آدمی آپ کے استقبال کے لئے شہر سے باہر آگئے، گھوڑوں اور ہجوم کی وجہ سے ایسی گرد اڑ رہی تھی کہ کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی، سلطان محمد خاں والی کابل اپنے تین بھائیوں کے ساتھ پچاس سواروں کی جمعیت لے کر استقبال کے لئے کھڑے تھے، آپ کابل میں ڈیڑھ مہینے ٹھہرے، اور جہاد و اصلاح و تبلیغ کا برابر چرچا رہا، آپ کی صحبت بابرکت سے عوام و خواص مستفید ہوتے رہے، اور آپ کے قافلے کے ایمان پرور حالات، اور جہاد کا

جذبہ، اور راہ مولیٰ میں جان دینے کا شوق دیکھ دیکھ کر اس مبارک قافلہ میں شریک ہو رہے تھے، آپ نے بارک زئی بھائیوں میں مصالحت کرانے کی پوری کوشش کی اور اس کے لئے چھ ہفتے قیام فرمایا، لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی، مجبوراً آپ پشاور کی طرف روانہ ہوئے، راستہ میں مسلمان اس جوش و خروش کے ساتھ استقبال کرتے تھے، جس کا مظاہرہ سارے سفر میں ہوتا رہا، پشاور میں تین روز قیام کر کے ہشت نگر میں چند دن قیام کرتے ہوئے، اور مسلمانوں کو جہاد کے لئے تیار کرتے ہوئے نوشہرہ تشریف لے گئے، جہاں سے جہاد جیسے محبوب عمل، اور عبادت عظمیٰ کا آغاز فرمایا، جو برسوں کی دعوت و تبلیغ، اور جدوجہد کا ماحصل، اور اس پرمشقت سفر کا مقصد تھا۔

اکوڑہ کی جنگ

نوشہرہ سے آپ نے حکومت لاہور کو اعلام نامہ بھیجا، جس میں سب سے پہلے اسلام کی دعوت دی گئی، ورنہ جزیہ دینے، اور اطاعت کرنے کا مطالبہ کیا، اور ان دونوں مطالبوں کو قبول نہ کرنے کی صورت میں جنگ کی دھمکی دی، آخر میں یہ لکھا کہ تم کو شراب کی اتنی محبت نہ ہوگی، جتنی ہم کو شہادت سے ہے، اس اعلام نامہ کے جواب میں حکومت لاہور نے سکھوں کا ایک بڑا لشکر مقابلہ کے لئے بھیج دیا، اس خبر کے ملتے ہی سید صاحب نے جنگ کی تیاری کی، اس وقت مجاہدین کے دماغوں میں جہاد کا عجیب نشہ تھا، ہر ایک شوق شہادت سے سرشار ہو رہا تھا، سید صاحب کے ساتھیوں کی تعداد سات سو تھی، اور حریف لشکر سات ہزار مسلح افراد پر مشتمل تھا، چہارشنبہ ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۲۴۲ھ ۲۰ دسمبر ۱۸۲۶ء کو آدھی رات کے قریب اس مٹھی بھر جماعت کا اپنے سے دس گنے حریف کا مقابلہ ہوا، مجاہدین بڑی بے جگری سے

لڑے، اور دشمن پسپا ہونے لگا، اور رات گذرتے گذرتے دشمن پوری طرح پسپا ہو چکا تھا" اس جنگ سے مسلمانوں کے دل بڑھ گئے، اور آپ کی خدمت میں آ کر مختلف قبیلوں کے سردار، علماء و عمائد بیعت ہونے لگے، اور آپ پر ان کا اعتماد بڑھ گیا، آپ نے سرداروں میں صلح کرائی، قلعہ ہنڈ کے سردار خادے خاں بھی آکر مرید ہوا، اور اس کی خواہش پر آپ نے اپنے قافلہ کے ساتھ قلعہ ہنڈ میں تین ماہ قیام کیا۔

حضرو کا چھاپہ، اور بیعت امامت

اکوڑہ کی کامیاب جنگ کے بعد ملکی لوگوں نے سید صاحب سے خواہش کی کہ حضرو جو ایک بڑی منڈی تھی، اور سکھوں کی عملداری میں تھی، شبخون مارا جائے، سید صاحب نے اجازت مرحمت فرما دی، مگر خود شریک نہیں ہوئے، اس شبخون میں ملکی اور مقامی لوگوں نے مال غنیمت لوٹنے میں بڑی بے عنوانیاں کیں، انھوں نے سید صاحب کے احکام کی پروانہ کی، اور بلا کسی نظام و ضابطہ کے جو جی میں آیا کیا، اس لئے علماء لشکر کا یہ متفقہ فیصلہ ہوا کہ سب سے زیادہ ضروری اور مقدم کام یہ ہے کہ اپنا ایک امام اور امیر مقرر کیا جائے، تاکہ اس کی قیادت و امارت میں جہاد ہو۔

چنانچہ ہنڈ میں ۱۲ رجمادی الثانیہ ۱۲۴۲ھ ۱۳ رجنوری ۱۸۲۷ء کو بالاتفاق سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت امامت و خلافت کر لی گئی، خادے خاں، اشرف خاں، فتح خاں، بہرام خاں، اور چھوٹے بڑے جتنے خان اور رئیس تھے، سب نے آکر بیعت امامت کی، اس کے علاوہ علماء ہندوستان نے آپ کی امامت کو قبول کیا، سید صاحب نے بیعت امامت کی اطلاع کے خطوط، اور دعوت نامے سارے سرداروں، والیان ملک، علماء و مشائخ و رؤسائے ہندوستان کو بھیجے، حاکمان پشاور سردار یار محمد خاں، سلطان محمد خاں وغیرہ نے آپ کی

مقبولیت اور للہیت کو دیکھا تو بڑی جمعیت کو لے کر آئے اور بیعت کرلی، آپ نے امیر منتخب ہونے کے بعد پورے علاقہ میں شرعی نظام قائم کردیا، اور ہر طرف شریعت کے احکام جاری کردیئے، اور سارے فیصلے قانون شریعت کے مطابق ہونے لگے، احتساب کا ایسا اثر ہوا کہ دور دور تک کوئی بے نمازی نہیں ملتا تھا۔

شیدو کی جنگ، اور زہر خورانی

سید صاحب کی امامت وخلافت سے یہ پورا علاقہ ایک متحدہ ملک بن گیا، چھوٹے بڑے سرداروں کی خود مختاری گویا ختم ہوگئی، تو ان کے دلوں میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی، اگرچہ وہ فضا اور ماحول سے مجبور ہو کر سید صاحب سے بیعت ہوگئے، اور آپ کی امامت وخلافت کو قبول کیا، مگر اندرونی طور پر آپ کے درپئے آزار ہوگئے، درپردہ دربار لاہور سے ساز باز کرنے لگے۔

سکھوں سے کئی جھڑپوں، اور چھیڑ چھاڑ کے بعد انھیں سرداروں میں جن کی زبانیں سید صاحب کے ساتھ تھیں، اور دل دربار لاہور کے غلام تھے، یہ خواہش ظاہر کی کہ سکھوں کے خلاف ایک منظم اور فیصلہ کن جنگ کی جائے، ان سرداروں کے مشورے اور خواہش پر شیدو کا میدان انتخاب کیا گیا، اور جنگ کی تیاریاں ہونے لگیں، کہ ایک رات ان منافقین کی طرف سے سید صاحب کے کھانے میں زہر ملا دیا گیا، اس وقت مسلمانوں کی فوج میں ملکی اور غیر ملکی سب تھے، سارے سردار اپنی اپنی فوج کے ساتھ شریک تھے، لڑائی کا نقشہ مسلمانوں کے حق میں جا رہا تھا، کہ اچانک پشاور کے سردار سکھوں سے مل گئے، سلطان یار محمد خاں اپنے ساتھیوں سمیت میدان جنگ سے فرار ہوگیا، اس لڑائی کے بعد سید صاحب کا مقابلہ اب صرف سکھوں سے نہ رہا، بلکہ سکھوں کے ساتھ ساتھ سرداران پشاور، اور ملکی

لوگوں سے بھی ہوا، اور منافقوں کی ایک مسلح فوج سید صاحب کے مقابل آگئی۔

پنجتار میں

اس نئی صورت حال کے پیش نظر فتح خاں والی پنجتار کی خواہش پر آپ ہنڈ سے پنجتار تشریف لے گئے، اور اس کو اپنا مرکز بنایا، پنجتار علاقہ سوات کے قریب پہاڑوں کے بیچ میں ایک محفوظ مقام تھا، طویل عرصہ تک یہ پنجتار مجاہدین کا مستقر رہا، اس کو اسلام کی چھاؤنی، اور اصلاح وارشاد کا مرکز بننے کی سعادت ملی، یہ چھوٹی سی پہاڑی مجاہدین کی ایک بارونق چھاؤنی تھی جس کا کونہ کونہ مجاہدوں اور عابدوں سے آباد، اور ذکر وتلاوت، جہاد اور مجاہدوں، محبت واخوت، خدمت وایثار سے گلزار تھا۔

پنجتار کے مستقر بننے اور آباد ہونے سے خادے خاں والی ہنڈ کو بڑی تشویش ہوئی، اور حسد پیدا ہوا، وہ سید صاحب سے کبیدہ خاطر ہوا، اور نقصان پہونچانے کے درپے ہوگیا، شیدو کی جنگ کے غیر متوقع اور دل شکن واقعہ سے سید صاحب کے عزم وہمت، اور دعوت وجہاد کے انہماک میں فرق نہیں آیا، آپ نے بُنیر اور سوات اور پھر ہزارہ کا دورہ کیا، یہ دورہ تبلیغ وافادہ، وہدایت اور جہاد کی تبلیغ کے لحاظ سے بہت کامیاب رہا، آپ نے پنجتار سے کھر کا سفر کیا، جو سوات کا مرکز ہے، اور وہاں ایک سال قیام کیا، اسی قیام کے دوران کھر میں مولانا عبدالحیؒ کا انتقال ہوگیا، جن کی حیثیت لشکر میں شیخ الاسلام کی تھی، اور سید صاحب خود ان کا بڑا احترام فرماتے تھے۔

رنجیت سنگھ کے فرانسیسی جنرل سے مقابلہ

رنجیت سنگھ کے ایک فرانسیسی جنرل ونیٹورا نے دس بارہ ہزار فوج کے ساتھ

مجاہدین پر حملہ کردیا، اور خادے خاں والی ہنڈ نے وینٹورا کی مدد کی، جنرل وینٹورا نے مجاہدین کا جوش وجہاد، اور شوق شہادت دیکھ کر پسپائی اختیار کی، اور پسپا ہوتے ہوئے لاہور واپس ہوگیا، کئی ماہ بعد فرانسیسی جنرل وینٹورا نے دوبارہ پیش قدمی کر کے سمہ کا رخ کیا، خادے خاں نے اس کا استقبال کیا، اور درپردہ اس کی مدد کی، سید صاحب نے وینٹورا کی آمد پر اہل علاقہ کو اس کی خبر دی اور خطوط لکھوائے، اور ایک دفاعی دیوار تیار کرائی، مجاہدین نے سید صاحب کے ہاتھ پر موت کی بیعت کی، وینٹورا نے دیکھا کہ مجاہدین پہاڑیوں چوٹیوں، اور دروں میں پھیلے ہوئے ہیں، تو خوف اور رعب سے واپس ہوگیا، مجاہدین کی استقامت، اور عنداللہ مقبولیت کا چرچا اطراف وجوانب میں ہوا، اور لوگ جوق درجوق آنے لگے، اور بیعت ہونے لگے، سید صاحب نے دیہاتوں اور قصبات کا دورہ کیا، اور نظام شرعی کو مستحکم کیا، خادے خاں نے باوجود افہام وتفہیم کے دشمنوں سے سازباز کی، اس بناء پر سید صاحب نے مجبوراً قلعہ ہنڈ پر حملہ کر کے اسکو تسخیر کرلیا، اس حملہ میں خادے خاں مقتول ہوا۔

جنگ زیدہ اور یار محمد خاں کا قتل

امیر خاں جو خادے خاں کا بھائی تھا، سردار یار محمد خاں سے جس نے سید صاحب کو شیدو کی جنگ میں زہر دلوا دیا تھا، مل گیا، اور اس سے سازباز کی، سید صاحب نے یار محمد خاں سے گفتگو کی، اور اس کو افتراق وانتشار، اور فتنہ انگیزی سے باز رکھنا چاہا، مگر اس نے باز آنے کے بجائے زیدہ کے مقام پر مجاہدین کے مقابلہ میں جنگ چھیڑ دی، مجاہدین کی استقامت اور ثبات قدمی سے درانی لشکر کے قدم اکھڑ گئے، اور مجاہدین کا توپوں پر قبضہ ہوگیا، پورے لشکر میں بھگدڑ مچ گئی، اور یار محمد خاں مقتول ہوا، درانیوں نے قلعہ ہنڈ پر جو مجاہدین کے قبضہ میں تھا،

حملہ کر دیا، مجاہدین اس وقت صرف پچاس ساٹھ کی تعداد میں تھے، انھوں نے جم کر مقابلہ کیا، اور اس حملہ کو ناکام بنا دیا۔

اس زمانہ میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ مجاہدین پشاور پر جو درانیوں کے قبضہ میں تھا حملہ کرنے والے ہیں، درانیوں نے ہنڈ سے ہٹ کر پشاور کا رخ کیا، اس عرصہ میں عشرہ اور امب پر مجاہدین نے قبضہ کر لیا۔

سید صاحب کا خیال تھا کہ کشمیر کی طرف بڑھا جائے، اس کے لئے ضروری تھا کہ پھولڑے پر قبضہ ہو، اس لئے اپنے بھانجے سید احمد علی کی سرکردگی میں مجاہدین کی ایک جماعت روانہ کی، سکھوں نے اس جماعت پر اچانک حملہ کر دیا، اچانک حملہ سے بہت سے مجاہدین شہید ہو گئے، اور خود سید احمد علی نے بھی مردانہ وار جام شہادت پیا، سید صاحب نے امب میں قیام فرمایا، اور قضا و اصلاح اخلاق کا نظام جاری کیا۔

جنگ مایار

سلطان محمد خاں نے مجاہدین سے ایک فیصلہ کن جنگ کا عزم کر لیا اس نے درانیوں کی ایک بڑی فوج اپنے ساتھ لی، وہ چمکنی سے ہو کر چارسدے میں پہونچا، سید صاحب نے بھی اپنے رفقاء کو لے کر تورو میں اپنا خیمہ نصب کر لیا، اور سرداران پشاور کو آپس کی لڑائی سے باز رکھنا چاہا، مگر سرداران پشاور نے اس جذبۂ مصالحت کی قدر نہ کی، سلطان محمد خاں اور ان کے بھائی بھتیجوں سے قرآن مجید ہاتھ میں لیکر قسم کھائی، پوری فوج اس دروازے سے گزاری گئی جس سے قرآن مجید لٹک رہا تھا، تورو، ہوتی کے درمیان مایار کے میدان میں ایک خونریز جنگ ہوئی، مولانا محمد اسماعیل صاحب اور شیخ ولی محمد صاحب نے

توپوں پر قبضہ کرلیا، درانیوں کے قدم اکھڑ گئے اور مجاہدین کو فتح مبین حاصل ہوئی، اس جنگ میں مجاہدین کی شجاعت وجاں بازی، قوت ایمانی، تسلیم ورضا اور شوق آخرت کے ایسے مناظر سامنے آئے، جنھوں نے قرون اولیٰ کی یاد تازہ کردی۔

پشاور کی فتح اور سپردگی

سید صاحب نے مایار کی جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد پشاور کا قصد کیا، جو شمالی مغربی علاقے میں لاہور اور کابل کے بعد دوسرا اہم شہر اور صوبہ سرحد کا قدیم سے مرکز و دارالحکومت تھا، حالات نے اب اس پر مجبور کردیا، کہ پشاور کو براہ راست اپنے انتظام میں لے لیا جائے، سلطان محمد خاں نے جب دیکھا کہ مجاہدین نے پشاور پر قبضہ کرنے کا عزم کرلیا ہے، تو وہ اپنے افراد خاندان، اور رفقاء کو لے کر پشاور سے باہر چلا گیا، اور وہاں سے سید صاحب سے نامہ و پیام شروع کیا، آپ پشاور میں داخل ہوئے تو اہل شہر آپ کی آمد سے بہت مسرور ہوئے، جگہ جگہ شربت کی سبیلیں لگائیں، اور چراغاں کیا، لشکر نے قرون اولیٰ کی اسلامی افواج کی طرح اپنی اسلامی سیرت و تربیت، و احتیاط و امانت کا پورا مظاہرہ کیا۔ سلطان محمد خاں نے صلح کی پیش کش کی، اور تابعداری کا عہد کیا، اور حلف شرعی کے ساتھ وعدہ کیا، کہ پشاور دوبارہ اس کے سپرد کردیا جائے، وہ شرعی نظام جاری کرے گا، اور اس ملک کو اسلامی حکومت بنائے گا، سید صاحب نے اس بناء پر کہ انھوں نے ملک گیری کے لئے نہیں، بلکہ اسلامی حکومت کے قیام، اور شریعت کے نفاذ کے لئے یہ سفر اختیار کیا تھا، اور اس میں ان کو کسی دوسرے پر ترجیح حاصل نہیں اس کی پیش کش کو قبول کرلینا اور اس کو پھر ایک موقعہ دینے کا فیصلہ کرلیا، پشاور پھر سلطان محمد خاں کی سپردگی میں دے دیا گیا، اور آپ پشاور سے

روانہ ہو کر پنجتار واپس ہو گئے۔

قضاۃ و محصلین کا قتل عام

نظام شرعی کے قیام، عمال و محصلینِ زکوٰۃ کے تقرر، احکام شرعی کے نفاذ میں سرداران قبائل بالخصوص سلطان محمد خاں، اور دنیادار علماء کو جن کے مالی و دنیاوی مفادات پر اثر پڑتا تھا، اپنا صریح نقصان نظر آیا، اور انھوں نے ان پابندیوں سے نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

پشاور کی سپردگی کو تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ سلطان محمد خاں نے ایک سازش تیار کی، اس نے عوام و خواص میں مجاہدین کو بدنام کیا، اور علماء سوء سے ایک محضر پر دستخط لئے، کہ سید صاحب اور مجاہدین کے عقائد و خیالات فاسد ہیں، پشاور اور سمہ کے پورے علاقے میں سید صاحب کے مقرر کئے ہوئے حکومت شرعیہ کے ان عمال، محصلین، قضاۃ، محتسبین، اور غازیوں کو جو پنجتار کے علاوہ پورے علاقہ میں جا بجا متعین اور مقرر تھے، بیک دفعہ قتل کر دینے کا منصوبہ بنایا، اور نہایت بے دردی کے ساتھ ان کا قتل عام کرا دیا، کوئی نماز میں شہید ہوا کوئی مسجد میں پناہ لینے کی حالت میں اور کوئی لڑتے ہوئے مارا گیا، ان ظالموں نے علماء و سادات عورتوں اور غیر مسلموں کی سفارش اور درخواست رحم کی بھی پروا نہیں کی اور ان کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر دیا، یہ سالہا سال کی تربیت کا نتیجہ، عمر بھر کی کمائی، اور ہندوستان کا عطر و انتخاب تھے۔

ہجرت ثانیہ

اس سفاکانہ قتل عام سے سید صاحب کا دل ٹوٹ گیا، مقامی لوگوں کی بیوفائی،

احسان فراموشی، اور ظلم و بربریت سے اتنے دل شکستہ ہوئے کہ اس مقام سے ہجرت کا ارادہ کرلیا، آپ نے پہلے علماء و خوانین کو پنجتار میں جمع کیا، واقعہ ھائلہ اور اس کے اسباب کی تحقیق کی، اپنی آمد کے مقاصد اور اپنی کوششوں کا ذکر کیا، جب آپ کو یقین ہوگیا کہ آپ کے رفقا اس معاملہ میں محض بے قصور، مظلوم تھے اور مقامی آبادی کا ذہن اور دامن پاک صاف نہیں ہے تو آپ نے ہجرت کا پختہ ارادہ کرلیا۔

جب ہجرت کی خبر گرم ہوئی، تو مقامی علماء و سادات، اور مخلصین کی جماعت، اور معتقد خوانین جو پنجتار میں مقیم تھے، بہت فکرمند اور رنجیدہ ہوئے، اور جوق در جوق لوگ آ آ کر سید صاحب سے ہجرت نہ کرنے کی درخواست کرنے لگے، لیکن آپ اس پر راضی نہ ہوئے، اس لئے کہ آپ کو اس کا علم ہو چکا تھا کہ سلطان محمد خاں کی سازش، اور عمال و محصلین کے بے دردانہ قتل کے منصوبے میں فتح خاں، اور اس کے قبیلہ کے لوگوں کی بھی شرکت تھی، اور اس نے خود بھی وہاں قیام کرنے کے لئے کوئی درخواست نہیں کی، بلکہ رازداری کے طور پر اس فیصلہ کی تائید کی، لیکن آپ نے بجائے کوئی انتقامی کارروائی کرنے کے فتح خاں کے ساتھ عفو و درگذر، اور احسان مندی کا معاملہ کیا، اور اس کو تحائف و ہدایا سے بھی سرفراز کیا، لیکن اس علاقہ سے ہجرت کرنے کے عزم میں کوئی تزلزل پیدا نہیں ہوا، آپ فتح خاں کے سپرد پنجتار کا علاقہ کر کے کوچ فرما گئے، موضع راج دواری میں قیام فرمایا، راستہ میں سمہ (جہاں غازی، قضاۃ اور مخلصین شہید کئے گئے تھے) کے لوگ دوڑے دوڑے آئے، اور واپس چلنے کی درخواست کی، آپ نے فرمایا "لا یلدغ المومن من جحر مرتین" (ایک سوراخ سے مومن دوبار نہیں ڈسا جاتا)

کشمیر کی طرف

آپ نے اپنے آئندہ اصلاحی و مجاہدانہ سرگرمیوں کا مرکز بنانے کے لئے کشمیر کا انتخاب کیا

اور اپنے بچے کھچے انسانی سرمایہ، اور ان جان نثار و باوفا رفقاء کو لے کر جو اس بے سروسامانی اور اشتباہ والتباس کی حالت میں بھی آپ کا ساتھ چھوڑنے کے لئے کسی طرح تیار نہ تھے، کشمیر کا رخ کیا، جو ایک وسیع اور محفوظ وادی ہے، اور اس کو وہ قدرتی استحکامات حاصل ہیں، جن سے ایک ہوش مند قیادت بہت فائدہ حاصل کر سکتی ہے، نیز اس کے ذریعہ سے ایک طرف ہندوستان پر اثرانداز ہوا جا سکتا تھا، دوسری طرف وسط ایشیا کے ان اسلامی ممالک سے جو نسلی اور فوجی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتے تھے، اور جنھوں نے زمانۂ سابق میں مضبوط اسلامی سلطنتیں قائم کی تھیں، روابط پیدا کئے جا سکتے تھے۔

بالاکوٹ میں

اس زمانہ میں پکھلی اور وادی کاغان کے روسار، اور اہل علاقہ کی امارت وریاست کچھ تو سکھوں کے حملوں، اور کچھ آپس کی ناچاقیوں سے تزلزل میں تھی، یہ سب سید صاحب کی مدد کے طالب تھے، نیز ان کی ریاستیں کشمیر جانے والے راستہ میں پڑتی تھیں، جس کو سید صاحب اپنا مرکز بنانا چاہتے تھے، اور یہ دوسری ہجرت اسی طرف ہو رہی تھی، ان سب کو مدد دینے اور ان کی حمایت، اور فوجی قوت حاصل کرنے، اور کشمیر کی طرف بڑھنے کی تیاری کرنے کے لئے سب سے موزوں مقام بالاکوٹ تھا، جو وادی کاغان کے جنوبی دہانے پر واقع ہے، یہاں پہونچکر وادی کو پہاڑی دیوار نے بند کر دیا ہے، دریائے کنہار کے منفذ کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے، پہاڑ کی دو دیواریں متوازی چلی گئی ہیں، بیچ میں وادی ہے، جس کا عرض آدھے میل سے زیادہ نہیں ہے، اسی خلا میں دریائے کنہار گذرا ہے، بالاکوٹ کے مشرق میں کالو خان کا بلند ٹیلہ، اور مغرب میں مٹی کوٹ کا ٹیلہ ہے۔

یہ دوسرا سفر ہجرت بھی نہایت پرمشقت اور پرخطر تھا، پہاڑوں کی چوٹیاں اور وادیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں، راستے نہایت پیچدار اور نشیب و فراز کے تھے، راستہ میں رسد اور باربرداری کا کوئی انتظام نہ تھا، یہ سفر بھی آپ کی بلند ہمتی اور اولوالعزمی اور رفقاء کی جفاکشی، قوت ایمانی، اور صبر و تحمل، اور اپنے مقصد سے عشق کا آئینہ دار ہے، آپ پنجتار سے مختلف مقامات ہوتے ہوئے سچون پہونچے، اور وہاں سے بالاکوٹ کا رخ کیا، سچون سے ۵ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ ۱۷ اپریل ۱۸۳۱ء کو کوچ کر کے بالاکوٹ میں داخل ہوئے۔

آخری جنگ اور شہادت

شاہزادہ شیر سنگھ کو (جو اپنے والد مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے مجاہدین سے آخری جنگ کی مہم پر مامور تھا) جب معلوم ہوا کہ سید صاحب اپنے غازیوں کے ساتھ بالاکوٹ میں مقیم ہیں، تو اس نے سکھوں کی ایک بڑی فوج لے کر دریائے کنہار کے مشرقی کنارے، بالاکوٹ سے دو ڈھائی کوس پر پڑاؤ ڈالا، اور دھیرے دھیرے وہ لشکر بالاکوٹ کے قریب پہونچ گیا۔

جب یہ بات واضح ہوگئی، کہ سکھوں کا لشکر مٹی کوٹ سے اتر کر بالاکوٹ پر حملہ کرے گا، تو ایک موثر اور فیصلہ کن جنگ کے انتظامات کئے گئے، قصبے کا جائے وقوع، اور میدان جنگ کی طبعی کیفیت مجاہدین کے لئے سازگار تھی۔

راجہ شیر سنگھ بالاکوٹ کی اس طبعی صورت کو دیکھ کر اس کو تسخیر کرنے سے مایوس ہونے لگا، اور واپس ہونے کا ارادہ کر رہا تھا، کہ مقامی لوگوں میں سے کسی نے قصبے

تک پہونچنے میں اس کی رہنمائی کی، اور دیکھتے ہی دیکھتے شیر سنگھ کی فوج مٹی کوٹ پر ۲۴ ر ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو مور و ملخ کی طرح چھا گئی، مٹی کوٹ سے اوتر کر شیر سنگھ کی فوج نے غازیوں پر یورش کر دی، سید صاحب آگے آگے اور مجاہدین پیچھے پیچھے تھے سکھوں کی گولیاں اولوں کی طرح برس رہی تھیں، آپ نے آگے بڑھکر تکبیر کہی، اور دشمنوں کی طرف بڑھے، اور جس طرح شیر اپنے شکار پر جاتا ہے، اسی سرعت سے آپ جا رہے تھے، پچیس^۲۵ تیس^۳۰ قدم کھیت میں ایک بڑا سا پتھر زمین سے نکلا ہوا ہے، آپ اس کی آڑ میں جا کر ٹھہرے، اور آپ نے، اور آپ کے ساتھ غازیوں نے بندوقوں کی پھر قرابینوں کی باڑھ ماری، ان باڑھوں سے بے شمار دشمن مقتول ہوئے، اور منہزم ہو ہو کر پہاڑ پر واپس ہونے لگے، مجاہدین پہاڑ کی جڑ تک پہونچ گئے، دشمنوں کی ٹانگیں پکڑ پکڑ کر کھینچنے لگے، اور تلواریں مار مار کر ہلاک کرنے لگے۔

اسی اثناء میں سید صاحب لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے، مجاہدین کو آپ کی شہادت کا یقین ہونے لگا، اور وہ آپ کو تلاش کرنے لگے، اِدھر مولانا محمد اسماعیل کے سر میں گولی لگی، اور وہ بھی شہید ہو گئے، دشمنوں نے دیکھا کہ مجاہدین ان کی شہادت سے سراسیمہ ہو رہے ہیں، تو انھوں نے تازہ اور بھرپور حملہ کر دیا، اور بندوقوں کی مسلسل باڑھیں ماریں، جس سے بہت سے مجاہدین شہید ہو گئے، اور لڑائی کا نقشہ پلٹ گیا، بڑے بڑے علماء، مشائخ اور مجاہدین نے جام شہادت نوش کیا، اور بڑی بے جگری سے لڑ کر جانیں دیں، اس معرکہ میں تین^۳۰۰ سو سے زیادہ مجاہد شہید ہوئے۔

بالاکوٹ کی اس سرزمین پر ان مبارک انسانوں کا وہ مبارک سفر تمام ہوا، جس کی ابتداء ۷ ر جمادی الآخرہ ۱۲۴۱ھ مطابق ۱۷ جنوری ۱۸۲۶ء کی صبح کو سید احمد شہید ؒ

اپنے غازیوں کے ساتھ اپنے وطن رائے بریلی سے کی تھی، اور ۲۴ر ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ ۶ر مئی ۱۸۳۱ء کو منزل مقصود پر پہونچ گئے، جس پر پہونچنے کے لئے اپنی محبوبیت و مقبولیت کو چھوڑ کر صحراؤں، دریاؤں، پہاڑوں، جنگلوں، وادیوں کو قطع کیا، درانیوں کی بے وفائی اور سرد مہری، بغاوت و سرکشی کا مقابلہ کیا، بالاکوٹ کے اس معرکہ میں سید صاحبؒ مولانا محمد اسماعیل صاحب اور دوسرے ان مبارک انسانوں نے خدا کی راہ میں جام شہادت نوش کیا، جن کے دلوں میں عشق الٰہی کا شعلۂ بے تاب، اور شہادت فی سبیل اللہ کا ایسا جذبۂ صادق پیدا ہو گیا تھا، کہ ان کو اپنی جان وبال جان، اور اپنا سر وبال دوش معلوم ہونے لگا تھا، اور ان کے بُن مو سے یہ صدا آتی تھی ؎

جان کی قیمت دیار عشق میں ہے کوئے دوست
اس نوید جاں فزا سے سر وبال دوش ہے

اچھا پھر اس کا نام احمد رکھو

حضرت سید احمد شہیدؒ نے ۱۲۳۳ھ میں دہلی اور سہارنپور کا ایک تبلیغی و اصلاحی دورہ کیا، شہروں اور دیہاتوں میں کئی کئی دن اور کئی کئی ہفتے قیام کیا اور مسلمانوں کو اتباع سنت اور ترک بدعت کی دعوت دی، تزکیۂ نفس اور تہذیب اخلاق کی طرف متوجہ کیا، اس سفر میں مولانا محمد اسمٰعیل صاحب جو سید صاحب کے ترجمان اور جماعت کے متکلم تھے عموماً وعظ کہتے، اس مبارک سفر میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہزاروں انسانوں کو ہدایت ہوئی اور ایک کثیر تعداد کو توبہ کی توفیق حاصل ہوئی۔

اس سلسلہ کا ایک واقعہ یہاں پیش کیا جاتا ہے، جو خود صاحب واقعہ اپنی زبان سے بیان کر رہے ہیں۔

حاجی شیخ احمد کہتے ہیں کہ سید صاحب نے مولوی شاہ رمضان رڑکی والے کو خلافت عطا فرمائی تھی تاکہ اطراف و جوانب کے دیہاتوں میں تعلیم و نصیحت کے لئے دورہ کریں، مولوی صاحب موضع جانگلا میں پہونچے جو اس خاکسار کا وطن ہے، اور وہاں ایک مسجد میں وعظ فرمایا، میرا سن اُس وقت نو سال کا تھا، اور ہندو تھا، میں نے مسجد کے نیچے بیٹھ کر آپ کا وعظ سنا، آپ نے روزہ، نماز وغیرہ اور دوسرے نیک اعمال کے فضائل بیان کئے، تین روز تک اسی طرح میں آپ کا وعظ سنتا رہا، میرے دل میں آیا کہ جب ان کا دین اتنا اچھا ہے

تو میں بھی اگر یہی دین قبول کر لوں تو بہت اچھا ہے، میرا یہ شوق دن بدن بڑھتا رہا، تیسرے روز میں نے ہمت کی کہ میں مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو جاؤں، میں مسجد میں پہونچا تو میں نے دیکھا کہ مسلمان آپ کا وعظ سننے کے لئے بیٹھے ہیں، اور بہت سے ہندو علٰحدہ علٰحدہ مسجد کے نیچے کھڑے ہوئے ہیں، میں بھی جا کر کھڑا ہو گیا، تھوڑی دیر کے بعد میرے دل میں ایسا سرور پیدا ہوا کہ میں اس نشہ سے سرشار ہو گیا، یہاں تک کہ بے اختیار ہو کر مولوی صاحب کے پاس جا کر عرض کیا کہ میں مسلمان ہوتا ہوں، مجھے آپ مسلمان کر لیجیے، مولوی صاحب نے اپنے پاس بٹھا کر پوچھا کہ تم مسلمان ہوتے ہو؟ میں نے کہا جی ہاں! آپ نے مجھے اپنے ایک بھائی کے ساتھ سید صاحبؒ کی خدمت میں سہارنپور بھیج دیا اور میں اسی ذوق و شوق کی حالت میں آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہوا۔

محسن خاں اور محمد حسین سہارنپوری بیان کرتے ہیں کہ جب یہ بچہ آپ کی خدمت میں سہارنپور پہونچا تو آپ نے اس کو اپنے پاس بٹھایا آپ بار بار اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھتے تھے، اور فرماتے تھے کہ اس ہادی مطلق کی شان دیکھو اس کا نور ہدایت جس کے دل میں پڑ جاتا ہے، وہ خود راہِ راست تلاش کرتا ہے پھر مولانا عبدالحی صاحب سے فرمایا کہ "نام خدا اس بچہ کو کلمۂ توحید کی تلقین کیجیے اور اس نیک کام میں ذرا دیر نہ کیجیے"، مولانا ممدوح نے کلمہ کی تلقین کی، آپ نے فرمایا کہ اس کا کوئی نام بھی تجویز کر دیجیے، مولانا کی زبان سے نکلا کریم الدین"۔

اس وقت مجلس میں اہل شہر کا ہجوم تھا، انھوں نے کہا کہ یہ نام رکھنے سے بعض لوگ ناراض ہوں گے کیونکہ عمائد شہر میں سے کئی آدمیوں کا یہی نام ہے، آپ نے

فرمایا کہ" اچھا پھر اس کا نام احمد رکھو" اس لئے کہ یہ میرا نام ہے، آپ نے اس بچہ کو حکیم مغیث الدین کے سپرد کر دیا اور فرمایا کہ اس کو نماز سکھایئے اور قرآن کی تعلیم دیجئے اور دین کے احکام و مسائل سے واقف کیجئے جب ہم آپ کو اپنے سفر حج کی اطلاع کریں تو اس کو بھی اپنے ساتھ لیتے آیئے گا، انشاء اللہ یہ حاجی ہوگا۔

پھر آپ نے اپنے تمام ہمراہیوں اور اہل شہر میں سے جو لوگ حاضر تھے، نیز مولانا عبدالحی و مولانا اسمٰعیل صاحب کو جمع کیا اور ان دونوں صاحبوں سے خطاب کر کے فرمایا کہ جہالت کی چند باتیں لوگوں کے ذہن میں ایسی بیٹھ گئی ہیں کہ اگر یہ باتیں دل سے نہ نکلیں تو اس کا اندیشہ ہے کہ آخر میں دین و ایمان میں خلل نہ آجائے، اوّل یہ کہ جب کسی کا بچہ مر جاتا ہے، اور اللہ دوسرا بچہ عطا کرتا ہے تو وہ اس پہلے بچہ کا نام دوسرے بچہ کا نہیں رکھتا اس ڈر سے کہ کہیں وہ بچہ بھی نہ مر جائے۔

دوسرے یہ کہ کوئی غریب مسلمان اپنے بچہ کا نام روساء میں سے کسی کا نہیں رکھ سکتا۔

تیسرے یہ کہ دولت مند و امراء غرباء کی دعوت قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں، اور ان کو اس میں سبکی اور ذلت محسوس ہوتی ہے۔

چوتھے یہ کہ جو کھانا ہم پکاتے ہیں بیچارے غریب لوگ نہیں پکا سکتے کیونکہ اس سے ہمسری اور برابری ٹپکتی ہے۔"

اس کے علاوہ بھی بعض ایسی ہی باتیں فرمائیں اور ان من گھڑت باتوں کی تردید فرمائی اور مولانا عبدالحی صاحب کو وعظ کا حکم دیا، مولانا نے ایسی روانی و خوش بیانی سے وعظ فرمایا کہ ہر ایک کا دامن آنسوؤں سے تر ہو گیا، ہر شخص کی زبان پر

آمنّا وصدّقنا تھا، وعظ کے ختم ہونے پر آپ نے احکام الٰہی کی اطاعت کی دعا کی، جن لوگوں نے کریم الدین نام رکھنے سے منع کیا تھا، انھوں نے از سرِ نو بیعت اور سید صاحبؒ کے ہاتھ پر توبہ کی۔

سچی توبہ

۱۲۳۴ھ میں سید صاحبؒ پہلی بار اپنے قافلہ کے ساتھ لکھنؤ تشریف لائے اور ٹیلے والی عالمگیری مسجد (شاہ پیر محمد صاحب کی مسجد) کے قریب فروکش ہوئے اور اصلاح و تبلیغ کے مبارک کام کا آغاز کیا، یہ نواب غازی الدین حیدر (سنہ جلوس ۱۲۲۹ھ) کی بادشاہی اور معتمد الدولہ آغا میر کی وزارت کا زمانہ تھا، لکھنؤ میں دولت ستانی، حق تلفی اور تعیش کا دور دورہ تھا۔

لوگوں کی طبیعتیں عوام سے لے کر خواص تک عیش پر مائل تھیں، سید انشار (م ۱۲۳۳ھ) کی "دریائے لطافت" (جس کی تالیف میں مرزا قتیل بھی شریک ہیں) کے مطالعہ سے اس زمانہ کے ادب کی بے ادبی، پست مذاقی، ادبی نسوانیت اور دماغی شہوانیت کا پورا پتہ چلتا ہے۔

سلطنت کا مرکز ہونے کی وجہ سے لکھنؤ اور وہاں کے شرفا، اہل حرفہ اور ملازمت پیشہ لوگوں کا مرجع اور امیدواروں کا قبلۂ حاجات ہو رہا تھا، قصبات کے

صدہا شرفا اودھ کی سرکار سے متوسل اور صدہا اُمیدوار قسمت آزمائی کے لئے پڑے ہوئے تھے، اور اچھے برے ہر طرح کے لوگ یہاں آکر جمع ہو گئے تھے، ایک طرف وہ علم وادب اور درس و تالیف کا مرکز تھا، دوسری طرف تعیش، بے راہ روی اور فسق و فجور کا۔

سید صاحب کی تشریف آوری اور آپ کے رفقار کے اخلاق، کردار کا شہرہ دیکھتے دیکھتے پورے شہر میں ہو گیا، علمار کے مواعظ، رفقا، جماعت کی سادگی جفاکشی اور اسلامی مساوات واخوت، ان کی شب زندہ داری اور جوانمردی وشہسواری، ایثار و قربانی، خدمت واطاعت، غرض ان تمام اوصاف نے شہر کی فضا کو متاثر کیا اور سیکڑوں ہزاروں آدمی آپ کے پاس آنے شروع ہوئے ان میں تماشائی بھی ہوتے، طالب حق بھی، اپنی گذشتہ غلطیوں پر نادم بھی، آخرت کے طلبگار اور رضائے الٰہی کے امیدوار بھی اور شبہات کے گرفتار بھی، لیکن یہاں ان سب کو اپنے زخم کا مرہم، اپنے درد کا درماں اور اپنے مرض کی دوا ملتی، سید صاحب سب سے نہایت خندہ پیشانی سے ملتے، عزت ومحبت سے ان کو اپنے پاس جگہ دیتے، ان سے دلجوئی کی باتیں کرتے، ان کو جماعت کی نماز میں شریک کرتے، اس کا فائدہ یہ ہوتا کہ سخت سے سخت دل والے بھی آپ کے پاس آکر نرم پڑ جاتے، لوگوں کو سچی توبہ اور انقلاب حال کی توفیق ہوتی، وہ اپنی جاہلی عادات واطوار سے باز آتے اور اس حال میں یہاں سے رخصت ہوتے کہ ان کی زندگی بدل چکی ہوتی، یقین کی روشنی اور تقویٰ کی متاع گرانمایہ ان کے ہاتھ میں ہوتی، اور وہ سید صاحب اور آپ کے رفقا، کی مدح وثنا میں رطب اللسان ہوتے،

اسی زمانہ میں ایک مرتبہ آپ حسب معمول مسجد میں اپنی جگہ پر تشریف فرما تھے کہ دو صاحبان

امان اللہ خاں اور ان کے بھائی سبحان خاں اور کئی شخص ان کے ہمراہ جو چوری جرائم پیشگی میں طاق اور شہرۂ آفاق تھے، آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے لوگوں نے ان کو آتے دیکھ کر... سید صاحب سے اطلاعاً کہا کہ یہ لوگ بڑے بدمعاش اور حرام کار ہیں آپ نے فرمایا کہ خبردار ان کے سامنے اس کا کوئی تذکرہ نہ ہو، اللہ تعالےٰ سے امید ہے کہ برے کام چھڑا کر ان کو نیک کام کی توفیق دے اور موت بھی ان کی اچھی ہو۔

انھوں نے آکر آپ سے مصافحہ و معانقہ کیا، آپ نے ان کو بڑے اخلاق و احترام کے ساتھ بٹھایا اور دیر تک متوجہ ہو کر ان کی طرف دیکھا، کچھ دیر کے بعد انھوں نے رخصت چاہی، فرمایا بہتر، فرمایا: "تم کیا پیشہ کرتے ہو؟"

انھوں نے بہت عذر کیا کہ آپ اس بات کو نہ پوچھیں اسی طرح رہنے دیں ان کے واقف کاروں میں سے کسی نے کہا کہ بتادو کیا مضائقہ ہے کچھ تمہارے لئے بہتر ہے، آپ نے بھی فرمایا بیان کرو۔

انھوں نے اپنی چوری اور حرام کاری کا تمام حال صاف صاف بیان کیا کہ اب تک ہمارا یہ پیشہ تھا مگر اب سے آپ کے دست مبارک پر توبہ کرتے ہیں، ہم جب کل آپ کے پاس آئے تھے اس وقت ہمارا کچھ خیال نہ تھا صرف سیر تماشہ کی غرض سے آئے تھے، مرید ہونے کا مطلق ارادہ نہ تھا، مگر جب ہم آپ کے پاس بیٹھے اور آپ کا اخلاق دیکھا تو ہمارے دل کا عجب حال ہو گیا کہ اس کی کیفیت بیان نہیں کر سکتے، یکایک دل میں یہی سمایا کہ سب گھر بار بیوی بچے چھوڑ کر آپ کے پاس رہیں، اسی واسطے ہم آئے ہیں، آپ نے فرمایا کہ آج موقوف رکھو جمعہ کو انشاء اللہ تم کو مرید کریں گے، یہ سن کر وہ چلے گئے۔

جمعہ کو کچھ دن چڑھے وہ آئے، آپ نے فرمایا کہ جمعہ کی نماز کے بعد بیعت کرنا' نماز کے بعد وہ بیعت ہوئے اور کچھ زر نقد آپ کے نذر کیا، آپ نے ان سے لے کر پھر ان کے حوالہ کیا، فرمایا کہ ہماری طرف سے اپنے لڑکوں' بالوں کو دینا، انھوں نے کہا کہ اپنے اہل وعیال کو کیونکر آپ سے بیعت کرادیں، فرمایا: "کسی روز اس طرف جانا ہوگا تو مرید کرلیں گے۔"

ایک روز آپ گولہ گنج کی چڑھائی پر جارہے تھے، امان اللہ خاں نے عرض کیا کہ میرا غریب خانہ قریب ہے، اگر وہاں قدم رنجہ فرمائیں تو عین عنایت ہو، ہمراہی وہیں کھڑے رہے، آپ ان کے یہاں تشریف لے گئے، اور ان کے گھر والوں نے آپ کے دست مبارک پر بیعت کی۔

امان اللہ خاں، سبحان خاں اور مرزا ہمایوں بیگ تو سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرچکے تھے، ان کے زمرہ کے تین آدمی غلام رسول خاں غلام حیدرخاں اور صدرخاں اور تھے، ان کو یہ حال معلوم نہ تھا، ایک روز یہ تینوں صاحب امان اللہ خاں کے پاس آئے اور کہا کہ ان دنوں خرچ کی تنگی ہے، اس کی تدبیر کرنی چاہئے یعنی کہیں چل کرچوری کریں، انھوں نے کہا اب ہم سے کچھ نہ ہوگا، کہا کیا سبب ہے، آج کل نہ چلوگے یا کبھی نہیں، قصہ کیا ہے۔؟

مرزا ہمایوں بیگ نے کہا کہ بات یوں ہے کہ ہم توبہ کرچکے ہیں، اب ہم سے انشاء اللہ یہ کام نہ ہوگا، انھوں نے کہا کب تم نے توبہ کی، انھوں نے کہا شاہ پیر محمد کے ٹیلہ پر' بریلی کے جو سید صاحب اُترے ہیں، ان کے ہم مرید ہوچکے ہیں، اور کچھ آپ کے فضائل وکمالات بیان کئے کہ ایک روز ہم چار پانچ آدمی بطور سیر وتماشہ ان کے پاس گئے کہ

دیکھیں تو کیا حال ہے۔ ملاقات ہوئی تو جیسا سنا تھا، ویسا ہی پایا اور انکے ہاتھ پر بیعت کی، انھوں نے ہم کو توجہ دلائی اس سے ہم کو بہت فائدہ ہوا۔ یہ بات سن کر غلام رسول خاں اور ان کے ساتھیوں کو بھی سید صاحب سے ملنے کا اشتیاق ہوا، سید صاحب سے بعض لوگوں نے عرض کیا کہ ایسا معاملہ ہے، سید صاحب نے ان کو بھی اجازت دی، وہ خدمت میں حاضر ہوئے تو سید صاحب کو جتنا سنا تھا، اس سے کچھ سوا ہی پایا، انھوں نے اسی وقت توبہ کی اور آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے، اور اسی روز سے ان کی زندگی بالکل بدل گئی، وہ حرام مال سے نفرت کرنے لگے، اپنے گھروں میں کسی مشتبہ چیز کو استعمال کرنا ان کو بہت دشوار نظر آنے لگا، جب سید صاحب نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا، تو انھوں نے بھی رفاقت کی خواہش کی اس لئے کہ گھر میں رہ کر وہاں کی ناجائز اور مشکوک چیزوں کے استعمال سے بچنا مشکل تھا، سید صاحب نے ان کی تعریف کی اور ہمت افزائی کی، ان کو برکت کی دعا دی اور رزق حلال حاصل کرنے کی ترغیب دلائی۔

جب سید صاحب نے جہاد کے لئے ہجرت کی تو ان میں سے اکثر آپ کے ساتھ تھے، ان میں سے بعض لوگ راہ خدا میں شہادت سے سرفراز ہوئے، اور بعض لوگ زندہ رہے، اور انھوں نے اپنی ساری زندگی صلاح و تقویٰ، اسلام کی خدمت اور مسلمانوں کی خیر خواہی اور نصیحت اور اعلاء کلمۃ اللہ کی جد وجہد اور محنت میں گزار دی۔

عاشقی شیوۂ رندانِ بلاکش باشد

مولانا ولایت علی عظیم آبادی ایک امیر اور عالی نسب خاندان کے چشم وچراغ تھے، ان کی پرورش اسی ناز و نعم میں ہوئی تھی، جس طرح نوابین ورؤساء کی ہوتی ہے، ان کے والد مولانا فتح علی ایک ممتاز عالم اور شہر کے سربرآوردہ وذی وجاہت بزرگ تھے، اور ان کے نانا رفیع الدین حسین خاں صوبہ بہار کے ناظم (حاکم) تھے۔

مولانا ولایت علی نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر اور اپنے شہر میں حاصل کی پھر لکھنؤ آئے جو اس وقت اودھ کا پایۂ تخت، مرکزِ تہذیب وثقافت اور شہرِ علم وادب بنا ہوا تھا، یہاں اُن کا پورا دور خوش پوشاکی اور خوش باشی، اور آرائش ونفاست کا دور تھا، قیمتی سے قیمتی اور اعلیٰ سے اعلیٰ پوشاک زیب تن کرتے اور خوشبوؤں کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرتے۔

جب سید صاحب کا لکھنؤ تشریف لانا ہوا تو مولانا محمد اشرف لکھنوی اپنے شاگرد ولایت علی کو لے کر سید صاحب سے ملنے آئے مقصد صرف یہ تھا کہ ذرا آپ کی قابلیت کا امتحان لینا چاہیے، ان کے ہونہار شاگرد بھی شائد اس لئے آئے تھے کہ اپنے استاد کی فتح سے لطف اندوز ہوں، مولانا محمد اشرف نے سید صاحب سے دریافت کیا کہ "وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ" کی تفسیر آپ کی زبان سے

سننا چاہتا ہوں!

سید صاحب نے اس پر کچھ تقریر فرمائی، اور خاص انداز میں اس کی تشریح کی، یہ وہ مضامین تھے، جو مولانا محمد اشرف صاحب نے کسی کتاب میں نہیں پڑھے تھے، مولانا پر اس کا بہت اثر پڑا، اس قدر روئے کہ ان کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی، پھر دونوں نے اسی وقت سید صاحب سے بیعت کی اور اُن کے شاگرد مولوی ولایت علی نے سید صاحب کا دامن ایسا پکڑا کہ پھر مرتے مرتے نہ چھوڑا، وہ ان کے ساتھ ان کے وطن رائے بریلی گئے، اب یہ نوجوان (جو پٹنہ کے بانکے مشہور تھے، اور ناظم بہار کے لاڈلے اور عیش و تجمل میں اپنی مثال آپ تھے) نمائشی باتوں، اور طمطراق سے بالکل بے پروا ہو چکے تھے، کھانے پینے پہننے کی لذت سے کہیں بلند اور لطیف حقائق ان کے دل و نگاہ کو اپنا اسیر بنا چکے تھے، یہاں اس چھوٹے سے گاؤں (دائرہ شاہ علم اللہ) میں انھوں نے ایک ایسی زندگی کا مشاہدہ کیا جو ان کی گزشتہ زندگی کی بہ نسبت کہیں زیادہ حسین و جمیل اور فطرت سے قریب تر تھی، یہ اس زندگی میں پوری طرح گھل مل گئے، اور جس طرح ان کے دوسرے ساتھی محنت و خدمت میں مشغول تھے، اسی طرح یہ بھی اس میں مشغول ہو گئے، انھوں نے محسوس کیا کہ وہ پہلے سے زیادہ آرام و راحت میں ہیں، اور ان کو جو لطف یہاں آرہا ہے، وہ اپنے گھر میں نہ آتا تھا۔

مولانا عبدالرحیم صادقپوری مصنف "درمنثور" بیان کرتے ہیں کہ ایک دن ان کے والد ماجد مولوی فتح علی صاحب نے ایک خدمت گار کو جو بچپن سے آپ کی خدمت میں رہتا تھا، چار سو روپے نقد اور دس پندرہ عمدہ کپڑے اور جوتے وغیرہ ضروری اسباب دے کر آپ کے پاس بریلی کو روانہ کیا تھا، جب وہ خود مع اسباب کے

بریلی میں پہنچا تو اس نے قافلہ میں جا کر پوچھا کہ "پٹنہ والے مولوی ولایت علی کہاں ہیں؟" لوگوں نے بتایا کہ "دریا کے کنارے مٹی کا کام کر رہے ہیں" وہ نوکر دریا کے کنارے پر پہنچا وہاں بہت سے لوگ گارے مٹی کے کام میں لگے ہوئے تھے، ان میں جناب مولانا بھی سیاہ رنگا ہوا ایک موٹا تہبند باندھے ہوئے اور گارے میں لتھڑے ہوئے اپنا کام کر رہے تھے، ان ایام میں ان کی صورت ایسی متغیر ہو گئی تھی کہ اس قدیمی نوکر نے جو تیس برس آپ کا خدمت گار رہ چکا تھا، آپ کو نہیں پہچانا، خود مولانا سے اس نے پوچھا کہ پٹنہ والے مولوی ولایت علی صاحب کہاں ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ بھائی ولایت علی تو میرا نام ہے، اس نے بہت غصہ ہو کر کہا کہ میں تم کو نہیں کھوجتا، میں ان ولایت علی کو کھوجتا ہوں جو مولوی فتح علی صاحب صادق پوری عظیم آبادی کے صاحبزادہ ہیں، آپ نے فرمایا کہ بھائی صادق پوری ولایت علی تو میں ہی ہوں، وہ نوکر اور خفا ہوا اور بولا کہ تم مجھ سے ہنسی کرتے ہو۔

جب آپ نے دیکھا اس کو ہرگز یقین نہیں ہوتا تو آپ نے فرمایا، اچھا جاؤ قافلہ میں تلاش کرو، جب وہ اور طرف گیا اور دریافت کیا تو ہر شخص نے آپ ہی کی طرف اشارہ کیا کہ مولوی ولایت علی تو وہی شخص ہیں، جن سے تم دریا کے کنارے بات کر آئے ہو، تب وہ دوبارہ آپ کے پاس آیا اور اپنی جسارت پر نادم ہو کر معافی چاہی، آپ نے اس کو گلے سے لگا لیا اور بہت اخلاق سے پیش آئے، اس نے وہ خطوط سمیت روپے وغیرہ آپ کے حوالہ کئے اور عرض کی کہ ان کپڑوں کو پہنئے اور روپوں کو اپنے خرچ میں لائیے، کیونکہ وہ نادان سمجھتا تھا کہ خرچ نہ ہونے کے باعث آپ کی ایسی صورت ہو رہی ہے، آپ کی پہلی کیفیت اور پوشاک وغیرہ کو

یاد کر کے وہ زار زار رونے لگا، آپ نے اُس کی تسلی کر کے اس کو چپ کیا، جب رات ہوئی آپ وہ روپے اور کپڑے وغیرہ جیسے بندھے ہوئے آئے تھے، ویسے کے ویسے ہی لے کر سید صاحب کے حضور میں حاضر ہوئے اور ان سب کو آپ کے سامنے رکھ کر خاموش اٹھ کر چلے آئے اور دوسری فجر کو اسی کہنہ تہبند سے اپنا معمولی کام کرنے لگے۔

متحرک اسلامی معاشرہ

ہندوستان میں فریضۂ حج ایک عرصہ سے متروک تھا، اور بعض علماء نے جن کو علوم عقلیہ میں زیادہ غلو اور انہماک تھا اس بنیاد پر کہ بادبانی کشتیوں پر سمندر کا سفر خطرہ سے خالی نہیں اور "مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلاً" کے منافی ہے، حج کی عدم فرضیت اور ہندوستانی مسلمانوں کے ذمہ سے اس کے ساقط ہونے کا باضابطہ فتوی دے دیا تھا، لیکن غیرت دینی اور فراست ایمانی رکھنے والے اور راسخین فی العلم محسوس کر رہے تھے کہ یہ ایک بہت بڑی دینی تحریف اور ایک بڑا فتنہ ہے، جس کو اگر بروقت روکا نہ گیا تو پھر اس کو ختم کرنا مشکل ہوگا، اور اسلام کے اس عظیم الشان فریضہ اور دین کے اس اہم رکن کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے مستقل تجدید وجہاد کی ضرورت پیش آئے گی، اور اسلام کے مستحکم قلعہ میں ایک ایسا شگاف پڑے گا جس کو بھرنا آسان نہ ہوگا۔

چنانچہ سید صاحب اور آپ کے دونوں رفقاء مولانا عبدالحی برہانوی اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحبان نے علمی اور عملی دونوں طریقوں سے اس فتنہ کے انسداد کی کوشش شروع کی۔

اس کے بعد سید صاحب نے حج کی روانگی کا اعلان کیا، اس کے لئے آپ نے

لوگوں کو خطوط لکھے اور وفود بھیجے، اور تمام ہمراہیوں کے سفر خرچ کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی، دیکھتے دیکھتے سارے ملک میں یہ شہرت ہوگئی کہ سید صاحب حج کو جاتے ہیں، اور سب کو اس کی دعوت دیتے ہیں، اس تحریک و ترغیب سے محبت کی دبی ہوئی چنگاریاں ابھر آئیں اور بجھی ہوئی آتش شوق بھڑک اٹھی، پست ہمت لوگوں کی ہمتیں بلند ہوئیں، لوگوں نے فرط شوق میں اپنی اپنی زمین جائداد بیچ کر حج کی تیاری کی اور مسلمانوں میں ایک نئی ایمانی زندگی کی لہر دوڑ گئی، لوگوں کے خطوط اور وفود آنے شروع ہوئے، کوئی دن ایسا خالی نہ جاتا جس میں ندائے خلیل پر لبیک کہنے والوں کا کوئی وفد نہ آتا ہو، آخر کار وہ مبارک دن آیا، اور شوال کی آخری تاریخ دوشنبہ (۱۲۳۶ھ) کے روز چار سو آدمیوں[۱] کے ساتھ آپ تکیہ سے روانہ ہوئے، سئی ندی[۲] کو پار کر کے، دوسرے کنارہ پر لوگوں کو (جو وہاں جمع ہو گئے تھے) رخصت کرنے کے لئے اور اُن سے بیعت لینے کے لئے آپ نے کچھ دیر توقف فرمایا، اس کے بعد دلمئو[۳] کی طرف روانہ ہوئے جہاں سے کشتیوں پر آپ کو کلکتہ جانا تھا جس وقت آپ نے اپنا شہر چھوڑا اس وقت ہمراہیوں کی تعداد چار سو تھی۔

یہ قافلہ دراصل ایک گشتی مدرسہ، ایک متحرک چھاؤنی اور خالص اسلامی ماحول تھا جس میں علماء وعظ کہتے، لوگ دین و شریعت کے احکام اور اسلام کے آداب سیکھتے

---

[۱] کلکتہ پہونچتے پہونچتے یہ تعداد سات سو رفقاء تک پہونچ گئی جن کو لے کر آپ سفر حج پر روانہ ہوئے۔

[۲] یہ وہ ندی ہے جو حضرت شاہ علم اللہؒ کی بنائی ہوئی مسجد کے عین نیچے بہتی ہے، یہ ندی ضلع ہردوئی کے ایک مقام سے نکلتی ہے رائے بریلی، پرتاب گڈھ، اور جونپور کے اضلاع سے گذرتی ہوئی گنگا میں گرتی ہے۔

[۳] ضلع رائے بریلی کی ایک تحصیل اور ایک تاریخی قصبہ ہے، جو بلندی پر عین گنگا کے کنارہ واقع ہے۔

قافلہ کے سب ہمراہی راستہ کے سرد و گرم برداشت کرنے کے لئے تیار اور تنگی و ترشی میں بھی خدا کے ذکر کے ساتھ رطب اللسان رہتے تھے، کبھی سخت بارش ہوتی، کبھی کڑاکے کی دھوپ، دلدل اور کیچڑ، ندی نالے راستے میں ملتے، اگر کسی کا پاؤں پھسلتا تو وہ ہنس ہنس کر خدا کا شکر ادا کرتا اور کہتا کہ تیرے احسان کے قربان کہ تیرے راستہ میں گراہوں، پچھلی تمام لغزشوں اور ہرزہ گردی کی تلافی یہی ہے، کوئی خواجہ حافظ کا یہ شعر اپنے حسب حال پڑھتا ؎

در بیاباں گر ز شوقِ کعبہ خواہی زد قدم
سرزنشہا گر کند خار مغیلاں غم مخور

چار روز کے بعد جب قافلہ نے ایک مختصر مسافت طے کر لی، بعد نماز عشا سید صاحب نے فرمایا کہ بھائیو تم نے کئی روز مولانا عبدالحی کا وعظ سنا اب چند باتیں ہماری بھی انشاء اللہ تعالیٰ نماز صبح کے بعد سُن لینا۔

سب لوگ نماز پڑھ کر حاضر رہے آپ نے فرمایا:

"بھائیو! اگر تم سب اپنے گھر بار چھوڑ کر حج و عمرہ ادا کرنے، اس نیت سے جاتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ہم سے راضی ہو تو تم کو لازم ہے کہ آپس میں سب مل کر ایسا اتفاق اور خلق رکھو، جیسے ایک ماں باپ کے نیک بخت بیٹے ہوتے ہیں، ہر ایک کی راحت کو اپنی راحت، اور ہر کسی کے رنج کو اپنا رنج سمجھو، اور ہر ایک کے کاروبار میں بلا انکار حامی و مددگار اور ایک دوسرے کی خدمت کو ننگ و عار نہ جانو، بلکہ عزت و افتخار سمجھو، یہی کام اللہ کی رضامندی کے ہیں، جب ایسے اخلاق تم میں ہونگے تو اور غیر لوگوں کو شوق ہوگا کہ یہ عجیب قسم کے لوگ ہیں، ان میں

شریک ہونا چاہیئے۔

اللہ پر کامل توکل رکھو، رزاق مطلق اور حاجت روائے برحق وہی پروردگار عالم ہے، اس کے حکم کے بغیر کوئی کسی کو کچھ نہیں دیتا۔

مجھ کو عنایت الٰہی سے قوی امید ہے کہ اس سفر میں اللہ تعالےٰ میرے ہاتھوں سے لاکھوں آدمیوں کو ہدایت نصیب کریگا، اور ہزاروں ایسے لوگ کہ دریائے شرک وبدعت میں اور فسق وفجور میں ڈوبے ہوئے ہیں، اور شعائرِ اسلام سے مطلق ناواقف ہیں وہ پکے موحد اور متقی ہونگے، اور جناب الٰہی میں میں نے اہل ہند کے لئے بہت دعا کی کہ الٰہی، ہندوستان سے تیرے کعبہ کی راہ مسدود ہے، ہزاروں مالدار صاحب زکوٰۃ مرگئے اور نفس وشیطان کے بہکانے سے کہ راستے میں امن نہیں ہے، حج سے محروم رہے، اور ہزاروں صاحب ثروت اب جیتے ہیں، اور اسی وسوسے سے نہیں جاتے، سو اپنی رحمت سے ایسا راستہ کھول دے کہ جو ارادہ کرے بے دغدغہ چلا جائے، اور اس نعمت عظمیٰ سے محروم نہ رہے، میری یہ دعا اس ذات پاک نے مستجاب کی اور ارشاد ہوا کہ حج سے آنے کے بعد یہ راستہ علی العموم کھول دیں گے، سو انشاء اللہ جو مسلمان بھائی زندہ رہیں گے وہ یہ حال بچشم خود دیکھیں گے۔"

چنانچہ یہی ہوا، آپ کے اس سفر کی برکت سے حج کا دروازہ کھل گیا اور ایسا کھلا کہ حاجیوں کی تعداد برابر بڑھتی گئی اور اس کے ترک کی داستان ایک داستان پارینہ بن کر رہ گئی جس کی جگہ اب صرف تاریخ کے ایک دور افتادہ گوشہ یا حاشیہ پر ہے۔

خدمتِ خلق

کلکتہ جاتے ہوئے آپ جب مرزاپور پہونچے تو آپ نے دیکھا کہ گھاٹ پر روئی سے لدی ہوئی ایک کشتی کھڑی ہے، روئی کا مالک مزدوروں کا منتظر تھا کہ اس روئی کو لادکر گودام لے جائیں آپ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ "روئی کے گٹھے اتارلو" صدہا آدمی اس کشتی میں لپٹ گئے، اور دو گھڑی کے عرصہ میں ناؤ خالی کرکے روئی گودام کے دروازے پر پہونچادی، لوگ یہ حال دیکھ کر متحیر ہو گئے، اور آپس میں کہنے لگے کہ یہ لوگ تو عجیب طرح کے ہیں کہ روئی والے سے نہ جان نہ پہچان بے مزدوری للہ فی اللہ اس کا اپنا کام کردیا، بے شک یہ اللہ والے لوگ ہیں۔[1]

---

[1] وقائع احمدی ۶۴۶۔

اسلامی مساوات

ہندوستان میں صدیوں تک رہنے کی وجہ سے مسلمان غیر اسلامی خیالات و عادات سے ایک حد تک متاثر ہو چکے تھے، ان کی دینی تعلیم بھی ناقص اور ناکافی تھی، خاص طور پر حکمراں اور سربرآوردہ طبقہ اس مرض میں زیادہ گرفتار تھا، اور اس میں برادران وطن کے اثر سے جاہلیت کی بعض قبیح عادتیں پیدا ہو گئی تھیں، جن میں ایک بری عادت طبقہ واریت یعنی مخصوص برادریوں کو ارفع و اعلیٰ سمجھنا، کچھ مخصوص پیشوں کو حقیر سمجھنا اور نسب پر فخر کرنا ہے، بہت سے شرفا اس طرح کے اہل حرفہ اور پسماندہ برادریوں سے ملنا جلنا اور ان کے ہاں کھانا کھانا اور اُن کی خوشی غمی میں شرکت کو باعث ننگ و عار سمجھتے تھے۔

مرزاپور میں سات گھر مسلمان خشت پزوں (بھٹہ کا کام کرنے والوں) کے تھے، جو بڑے دولت مند تھے، ہر کسی کے یہاں پچاس پچاس، ساٹھ ساٹھ گدھے خچر تھے، جو ان سے اینٹیں مول لیتا، اور باربرداری کی مزدوری دیتا، وہ ان گدھوں خچروں پر لاد کر بھجوا دیتے شہر میں وہ گدھے والے کر کے مشہور تھے، اگرچہ قوم کے وہ شریف تھے، مگر اس نام اور پیشے کی حقارت و کراہت کے سبب سے مرزاپور کے مسلمان شرفاء و غرباء ان کے گھر کا کھانا پانی کھاتے پیتے نہ تھے۔

انھوں نے ایک روز سید صاحب سے عرض کیا کہ غریب خانہ پر تشریف لائیں اور بیعت سے مشرف کریں، آپ نے منظور فرمایا، وہاں کے مسلمانوں نے عرض کیا کہ آپ ان کے یہاں نہ جائیں، یہ لوگ گدھے والے ہیں، شہر کا کوئی مسلمان ان کے گھر کا کھانا پانی نہیں کھاتا پیتا، آپ نے فرمایا، کہ یہ کیا بات ہے؟ یہ بھی تو مسلمان بھائی ہیں، حلال پیشہ کرتے ہیں، اس پیشے میں کوئی برائی عیب نہیں، اسکو معیوب جاننا بہت معیوب ہے، اس لئے کہ گدھے خچر پالنا، ان پر سوار ہونا سنت ہے، انبیاء اور اولیاء نے خچر پالے ہیں، اور ان پر سوار ہوئے ہیں، اب تک حرمین شریفین کا یہی دستور ہے، آپ نے ان کو نصیحت اور فہمائش کی اور اینٹ پکانے والوں کو تسلی دی کہ ہم ضرور تمہارے یہاں آئیں گے، اور دعوت کھائیں گے، چنانچہ آپ تشریف لے گئے، اور کھانا تناول فرمایا۔[1]

سید صاحب کی اس تدبر اور عملی نمونہ کی برکت سے ان لوگوں اور اہل شہر کے درمیان بیگانگی کی جو دیوار حائل تھی، وہ خود بخود ڈھا گئی، اور اس کے بعد تمام لوگوں نے ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور کھانا پینا شروع کر دیا۔

---

[1] وقائع احمدی

بھیا سے کہدو کہ اس کو یہاں بھیج دیں

مولانا عبدالحی صاحب اس پورے قافلہ اور لشکر مجاہدین کے شیخ الاسلام تھے، اور سفر و حضر میں ہر جگہ وعظ و ارشاد ان کا معمول تھا، جب یہ قافلہ کسی آبادی میں اُترتا اور قیام کرتا مولانا عبدالحی صاحب وعظ کہتے، اور لوگوں کو اصلاح حال اور توبہ و انابت اور معاصی سے اجتناب کی تلقین کرتے، بدعات و مشرکانہ رسوم سے توبہ کی دعوت دیتے، ان کے مواعظ سے اکثر لوگوں کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں، دلوں میں ایمانی حرارت پیدا ہوتی وہ اسلام و ایمان کی تجدید کرتے اور خدا کی اطاعت اور ترک معصیت کا عہد کرتے، توفیق الٰہی ایک فاحشہ عورت کو مولانا کی ایک مجلس وعظ میں لے آئی یہاں تھوڑی دیر رہ کر اس کو اپنی سابقہ زندگی پر ندامت ہوئی اُس نے پیشہ سے اسی وقت توبہ کی اور ایمان و اطاعت اور طہارت و عفت کی زندگی گزارنے کا مولانا کے ہاتھ پر عہد کیا۔

لیکن مسلمان خاندانوں میں بہت سی جاہلی عادات سرایت کر چکی تھیں، اور ان میں خاندانی شرافت کا غرور پیدا ہو گیا تھا، اور یہ سمجھنے لگے تھے کہ وہ دوسروں سے افضل ہیں، خاص طور پر جن لوگوں کے متعلق ان کو علم ہوتا کہ وہ گنہگار اور کسی معصیت میں گرفتار ہیں، وہ ان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے، شریف گھرانوں کی خواتین ان کی عورتوں کے ساتھ جو نسب میں ان سے کمتر ہیں، بیٹھنا پسند نہ کرتیں اور اس کو بہت معیوب سمجھتیں

پردہ اتنا سخت تھا کہ اس کی وجہ سے بعض وقت فرائض اور نمازوں کا ترک لازم آتا تھا۔

جب یہ عورت تائب ہوئی سید صاحب نے اپنے بھانجہ سید عبدالرحمٰن سے کہا کہ اس کو کشتی پر بٹھادو، وہ عورتوں کی کشتی پر لے گئے تو عورتیں چیخنے لگیں کہ یہاں کوئی جگہ خالی نہیں ہے، دوسری ناؤ پر بٹھاؤ، سید عبدالرحمٰن صاحب نے سید صاحب سے عرض کیا، آپ نے مولوی وحیدالدین صاحب سے فرمایا کہ اس نیک بخت کو کسی جگہ لیجا کر بٹھادو، انھوں نے عورتوں سے کہا، انھوں نے کہا کہ بازاری عورت ہے ہم تو اپنی ناؤ پر نہیں بٹھائیں گے سید عبدالرحمٰن صاحب نے سید صاحب سے ذکر کیا، مولانا عبدالحی صاحب نے یہ بات سنی اور وہاں سے اٹھ کر کشتی کے قریب گئے اور سب عورتوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم اس نیک بخت کو اپنی ناؤ پر کیوں نہیں بٹھاتیں؟ آج اس نیک بخت نے سب برے کاموں سے توبہ کی ہے، اس وقت یہ ہم سب سے افضل ہے، اور جو کچھ خدا اور رسول کا شرعی حکم تم پر ہے وہی اس پر ہے، ان سب نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو اس کو پردہ کرا کر چھت پر الگ بٹھادو، مولانا نے کہا کہ چھت پر کیا تم میں کوئی نہیں بیٹھ سکتی وہی کیوں جا کر بیٹھے، اس میں کچھ اور زیادہ گفتگو ہوئی مولانا نے خفا ہو کر فرمایا کہ اس میں عبدالحی کی جو بیوی ہو وہ چادر اوڑھ کر کشتی پر سے اتر آئے تین بار یہی حکم فرمایا۔ دوبار کہنے سے تو وہ نہیں اتریں تیسری بار جب مولانا نے فرمایا کہ جس طور سے شرعی پردہ تم کو بتایا ہے اسی طور پر چادر اوڑھ کر چلی آؤ، پھر اسی طرح سر سے پاؤں تک چادر اوڑھ کر مولانا صاحب کی بیوی ناؤ سے اتر کر خشکی میں کھڑی ہو گئیں، مولانا کچھ دور کھڑے ہو کر کہنے لگے کہ کیا گھر میں ہم نے تم سے نہیں کہا تھا کہ اس سفر میں تم کو چکی بھی پیسنی پڑے گی، روٹی بھی پکانی پڑے گی، جو ضروری کام ہیں، سب کرنے پڑیں گے، پیدل بھی چلنا ہوگا جب تم نے

یہ سب قبول کیا تب ہم نے تم کو ساتھ لیا، اس کے بعد لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر آواز دی کہ دیکھو عبدالحی کی بیوی کھڑی ہے اور شرعی پردہ خدا اور رسول کے حکم کے مطابق اس کو کہتے ہیں، اور یہ بات تین بار فرما کر اپنی بیوی سے کہا کہ اب وہیں ناؤ پر جا کر بیٹھو، اس کے بعد آپ نے مولوی وحید الدین صاحب سے کہا کہ ہماری بہن بی بی رقیہ سے کہدو کہ اس عورت کو اپنے پاس بلا کر بٹھالیں، اور اس کو نیک باتیں نصیحت کریں، اور دین اسلام کی باتیں سکھائیں، بی بی رقیہ بھی یہ باتیں سنتی تھیں مولوی صاحب سے کہا کہ بھیا سے کہدو کہ اس کو یہاں بھیجدیں[۵]۔

---

[۵] وقائع احمدی ۶۴۹-۶۵۱

توبہ و ایمان کی ہوا چلتی ہے

حجاج کے اس قافلہ کو رائے بریلی سے کلکتہ تک صوبجات متحدہ بہار، اور بنگال ان تین صوبوں کے بیسیوں شہروں اور قصبوں سے گزرنا پڑا، شہر کی آبادی اور اہمیت اور اہلِ شہر کی طلب و خواہش کے مطابق اس کا مختلف جگہوں پر قیام ہوتا، ان مقامات پر اس قافلہ کا جس گرمجوشی اور ذوق و شوق کے ساتھ استقبال کیا گیا اس کا نظارہ بہت مدت کے بعد دیکھنے میں آیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ ملک ازسرِ نو بیدار ہو گیا ہے، اور توبہ کی صلائے عام ہو گئی ہے، لوگ گروہ در گروہ، اور جوق در جوق سید صاحب کے پاس حاضر ہو کر بیعت ہوتے، آپ کے ہاتھ پر توبہ کرتے توحید اور دین خالص کا عہد کرتے، شرک و بدعت اور معاصی و منکرات سے تائب ہوتے، شعائر اللہ کی عظمت اور سنت کی محبت ان کے دل میں راسخ ہوتی، اس بیعت و توبہ کا اثر ان کی زندگی پر بہت جلد ظاہر ہوتا، شرک و بدعت اور تشیع کے نشانات مٹائے جاتے، تعزیے توڑے جاتے، چبوترے اور امام باڑے مساجد میں تبدیل کئے جاتے، بسا اوقات لوگوں نے کاغذ کے تعزیے جلا کر اسی سے آپ کے قافلہ کی دعوت کی، شہر کے تمام باشندے استقبال میں نکل آتے اور کوئی باقی نہ بچتا، لوگوں کا اندازہ تھا کہ بعض اوقات قصبہ اور شہر کا کوئی آدمی ایسا نظر نہ آتا جس نے توبہ اور ایمان کی تجدید نہیں کی۔

بنارس میں ۱۵-۱۶ روز تک پانی کی جھڑی لگی رہی، اس موسلا دھار بارش میں وہاں کے لوگ سید صاحب کو بیعت کے لئے لے جاتے، بعض دفعہ آدھی رات گئے مکان پر تشریف لاتے، کیچڑ اور سیلاب کے باوجود آپ آنے جانے میں کسی سے عذر و حیلہ نہ کرتے، میاں دین محمد کہتے ہیں کہ بنارس میں جس وقت لوگ آپ کو لینے آتے، اسی وقت آپ ان کے ساتھ چلے جاتے، اندھیری رات، بجلی چمکتی ہوئی، مینہہ برستا ہوا، لالٹین روشن آپ لوگوں کے ہمراہ گھر گھر جاتے اور لوگ بیعت ہوتے، بعض وقت لوگوں سے فرماتے کہ بھائیو! یہ پانی کیچڑ میں تمہارا پھرنا محض اللہ تعالےٰ کے لئے ہے، اگر وہ پروردگار تمہارے اس پھرنے کو پسند کر کے اپنے غلاموں، تابعداروں میں شامل کرلے تو کیا عجب ہے، یہ بات سن کر ہم لوگ خوش ہو جاتے، اور اس وقت کی تکلیف کو عین راحت جانتے اور ہرگز نہ گھبراتے۔[1]

بعض مرتبہ کسی کسی محلہ میں کئی کئی ہزار آدمیوں نے آپ سے بیعت کی، دوسرے یا تیسرے روز ایک محلہ کے لوگ آپ کو لے گئے اور کہا کہ آج دونوں وقت آپ کی ضیافت ہے، انھوں نے کئی سو تعزیئے توڑ کر ان کے کاغذ اور لکڑیوں کے انبار لگائے تھے، آپ کو وہاں لیجا کر دکھایا اور عرض کیا کہ آپ کی دعوت کے یہ کھانے پکانے کا ایندھن ہے، دونوں وقت یہی لکڑیاں جلائی جائیں گی، پھر دونوں وقت انھیں لکڑیوں سے انھوں نے پلاؤ پکایا، اور تمام قافلے کو کھلایا، اور بے شمار آدمی جو بیعت کرنے سے باقی رہے تھے، انھوں نے بیعت کی۔[2]

یہاں مسلمانوں کی مختلف برادریوں اور خاندانوں میں زمانہ سے نزاع چلی آرہی تھی

---

[1] وقائع   [2] ایضاً

اور ایک دوسرے کا منہ دیکھنے اور سلام کلام کے بھی روادار نہ تھے، کئی کئی سال ایک دوسرے سے ملاقات کی نوبت نہ آتی تھی، اور یہ عداوت اور قطع رحمی میراث کی طرح ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہو رہی تھی۔

سید صاحب نے اس صورت حال کے پیش نظر مسلمانوں کے درمیان صلح صفائی اور رفع نزاع باہمی کے لئے بڑا کام کیا، اور کئی برادریوں اور خاندانوں کے چودھریوں اور رؤسا، واشراف کو جو باہم دست وگریباں تھے ایک دوسرے سے ملایا، ایک موقع پر ان سب کو جمع کر کے آپ نے فرمایا کہ "ہم نے اکثر لوگوں سے سنا ہے کہ بہت برسوں سے تمہاری آپس میں خصومت اور نااتفاقی ہے، اور کسی طور سے رفع نہیں ہوتی، یہ سب فریب شیطانی ہے، اس میں طرح طرح کے نقصان ہیں، دین کے بھی اور دنیا کے بھی اور سب سے بڑھ کر نقصان قطع رحمی کا ہے، اللہ تعالیٰ نے تم کو مالدار کیا ہے، اور ہر طرح کا ہنر دیا ہے، اس کو دنیا کے کام میں جس طرح چاہتے ہو، صرف کرتے ہو، اور اپنی ناموری پر مرتے ہو، تم کو لائق ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر ادا کرو، اور اس کے کفران نعمت سے ڈرو، اور آپس میں مل جاؤ"، یہ سن کر سب ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے، اور آپس میں صلح صفائی کر لی، اور اس کے نتیجہ میں ان کے ہزاروں برادری والوں اور ماننے والوں نے بھی نااتفاقی سے توبہ کی، ان کی برادری والوں کے علاوہ جتنے ہندو مسلمان وہاں موجود تھے، یہ حال دیکھ کر عالم حیرت میں تھے، اور کہتے تھے کہ برسوں سے یہاں کے سیٹھ ساہوکار، اور شرفاء امراء اس کی کوشش کرتے رہے اور کسی سے کچھ نہ ہو سکا، اور سید صاحب نے ایک ہی جلسہ میں برسوں کا یہ قصہ طے کر کے ملا دیا[1]

---

[1] وقائع

توبہ وبیعت کی صدائے بازگشت شدہ شدہ ہسپتال کے مریضوں تک پہونچی، بنارس میں جو پرانی ٹکسال مشہور تھی، اس میں انگریزوں نے اسپتال بنایا تھا، اس میں ۵۰-۶۰ مسلمان مریض تھے، انھوں نے اپنا آدمی بھیج کر سید صاحب سے درخواست کی کہ ہم لوگ تو معذور ہیں، وہاں تک ہمارا آنا دشوار ہے، مگر آپ للہ فی اللہ یہاں تشریف ارزانی فرمائیں تو ہم بیعت کریں، آپ ایک روز چند آدمیوں کے ہمراہ تشریف لے گئے اور ان مریضوں سے بیعت لی۔

نفل سے فرض تک

عظیم آباد (پٹنہ) پہونچنے پر آپ کی ملاقات چند تبتیوں سے ہوئی جو حج کے ارادہ سے ٹھہرے ہوئے تھے، سید صاحب نے ان سے ان کے ملک اور مسلمانوں کا حال پوچھا، انھوں نے کہا کہ مسلمان اس ملک میں بہت تھوڑے ہیں، اور اکثر صرف نام کے مسلمان ہیں، اور قبر پرستی اور پیر پرستی میں مبتلا ہیں۔

سید صاحب نے ان سے پوچھا کہ تم جو بیت اللہ شریف جانے کا ارادہ کرتے ہو کس قدر زادراہ تمہارے ساتھ ہے، اگر اس قدر ہے کہ کھاتے جاؤ اور کھاتے آؤ تو خیر جاؤ۔

انھوں نے عرض کیا کہ اتنا خرچ تو ہمارے پاس نہیں ہے، مگر ہم نے سنا ہے کہ آپ نے اِذنِ عام دے دیا ہے کہ جو چاہے چلے ہم اس کو اپنے ساتھ لے چلیں گے سو ہم بھی امیدوار ہیں۔

آپ نے فرمایا کہ یہ بات تو سچ ہے کہ جن شرطوں کے ساتھ ہم نے اِذنِ عام دیا ہے، ان شرطوں کے ساتھ جو چاہے چلے، مگر چونکہ زادراہ تمہارے پاس کم ہے، اس لئے حج تم پر فرض بھی نہیں ہے، اور بیت اللہ شریف جانے سے مراد یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو، اب اگر تم سب صاحب مانو تو ایک بات ہم کہیں کہ اس طرح کے

حج کرنے سے ثواب دوچند بلکہ اس سے بھی زیادہ ہو، انھوں نے عرض کیا کہ اس سے بہتر کیا، ہم حاضر ہیں۔

آپ نے فرمایا کہ ہم تم سب کو خلافت نامہ دے کر اپنا خلیفہ کریں گے، اور جہاں ہم تم کو بھیجیں وہاں جاؤ، انھوں نے عرض کیا کہ ہم حاضر ہیں، فرمایا کہ ہم تم کو تمہارے ہی ملک رخصت کریں گے، اور اعلام نامے لکھ دیں گے، وہاں جاکر مسلمانوں کو احکام توحید و سنت سکھاؤ، اور شرک و بدعت سے بچاؤ، مگر ایک بات ضرور کرنا کہ کوئی تم کو لکڑی پتھر لات گھونسہ کتنا ہی مارے تم اس پر صبر کرنا اور ان کو کچھ نہ کہنا اسی طور تعلیم و تلقین کرتے رہنا، پھر عنایت الٰہی سے دیکھنا کہ تھوڑی ہی مدت میں دین اسلام کو کیسی ترقی ہوگی اور وہ سارے ایذا دینے والے خود آکر تم سے خطا معاف کرائیں گے۔

یہ تمام گفتگو سن کر انھوں نے اپنا عذر بیان کیا کہ ہم لکھنا پڑھنا نہیں جانتے اور وعظ و نصیحت کے لئے علم کی ضرورت ہے، آپ نے فرمایا، اندیشہ نہ کرو، اسلام اللہ کا ہے، وہ آپ ہی مدد کرے گا، اور انشاء اللہ تعالیٰ ہزاروں آدمی تمہارے ہاتھ سے ہدایت پائیں گے، کئی ورق میں توحید و سنت کی تاکید اور شرک و بدعت کی رد کی آیتیں اور حدیثیں لکھوا کر انکو دے دیں، اور بنام خدا ان کو روانہ کر دیا۔

بعد کے واقعات نے ثابت کیا کہ سید صاحب کا فرمانا بالکل سچ ثابت ہوا، شروع میں ان کو بہت سختیوں اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ پامردی، استقامت اور صبر کے ساتھ راہِ حق پر جمے رہے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہی لوگ جو کل ان کو ایذا پہونچانے میں سب سے آگے تھے، اُن کے قدموں پر گر گئے اور ہزاروں آدمیوں کو ان سے ہدایت ہوئی، جب تبّت میں دین حق کی دعوت اچھی طرح پھیل گئی تو ان میں سے

کچھ لوگ یہ پیغام لے کر چین روانہ ہوئے اور اس ملک کے لوگ بھی اسلام کی حقیقت اور ایمان کی حلاوت سے آشنا ہوئے۔

اب ہم ٹیکس نہیں دے سکتے

سید صاحب اور آپ کے رفقاء حج کے ارادہ سے کلکتہ پہونچے اور یہاں کئی دن قیام کی نوبت آئی طالبین حق پروانوں کی طرح آپ پر ٹوٹے پڑتے تھے، ہجوم کی وجہ سے آپ کو آرام اور کھانے پینے کا موقع ملنا دشوار ہوگیا تھا، مولانا عبدالحی اور مولانا اسماعیل کے مواعظ کا سلسلہ بھی پورے زور شور سے جاری تھا، لوگوں کو بہت دن کے بعد ایمان کی حلاوت نصیب ہوئی اکثر لوگ کہتے تھے کہ ہم از سر نو مسلمان ہوئے ہیں، پہلے ہمیں صرف اسلام کا نام اور دین کی صورت کا علم تھا، اس کی حقیقت سے ہم ناواقف تھے۔

مولانا عبدالحی صاحب جمعہ کو اور سہ شنبہ کو نماز ظہر کے بعد شام تک وعظ فرماتے تھے، لوگ پروانہ وار جمع ہو جاتے تھے، روزانہ ۱۰۰۔۵۰ ہندو مسلمان ہوتے، ان کے رہنے کے لئے ایک علیحدہ مکان تھا، قافلہ کے دس بارہ آدمی ان کی خدمت وراحت کے لئے مقرر تھے۔

اس وقت بنگال میں کثرت سے رواج تھا کہ پہلا نکاح تو والدین کردیا کرتے تھے

اس کے بعد جس کا جی چاہتا کسی عورت کو اپنے گھر ڈال لیتا اور اس سے بغیر عقد و نکاح ازدواجی تعلقات قائم کر لیتا، چند علماء اس خدمت کے لئے متعین ہوئے، وہ بیعت کے بعد سو سو پچاس پچاس آدمیوں کو الگ بٹھا کر ان کے حالات دریافت کرتے جس عورت یا مرد کے بغیر نکاح کے تعلقات ہوتے اور وہ دونوں وہاں موجود ہوتے، ان کا نکاح پڑھا دیا جاتا، اگر دونوں میں سے کوئی غیر حاضر ہوتا اس کو طلب کیا جاتا، اور نکاح پڑھایا جاتا، اگر اس کی حاضری ممکن نہ ہوتی تو سخت تاکید کی جاتی کہ جلد اس فرض کو ادا کیا جائے۔

برادریوں اور خاندانوں کے چودھریوں اور سرداروں نے اپنے اپنے کنبہ خاندان میں اعلان کر دیا کہ جس نے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی اور شرعی پابندی اختیار نہیں کی اس سے برادرانہ تعلقات منقطع ہیں، ہمیں اس سے اور اس کو ہم سے کوئی سروکار نہیں، اس اعلان پر اس قدر ہجوم اور رجوع اور دین کا ایسا ولولہ عام اور سنت کا بازار گرم ہوا کہ بقول صاحب مخزن ؎

زدیں خلق و عالم پر آوازہ گشت
تو گفتی کہ عہدِ نبی تازہ گشت

کلکتہ میں شراب کی دکانوں کا یہ حال ہوا کہ یک لخت شراب بکنی موقوف ہوگئی، دکانداروں نے سرکار انگریزی میں اس کا شکوہ کیا کہ ہم لوگ سرکاری محصول بلا عذر ادا کرتے ہیں، اور دکانیں ہماری بند ہیں، جب سے ایک بزرگ اپنے قافلہ کے ساتھ اس شہر میں آئے ہیں، شہر اور دیہات کے تمام مسلمان ان کے مرید ہوئے اور ہر روز ہوتے جاتے ہیں، انھوں نے کل مسکرات سے توبہ کی ہے، اب کوئی ہماری دکانوں کو

ہوکر کبھی نہیں نکلتا۔[۱]

چنانچہ حکمنامہ نکلا کہ جب تک سید صاحب اور آپ کی جماعت کلکتہ میں مقیم ہے اس وقت تک ٹیکس نہ پڑیگا، آپ کے جانے کے بعد اگر وہ سابق حالت لوٹ آئے اور شراب کی خرید و فروخت حسب معمول ہونے لگے تو ٹیکس دوبارہ لگا دیا جائے گا۔

اسباب جہالت، یا سامان فلاح وہدایت؟

یہ وہ عہد تھا جس میں ہندوستان کے مسلمانوں میں شہسواری و جوانمردی کے اوصاف تیزی سے روبہ زوال تھے، اور فاتح قوموں کا وہ کردار جس نے ان کے ماضی کو روشن اور تابناک بنایا تھا، اور جس کے ذریعہ انھوں نے بہت قلیل تعداد کے ذریعہ اس طویل وعریض ملک کو فتح کیا تھا، اب اُن کے اندر نظر نہ آتا تھا، آرام طلبی ان کی سرشت میں داخل ہوگئی تھی، حمیت اسلامی اور غیرت دینی کمزور پڑ چکی تھی، انگریز ایک ایک ریاست اور صوبہ کو ہضم کرتے جارہے تھے، دوسری طرف مسلمان خواب خرگوش میں محو اور عیش و آرام میں مست تھے، اور اس تکلیف دہ صورت حال سے ان کے اندر کوئی بے چینی نظر نہ آتی تھی، یہ بات اتنی بڑھ چکی تھی کہ وہ شہسواری و جاں بازی، شجاعت و بہادری اور سامانِ جنگ کو حقارت سے دیکھنے لگے تھے، اور اس کو جاہل اور گنوار لوگوں یا پست طبقہ کا شغل

---

[۱] وقائع احمدی

سمجھنے لگے تھے، اور ان کا یہ عقیدہ ہوتا جارہا تھا کہ علم اور عبادت اور وقار و سنجیدگی کے ساتھ ان چیزوں کا کوئی جوڑ نہیں۔

دوسری طرف سید صاحب کے دل میں جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ موجزن تھا، اور اس ملک کو ظالموں سے آزاد کرانے، اعلاء کلمۃ اللہ اور شوکت اسلام کی تجدید و احیاء کی فکر آپ کے اعصاب و احساسات پر طاری تھی، اور آپ کی ساری فکریں اسی ایک فکر میں ڈھل گئی تھیں۔

سید صاحب کو بچپن ہی سے کھیل کا بڑا شوق تھا خصوصاً مردانہ اور سپاہیانہ کھیلوں کا، کبڈی بڑے شوق سے کھیلتے اور اکثر لڑکوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیتے اور ایک گروہ دوسرے گروہ کے قلعہ پر حملہ کرتا اور فتح کرتا، اس طرح نادانستہ آپ کی جسمانی و فوجی تربیت جاری تھی، ۱۲۲۷ھ میں آپ نواب امیر خاں والی ریاست ٹونک کے لشکر میں شامل ہو گئے، اور ان کے ساتھ متعدد معرکوں میں شریک رہے، آپ کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح آپ کو اس ملک میں حکومت شرعیہ قائم کرنے کا موقع ملے گا، اور غاصبوں و ظالموں سے اس کی آزادی کا راستہ ہموار ہوگا، چنانچہ جب انھوں نے انگریزوں سے مصالحت کر کے ایک چھوٹی سی ریاست پر قناعت کر لی تو آپ نے اُن کا ساتھ چھوڑ دیا۔

آپ کا یہ ذوق و شوق قدرتی طور پر دوسرے ساتھیوں میں بھی سرایت کر گیا، اور یہ چھوٹا سا گاؤں جو پہلے صرف عبادت اور ذکر و تسبیح کا مرکز تھا، دیکھتے دیکھتے ایک فوجی چھاؤنی میں تبدیل ہو گیا، اب وہاں نشانہ بازی، شہسواری اور دوسرے جنگی فنون اور اس کی عملی مشقوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا، اور بڑے بڑے علماء و مشائخ اور

شریف خاندانوں کے چشم و چراغ امرار و اغنیار، فقرا و غربا، بوڑھے اور جوان اس میں مشترکہ طور پر حصہ لیتے تھے، یہ نئی بات اور نیا طرز زندگی بعض علمار و مشائخ اور اہل عبادت و ریاضت کو جو بہت دور دراز سے سید صاحب کا شہرہ سن کر آئے تھے، ناگوار معلوم ہوئی اور ان کو محسوس ہوا کہ وہ پہلا دور اس سے کہیں بہتر تھا جب ان کو عبادت کی حلاوت نصیب تھی، اور ذکر و تسبیح کے سوا یہاں کے در و دیوار سے کوئی اور صدا نہ آتی تھی، ان سب نے مل کر اس معاملہ میں سید صاحب سے گفتگو بھی کی، لیکن آپ نے ان کی رائے کو قبول نہ کیا اور ان کو وہ احادیث یاد دلائیں جو جہاد اور پہرہ داری اور راہ جہاد میں محنت و مشقت کی فضیلت میں آئی ہیں۔[1]

لکھنؤ میں ایک مرتبہ جب آپ قندھاریوں کی چھاؤنی میں تشریف لے جا رہے تھے، آپ بھی ہتھیار باندھے ہوئے تھے، اور وہ لوگ بھی جو آپ کے ساتھ تھے، عبدالباقی خاں صاحب نے یہ دیکھ کر کہا کہ "حضرت آپ کی سب باتیں تو بہتر ہیں مگر ایک بات مجھ کو ناپسند ہے، اور وہ آپ کے خاندانِ والاشان کے خلاف ہے، آج تک یہ طریقہ کسی نے اختیار نہیں کیا، آپ کو وہی کام زیبا ہے، جو آپ کے حضرات آبا و اجداد کرتے آئے" آپ نے فرمایا کہ "وہ کون سی بات ہے"؟ کہا: "یہ سپر، تلوار، بندوق وغیرہ کا باندھنا، یہ سب اسباب جہالت ہیں آپ کو نہ کرنا چاہیئے"! یہ سنتے ہی آپ کا چہرہ غصّے کے مارے سرخ ہو گیا اور فرمایا کہ "خاں صاحب اس بات کا آپ کو کیا جواب دوں؟ اگر سمجھئے تو یہی کافی ہے کہ

---

[1] ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے "دو آنکھیں ہیں جن کو آگ نہ چھو سکے گی ایک وہ آنکھ جو خدا کے خوف سے روئی ہو، دوسری وہ آنکھ جو راہ خدا کے پہرہ میں جاگی ہو ـــــ دوسری حدیث یہ ہے "جس اللہ کے بندہ کے دونوں قدم راہِ خدا میں گرد آلود ہوئے اس کو آگ چھو نہ سکے گی"۔

یہ وہ اسباب خیر و برکت ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو عنایت فرمائے تھے، تاکہ کفار و مشرکین سے جہاد کریں اور خصوصاً ہمارے حضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اسی سامان سے تمام کفار و اشرار کو زیر کر کے جہان میں دینِ حق کو روشنی بخشی، اگر یہ سامان نہ ہوتا تو تم نہ ہوتے اور اگر ہوتے تو خدا جانے کس دین و ملت میں ہوتے۔

آپ کو سب سے زیادہ خیال جہاد کا رہتا تھا جس کو مضبوط و توانا دیکھتے فرماتے کہ "یہ ہمارے کام کا ہے" موراٹیں (ضلع اناؤ) کے شمشیر خاں، الہ بخش، شیخ رمضان، اور مہربان خاں ملاقات کے واسطے آئے چاروں بڑے لمبے لمبے جوان تھے، آپ ان کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہا: "ایسے جوان ہمارے کام کے ہیں پیرزادے لوگ ہمارے کام کے نہیں"، اور بہت تعریف کی وہ آپ کا اخلاق دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ ہم غریب آدمی چار روپے کے سپاہی آپ ہماری اس طرح تعریف کرتے ہیں! بعد میں فرمایا کہ اللہ تعالےٰ جہاد میں اپنا کام تم سے بہت لے گا، پھر مہربان خاں سے کہا کہ: "اللہ تعالےٰ تم سے اور کام لے گا، ان تینوں سے اور کام لے گا، اور وہ دونوں کام خدا کی مرضی کے ہوں گے"[1]

---

[1] "وقائع" صفحہ ۱۴۴-۱۴۳، چنانچہ مہربان خاں حضرت کے متعلقین کی خدمت کے لئے سندھ میں رہے پھر وہاں سے ان کے ساتھ ٹونک گئے اور باقی "اکوڑہ" کے پہلے ہی چھاپے میں شہید ہو گئے۔

انوکھی سوغات

جب لوگوں میں سید صاحب کے عزم جہاد کا چرچا ہوا اور یہ بات مشہور ہوئی کہ آپ سامانِ جنگ اکٹھا کر رہے ہیں، تو قدرتی طور پر ہر شخص نے اس کی خواہش کی کہ وہ اس طرح کے ہدایا پیش کرے جن سے آپ خوش ہوں، اس زمانہ میں آپ کی نظر میں سب سے زیادہ محبوب وہ تھا، جو اس موضوع پر آپ سے بات کرے اور سب سے قیمتی ہدیہ وہ تھا، جو جنگ میں کام آئے، مثلاً کوئی اچھی تلوار کوئی نئی طرز کی بندوق یا اعلیٰ پستول یا اصیل گھوڑا۔

اس معاملہ میں شیخ غلام علی الٰہ آبادی کا قدم سب سے آگے تھا، وہ قسم قسم کے ہتھیار، خیمے اور کپڑے، نقد، سلے اور بے سلے کپڑے، قرآن مجید کے نسخے، کتابیں اور برتن اور جانور سید صاحب کی خدمت میں پیش کرتے، مولوی سید جعفر علی کے والد سید قطب علی کہتے ہیں کہ "شیخ صاحب جتنی بار سید صاحبؒ کی خدمت میں آتے، کوئی نہ کوئی تلوار یا کٹار یا کوئی ہتھیار ضرور لاتے، انھوں نے آٹھ نہایت عمدہ بڑی رائفلیں اور دوسرے ہتھیار پیش کئے، خیموں کی ایک مسجد بنائی تھی، وہ مع فرش کے حاضر کی، بلاشبہ جس طرح حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنی دولت سے حضرت رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم کی وفاداری اور رفاقت کی اسی طرح شیخ غلام علی الٰہ آبادی نے اپنی دولت سید صاحب کے قدموں کے

نیچے ڈال دی اور جہاد فی سبیل اللہ کے راستے میں دل کھول کر مال لٹایا۔[۵۱]

مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری لکھتے ہیں:۔

"انھیں دنوں میں شیخ فرزند علی صاحب غازیپور زمنیا سے دو نہایت عمدہ گھوڑے اور بہت سے وردی کے کپڑے اور چالیس جلد قرآن مجید تحفے کر آئے اور سب سے عجیب تحفہ جو شیخ صاحب موصوف لے کر آئے وہ امجد نام ان کا ایک نوجوان بیٹا تھا جس کو انھوں نے مثل حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے راہِ خدا میں نذر کر کے سید صاحبؒ کے حوالہ کر دیا اور عرض کیا کہ اس کو اپنے ساتھ جہاد میں لے جائیے اور تیغ کفار سے اس کی قربانی کرائیے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، بیٹے نے باپ کی نذر پوری اور شہید ہو کر ان کو سرخرو کیا۔"[۵۲]

آپ کے اعلان جہاد سے لوگوں میں اِس درجہ جذبۂ ایمانی پیدا ہوا اور ندائے ربانی "اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" کا ان پر ایسا اثر ہوا کہ باپ بیٹے اور بھائی بھائی میں مسابقت شروع ہوئی اور قرعہ اندازی کی نوبت آگئی۔

مولانا جعفر علی اپنی کتاب "منظورۃ السعداء" میں لکھتے ہیں کہ جب سید صاحب کے سفر ہجرت اور قصد جہاد کی ہمیں اطلاع ملی تو ہمارے والد سید قطب علی اور برادر سید حسن علی نے ارادہ کیا کہ وہ بھی قافلۂ مجاہدین میں مل جائیں، میرا بھی کچھ ارادہ تھا ہم میں ہر شخص کی خواہش تھی کہ یہ سعادت اس کے مقدر میں آتی، منافست اس قدر بڑھی کہ

---

۵۱ "منظورۃ السعداء" ۵۲ سوانح احمدی، صفحہ ۸۹۔

بالآخر معاملہ والدہ محترمہ کے سامنے لایا گیا، اور قرعۂ فال میرے نام نکلا، چنانچہ سرحد جاکر سید صاحب کے ساتھ مل گیا، آپ استقبال کے لئے باہر آگئے تک تشریف لائے، خوشی سے بند وقلیں سر کی گئیں، آپ نے مجھے اپنا کاتب مقرر کیا اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کے لشکر میں مجھے شامل کیا۔

خوش رہو اہل وطن، ہم تو سفر کرتے ہیں

حج سے واپسی پر ایک سال دس مہینہ آپ کا وطن میں قیام رہا، یہ پورا وقفہ ہجرت وجہاد کی تیاری میں گزرا، اس کے لئے آپ نے بڑے موثر وبلیغ خطوط لوگوں کو ارسال کئے، جن میں ان کی حمیت اسلامی کو ابھارنے، راحت وآرام سے دست کش ہونے اور اہل وعیال اور وطن کو اس راہ میں خیرباد کہنے کی دعوت ہوتی تھی، اس کے لئے آپ نے بہت سے مبلغ اور واعظ مختلف علاقوں میں بھیجے جنھوں نے مسلمانوں میں جہاد کی روح پھونک دی اور شہادت کا شوق پیدا کردیا، راہ خدا میں جہاد اور شہادت کے فضائل جو حدیث میں وارد ہوئے ہیں، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو انعام وسرفرازی کا وعدہ ہے، اور اس کے ترک پر جس ذلت ونکبت اور ادبار کی وعید ہے، وہ سب ان کے سامنے بیان کی، اور یہ ثابت کیا کہ اسلامی حکومتوں کے خاتمہ، شعائر دین کے زوال، اور معاشرہ وزندگی کے فساد میں اس فریضہ کے ترک کو

بہت دخل ہے، اور اس کی بے برکتی سے غیر مسلم بھی بلکہ مویشی، جانور اور کھیت کھلیان تک محفوظ نہیں رہتے، اور یہ سب مسلمانوں کی فرض ناشناسی اور تعیش کی زندگی اور خودغرضی و مصلحت کوشی کا نتیجہ ہے۔[۱]

یہ وہ زمانہ تھا جب پنجاب میں مسلمانوں کی حالت بد سے بدتر تھی، وہ وہاں بہت ذلت وخواری کی زندگی گزار رہے تھے، حکام کے ظلم و زبردستی اور اسلام دشمنی، اور فوجیوں کی درندگی و قساوت اور قتل و غارت گری، لوٹ مار، عورتوں کی آبروریزی اور اغوا کے واقعات عام تھے،[۲] مساجد کی بے حرمتی آزادی کے ساتھ کی جاتی، اور مسلمان خاموشی اور بے بسی کے ساتھ اس کا نظارہ کرتے اور زبان حال سے یہ کہتے :۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ	اور تمہارے پاس کیا عذر ہے کہ تم جہاد نہ کرو
وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ	اللہ کی راہ میں اور کمزوروں کی خاطر سے جن میں
وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا	کچھ مرد ہیں، اور کچھ عورتیں ہیں، اور کچھ بچے ہیں
أَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ	جو دعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو
أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا	اس بستی سے باہر نکال جس کے رہنے والے سخت
وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا۔	ظالم ہیں اور ہمارے لئے غیب سے کسی دوست کو
(النساء ــ ۷۵)	کھڑا کیجئے اور ہمارے لئے غیب سے کسی حامی کو بھیجئے

---

[۱] تفصیل کیلئے "صراط مستقیم" باب چہارم اور سید صاحب کے خطوط کیلئے "سیرت سید احمد شہیدؒ" (طبع چہارم) ملاحظہ کیجئے۔

[۲] اس صورت حال کی تفصیل کرنل مالکم لیپل گریفن اور کنھیالال جیسے مورخین کی کتابوں میں مل سکتی ہے، ڈاکٹر اقبال نے تاریخ ہند کے اس عجیب و المناک دور کی تصویر اپنے ایک شعر میں یوں کھینچی ہے ؎

خالصہ شمشیر و قرآں را ببرد — اندراں کشور مسلمانی بمرد

سید صاحب نے مناسب سمجھا کہ اپنے کام کا آغاز اس مظلوم خطہ سے کریں جہاں مسلمان ایک مطلق العنان، فوجی حکومت کی وجہ سے سخت مصیبت میں گرفتار ہیں، اس کے بعد ہندوستان کی طرف توجہ کریں جس کو انگریزوں نے محض ایک دودھ دینے والی گائے سمجھ رکھا ہے، اس کے لئے پہلے یہ بات ضروری تھی کہ ان کے دائرۂ اثر اور مرکز سلطنت سے باہر ہو کر ایک ایسے آزاد علاقہ سے اپنی جد وجہد کا آغاز کیا جائے جو غیرت و خودداری اور جوانمردی و شہسواری میں ضرب المثل ہے، اور جس کے باشندے فنون حرب سے پیدائشی طور پر واقف اور اس راہ کے نشیب و فراز سے بخوبی آگاہ ہیں۔

یہ علاقہ افغانستان اور پنجاب کی شمال مغربی سرحد پر واقع تھا، اور وہاں کے قبائل قوت و طاقت، اور حریت پسندی میں مشہور اور نامور تھے، کسی بیرونی دشمن.. اور فاتح کے سامنے کبھی انھوں نے اپنا سرِ تسلیم خم نہیں کیا تھا، اور جنگ آزمائی میں ان کی پوری پرورش اور نشو و نما ہوئی تھی، سید صاحب کے رفقاء میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو افغانی النسل تھے اور جن کے آباء اجداد مختلف لڑائیوں میں تلاشِ معاش میں یا طالع آزمائی کے جذبہ سے ہندوستان آکر آباد ہو گئے تھے، اور لشکر سے وابستہ ہو کر سلطنت مغلیہ یا سرکار اودھ کی خدمت و ملازمت میں مشغول تھے، ان میں بہت سے تجربہ کار فوجی قائد (جن میں سے بعض کا ذکر گزر چکا ہے) ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مامور تھے، اور لکھنؤ اور اس کے اطراف کے لشکر میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے، ان افغانیوں میں سید صاحب کے متعدد بہترین رفقاء، اور روحانی حلقہ بگوش اور اعوان و انصار موجود تھے، انھوں نے آپ کو اس علاقہ (سرحد) کی طرف ہجرت پر آمادہ کیا، جو ان کے عزیزوں رشتہ داروں اور دوست و احباب کا وطن تھا،

سید صاحب نے اس تجویز کو پسند کیا اور عزم کیا کہ اپنی جد و جہد کا مرکز اسی علاقہ کو بنائیں گے، اور جہاد و غزا کے مبارک کام کا آغاز یہیں سے کیا جائے گا۔

۷، جمادی الآخرہ ۱۲۴۱ھ (۱۷ جنوری ۱۸۲۶ء) روز دوشنبہ آپ کی ہجرت کا دن تھا، جانبِ جنوب سئی ندی کے دوسری طرف آپ کا خیمہ لگا ہوا تھا، دوشنبہ کا دن بھائیوں عزیزوں اور دوستوں کو رخصت کرنے میں گزرا، رات کے وقت کشتی میں سوار ہوئے، بہت سے آدمی پہنچانے کے لئے چلے، کچھ کشتی پر تھے، کچھ پانی میں، آپ نے کنارے پر جا کر دو رکعت شکرانہ ادا کیا اور بڑے تضرع وزاری کے ساتھ اللہ سے دعا کی، یہ شکرانہ کسی سلطنت کی فتح کا نہ تھا، نہ کسی ایسے مقام کے چھوڑنے کا، جہاں راحت و آسائش اور عزت و سربلندی کے اسباب ناپید تھے، اور جس سے دل کو کوئی لگاؤ نہ تھا، یہ وہ مقام تھا، جہاں آپ کا خاندان ڈیڑھ سو برس سے آباد تھا، اور جس کے ذرّے ذرّے سے آپ کو انس تھا، جہاں ذاتی راحت و عزت کے وہ اسباب موجود تھے، جو کسی بڑے سے بڑے انسان کو میسر آسکتے ہیں، لیکن جس کام کو آپ نے مقصد زندگی بنایا تھا، اس کے حصول کا وہاں کوئی ذریعہ نہ تھا، اس لئے اس کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہنے کا فیصلہ کیا، اور جب اس عزیز و محبوب سرزمین سے جس پر زندگی کی چالیس بہاریں گزاری تھیں، قدم نکالا تو اس پر محبوب حقیقی کی بارگاہ میں اس جوش و مسرت کے ساتھ سجدۂ شکر ادا کیا، جس جوش و مسرت کے ساتھ کم لوگوں نے وطن کی واپسی اور سلطنت کی فتح پر سجدۂ شکر ادا کیا ہوگا۔

تمام رات عزیز مردوں اور عورتوں کی آمد و رفت خیمہ تک رہی، سب کے دلوں پر آپ کی ہجرت اور فراق کا بڑا اثر تھا، ان میں سے سوائے معدودے چند اعزا کے

جو سفر ہجرت و کارِ جہاد میں شریک تھے، پھر کسی عزیز سے اس جدائی کے بعد ملاقات نہیں ہوئی، خود دونوں بیویوں، ایک صاحبزادی (سارہ) عزیز بھتیجوں سید اسمٰعیل و سید یعقوب سے بھی ملنا نہیں ہوا، اس وقت جانے والے اور رخصت کرنے والوں کو ضرور اس کا احساس ہوگا کہ اب ملاقات کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں ہے کہ اللہ تعالےٰ مظفر و منصور وطن واپس لائے اور سارا ہندوستان دارالاسلام بن جائے یا اہلِ وطن اس مہاجر فی سبیل اللہ کے پاس پہنچ جائیں اور یہ دونوں صورتیں ایسی تھیں کہ جو بظاہر آسان معلوم نہیں ہوتی تھیں۔

آخر روانگی کا وقت آیا اور آپ نے اپنے گاؤں (دائرہ شاہ علم اللہ) پر وداعی نظر ڈالی یہ وہ جگہ تھی جہاں آپ کا بچپن گزرا تھا جس کی گود میں آپ نے پرورش پائی تھی، جس کا چپہ چپہ آپ کو عزیز تھا جس کے دریا میں آپ بارہا پیرے تھے، جس کی مسجد کا گوشہ گوشہ آپ کے رکوع و سجود سے آباد و معمور رہا، جہاں آپ کے بڑے یادگار اور درخشاں دن اور بہت پر لطف ساعتیں گزری تھیں، آپ اس سے بیزار ہو کر نہیں جارہے تھے، آج بھی آپ کا دل قدرتی طور پر اس کی محبت سے معمور اور یہاں کے رہنے والوں کے لئے جذبۂ تشکر سے مخمور تھا، لیکن آپ نے اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے نفس کے مطالبہ کو اسلام کے مطالبہ کے تابع کر دیا تھا، اور ضمیر کے سکون اور قلب کی راحت کو جسمانی راحت پر ترجیح دی تھی، درحقیقت یہ حلاوت ایمانی، احساس فرض، اور جذب و شوق کی کیمیا گری تھی جس نے آپ کو رائے بریلی کے ایک گمنام موضع سے بالاکوٹ کی شہادت گاہ تک پہونچا دیا۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ آپ کہد یجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے

فَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ
وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ
تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ
تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ اللَّهِ
وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا
حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي
الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ○

(التوبہ ۔ ۲۴)

اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیبیاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے کا تم کو اندیشہ ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہوں تو تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالے اپنا حکم (سزا) کا بھیجدیں اور اللہ تعالے بے حکمی کرنے والوں کو ان کے مقصود تک نہیں پہنچاتا۔

مہاراجہ گوالیار کے محل میں پہلی صدائے توحید

سید صاحب اپنے قافلہ کے ساتھ ریاست گوالیار سے بھی گزرے، یہ ریاست حیدرآباد کے بعد سب سے بڑی ریاست تھی، اور اس کا مہاراجہ دولت راؤ سندھیا مرہٹوں کا بہت بڑا رہنما اور انگریزوں کے زیر اثر سب سے بڑا غیر مسلم حاکم تھا، مرہٹہ عرصۂ دراز تک مسلمانوں سے برسرپیکار رہ چکے تھے۔ سید صاحب مہاراجہ اور اس کے وزیر ہندو راؤ سے پہلے مراسلت کرچکے تھے، اور ان کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ انگریزوں کے حقیقی خطرہ کو محسوس کریں، اور یہ سمجھیں کہ جب تک اس ملک میں انگریزوں کا وجود ہے، کسی ریاست کی بقا اور کسی حریت کی ضمانت بے معنی ہے، ان دونوں نے اس کے جو جوابات دیئے وہ ہمدردانہ تھے، اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس مسئلہ کی اہمیت محسوس کرتے ہیں۔

جب آپ گوالیار پہونچے تو وزیر اعظم ہندو راؤ نے آپ کا شاہانہ استقبال کیا، آپ پہلے نواب فتح محمد خاں کے باغ میں فروکش ہوئے، دوسرے روز ہندو راؤ نے حاضر ہوکر عرض کیا کہ مہاراج دولت راؤ نے سلام عرض کیا ہے، اور کہلوایا ہے کہ میں بیمار ہوں، حاضر ہونے کی طاقت نہیں رکھتا اگر سرفراز فرمائیں تو بڑا کرم ہوگا، آپ نے فرمایا: بہتر ہے ہم ملاقات کے لئے آئیں گے، مہاراجہ صاحب کو تکلیف کرنے کی

ضرورت نہیں۔" دوسرے دن یا ایک دو روز کے بعد ظہر کے وقت آپ نماز کے بعد دولت راؤ کے محل میں تشریف لے گئے، یکہ گان سرکاری استقبال کے لئے باہر آئے اور اپنے ساتھ محل میں لے گئے، ایک بہت بڑا فرش بچھا تھا، ہندو راؤ نے آپ کے تمام ہمراہیوں کو اسی پر بٹھایا اور آپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دولت راؤ کے کمرے میں لے گیا، دولت راؤ نے بڑی تعظیم و تکریم کی، رانی چلمن کے پیچھے بیٹھی تھی، طرفین سے سلام و مزاج پرسی ہوئی اور گفتگو شروع ہوئی۔

مہاراجہ نے عرض کیا: "میں نے سنا ہے کہ آپ کی توجہ میں بڑی تاثیر و قوت ہے، امیدوار ہوں کہ مجھے بھی اپنے فیض سے سرفراز فرمایا جائے گا" آپ نے فرمایا" آپ کو اس کی کیا ضرورت ہے؟ باطنی توجہ تو قرب خداوندی حاصل کرنے کے لئے ہوتی ہے، اور کفر اس کے منافی ہے، مقوی غذا تندرست آدمی کے لئے باعث تقویت ہے، نہ کہ بیمار کے لئے۔" مہاراجہ نے کہا" دوسرے بزرگانِ دین مجھے توجہ دے چکے ہیں، آپ ایمان کی شرط کرتے ہیں، کیا عجب ہے کہ خالق برتر آپ کی توجہ سے مجھے ایمان کی توفیق ارزانی فرمائے۔" سید صاحب نے فرمایا:" چونکہ آپ ایمان کو سب سے قیمتی چیز سمجھتے ہیں، اس لئے میں توجہ کرتا ہوں۔" آپ نے اس کو سامنے بٹھا کر توجہ فرمائی۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ لشکر اسلام کے موذن شیخ باقر علی نے دروازہ پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے عصر کی اذان دی، محل میں اندر سے باہر تک ایک کھلبلی سی مچ گئی، عورتیں تماشہ دیکھنے کے لئے کوٹھوں پر جمع ہو گئیں، سرکاری اہل کار کام چھوڑ کر تماشہ میں لگ گئے دو فرانسیسی بھی وہاں مقیم تھے، ان کو تعجب ہوا کہ آج تک کسی پیر فقیر نے یہاں ایسی صدا بلند نہیں کی، یہاں تک کہ مہاراج کے پیر صاحب کو بھی آج تک یہاں نماز پڑھتے ہوئے

کسی نے نہیں دیکھا، حالانکہ ان کی آمد و رفت یہاں بہت رہتی ہے، ہندو راؤ نے فوراً چوبدار کو حکم دیا بہشتی حاضر ہوئے اور آن کی آن میں مہمانوں نے وضو کر کے صفیں درست کیں، لوگوں نے جانمازیں جو ان کے ہاتھوں میں تھیں بچھائیں، سید صاحب آگے بڑھ کر مصلّے پر کھڑے ہوئے اور مکبّر نے عربی لہجہ میں تکبیر کہی، آپ نے تکبیر کہی اور نماز شروع ہوئی، تمام حاضرین مجلس کی نگاہیں، آپ کے چہرے پر تھیں، آپ نے سفر کی دو رکعتیں بڑھیں اور سلام پھیرا۔

دوسرے روز رات کے وقت ہندو راؤ نے دعوت کی، آپ اس کے مکان پر تشریف لے گئے، اس نے آگے بڑھ کر استقبال کیا اور فرش پر لا بٹھایا، اتنے میں یکہ گان کی آمد شروع ہوئی، ہندو راؤ ہر ایک کی تعظیم کے لئے اٹھتا تھا، سید صاحب بھی اس کے ساتھ تعظیم میں شریک ہوتے تھے، اس نے عرض کیا کہ آپ تشریف رکھیں آپ کو تکلیف کی ضرورت نہیں، البتہ ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہر ایک کی الگ الگ تعظیم کریں، اس لئے کہ یہ ہماری ریاست کا دستور ہے، آپ بیٹھ گئے یہاں تک کہ بہت سے یکہ گان حاضر ہو گئے، ہندو راؤ نے آپ کو پندرہ اشخاص اور پندرہ یکہ گان کے ساتھ اپنے ساتھ لیا اور مکان میں لے جا کر فرش پر بٹھایا اور مہمانوں کے ہاتھ خود دھلانے لگا، آپ نے منع فرمایا، اس نے کہا کہ میری سعادت اسی میں ہے کہ میں خود ہاتھ دھلاؤں اور آپ کے حاضرین کے سامنے کھانا چنوں، آپ نے فرمایا کہ ہمیں یہ اچھا معلوم نہیں ہوتا، آپ تشریف رکھئے، آپ نے ہندو راؤ کے ہمراہیوں سے کہا کہ ان کے لئے کرسی بچھا دیجئے، ہندو راؤ حکم کی تعمیل میں بیٹھ گیا اور سرکاری اہلکاروں نے سید صاحب کے اور دوسرے حاضرین کے ہاتھ دھلائے، سب سے پہلے جو کھانا حاضر کیا گیا وہ مرہٹی کھانا تھا، جس میں لپی ہوئی

سرخ مرچ بہت تھی، ابھی کسی نے چکھا ہی تھا کہ منتظمین اٹھا کر لے گئے، ہندوراؤ نے عرض کیا کہ ہمارا اصلی قومی کھانا یہی ہے، اس کے بعد ہندوستانی امراء کے کھانے شیرمال، پراٹھے، کئی قسم کے پلاؤ، تنجن، کئی قسم کے قلیے، فیرنی اور یاقوتی وغیرہ لائے، لوگ تھوڑا تھوڑا کھانے پائے تھے کہ ان کو اٹھا لیا اور دوسرے کھانے کئی قسم کے کباب، پسندے، سیخ کباب، بھنا ہوا مرغ وغیرہ لائے، اسی طرح کئی دور ہوئے، یہاں تک کہ کھانے سے فراغت ہوئی اور ہاتھ دھلائے گئے اور پان کے بیڑے جن پر سونے کے ورق لگے ہوئے تھے، لائے گئے، اور عطر لگایا گیا، اس کے بعد کپڑوں کے خوان آئے جن میں اکثر سرخ رنگ کے سیلے اور مندیل تھے، آپ نے دیکھ کر فرمایا "اس کی کیا ضرورت ہے؟" ہندوراؤ نے کہا "یہ پختہ رنگ ہے، سوشوب میں بھی رنگ میں فرق نہ آئے گا، یہ سب برہان پوری ہے، سنا ہے کہ پختہ رنگ شرع شریف میں درست ہے"۔ جوڑوں میں ایک جوڑا کم تھا، سید عبدالرحمن کے لئے فوراً ایک جوڑا منگوایا گیا۔

سید صاحبؒ کے جوڑے میں قیمتی مروارید کا ایک ہار تھا، اور ایک زریں چوغہ، ہندوراؤ اپنے ہاتھ سے پہنانے لگا، آپ نے عذر فرمایا اس نے عرض کیا کہ میری تمنا ہے کہ میں اپنے ہاتھ سے آپ کو پہناؤں ورنہ میں جانتا ہوں کہ آپ استعمال نہیں فرمائیں گے، اس کوشش میں موتی کی لڑی ٹوٹ گئی، اور مروارید بکھر گئے حاضرین نے چن کر خوان میں رکھ دیا اور آپ کی فرودگاہ میں بھیج دیا گیا۔

جہاد سے پہلے جہاد

قافلۂ مجاہدین کا یہ سفر جس میں لکھنؤ و دہلی کے بہت سے شریف زادے علماء و مشائخ اور ناز و نعم میں پلے ہوئے نوجوان بھی تھے، نہایت دشوار گذار اور خود ایک مستقل جہاد اور طویل سلسلۂ مجاہدات تھا، ان کے راستے میں ایسے طویل ریگستان آئے جس میں پانی اور غذا کا دُور دُور پتہ نہ تھا، ایسے خوفناک جنگل آئے جس میں بڑے سے بڑا رہبر بھی راستہ بھول جائے، ان کو اس سفر میں متعدد بار ڈاکوؤں اور چوروں سے واسطہ پڑا، ایسے قبیلوں کے درمیان سے گزر ہوا، جن کی زبان اور معاشرت بالکل اجنبی تھی، بعض وقت ان کو ایسے کنوؤں پر قناعت کرنی پڑی جن کا پانی بیحد گہرا بالکل کھاری تھا، کبھی ان کو پانی حاصل کرنے کے لئے خود کنواں کھودنا پڑتا، ان کو سیکڑوں میل سخت ریتیلی زمین سے گزرنا پڑا اور ایسے علاقوں کو بھی پار کرنا پڑا جن میں سخت نشیب و فراز اور جابجا ریت کے تودے تھے، ان میں ایک قدم چلنا دوبھر تھا، اور اگر کوئی تھک کر قافلہ سے بچھڑ جائے تو درندوں یا ڈاکوؤں کا لقمۂ تر بن جانے کا پورا اندیشہ تھا، مزید براں یہ کہ جن آبادیوں سے قافلہ گزرتا وہاں کے لوگ اُن سے خوف زدہ ہوتے، اکثر کنوؤں کا پانی خراب اور ناقابل استعمال بنا دیتے، کئی جگہ وہ باقاعدہ لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گئے اور بڑی مشکل سے ان کو سمجھایا بجھایا گیا۔

غرض اس حال میں اس قافلہ نے مارواڑ کا مشہور ریگستان عبور کیا، اس پہلے مرحلہ میں انھوں نے دو سو اسی میل کی مسافت طے کی اور بالآخر سندھ میں داخل ہو گئے یہاں حالات بہت مختلف تھے، یہاں کے مسلمان امرا اور عام باشندوں نے ان کا گرمجوشی سے استقبال کیا، یہ علاقہ سادات اور علماء و مشائخ کے اکرام اور مہماں نوازی میں مشہور تھا، لوگوں نے بڑی تعداد میں بیعت اور توبہ کی، سید صاحبؒ نے بھی وعظ و نصیحت، توحید و سنت کی دعوت، حمیت اسلامی اور غیرت ایمانی کی تحریک، جھگڑوں کو ختم کرانے اور ٹوٹے ہوئے دلوں کو ملانے اور دست و گریبان لوگوں کو شیر و شکر بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، لیکن جب مجاہدین بلوچستان میں داخل ہوئے تو پھر ان ہی سخت حالات کا سامنا تھا، برسات کا موسم شروع ہو چکا تھا، اس لئے ان کو جگہ جگہ سیلاب یا تالاب سے واسطہ پڑتا، راستے بےحد خراب اور سفر دشوار، ان کو ایک ایسے پہاڑی علاقہ سے گزرنا تھا، جہاں تہذیب و تمدن کا گزر نہ تھا رہزن بےخوف و خطر وہاں گھومتے اور جس کو چاہتے آزادی کے ساتھ لوٹتے اس لئے یہاں قافلے پورے ہتھیار اور پہرہ کے ساتھ گزرتے تھے، پانی کی بےحد قلت اور خاردار جھاڑیوں اور جنگلی درختوں کی کثرت تھی، ان صحراؤں میں مشہور بلوچ قوم رہتی تھی، ان کو اکثر درخت کاٹ کر نہروں کا پل بنانا پڑتا اس کے بعد اس پر قافلے اور اونٹ وغیرہ گزرتے، سید صاحب اس کام میں اپنے رفقاء کے ساتھ پوری طرح شریک رہتے، کبھی کسی جگہ ضیافت اور دعوت کا بھی موقع آتا اور ان کو عزت و اکرام کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا، اہل قافلہ اس پر خدا کا شکر بجا لاتے اور ان تمام تکلیفوں پر حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتے۔

بالآخر وہ تاریخی "درۂ بولان" آگیا، جو افغانستان سے ہندوستان آنے کا واحد راستہ ہے، یہ "درۂ خیبر" کے بعد دوسرا درّہ ہے، جس کے شمال و جنوب سے فاتح ہندوستان آتے تھے، "درۂ بولان" ایک قدرتی راستہ ہے، جو قدرت الٰہی نے اولوالعزم فاتحین اور ضرورت مند مسافروں کے لئے اس طویل سلسلۂ کوہ کے اندر پیدا کر دیا ہے، جو ہندوستان کو افغانستان سے جدا کرتا ہے، گویا اس سدِ سکندری کے اندر ایک قدرتی شگاف ہے، جس سے احتیاط کے ساتھ قافلے اور لشکر گزر سکتے ہیں، یہ ایک طویل اور گہری گھاٹی ہے، جو کوہ براسک (BRAHWICK) کو کاٹتی ہوئی پچپن میل تک چلی گئی ہے، اس کے دونوں طرف پہاڑوں کی زبردست دیواریں ہیں، جن کی بلندی سطح سمندر سے پانچ ہزار سات سو فٹ تک ہے، بعض جگہ ان میں کافی چوڑے شگاف پائے جاتے ہیں، مگر عموماً ان کی چوڑان چار اور پانچ سو گز کے درمیان ہے، پہاڑی باشندے اور ڈاکو قافلوں کو لوٹنے کے لئے اس کے دونوں غاروں میں چھپے رہتے ہیں، اور موقع پاکر نیچے گھاٹی سے گزرنے والے بے بسوں پر اچانک ٹوٹ پڑتے ہیں، اور آسانی سے ان کا کام تمام کر دیتے ہیں، بعض جگہ یہ گھاٹی اتنی تنگ ہوتی ہے کہ صرف چالیس فٹ رہ جاتی ہے۔

سید صاحب اور آپ کے رفقار شال[1] تک پہونچنے کے لئے اس درہ کو پار کرنے پر مجبور ہوئے جو بعض جگہ سرنگ کی طرح معلوم ہوتا تھا، وہاں سے آپ کو قندھار غزنی اور اس کے بعد کابل جانا تھا، شال کے مسلمان اور مجاہد امیر نے آپ کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا اور ضیافت کی۔

---

[1] یہ شہر اب کوئٹہ کہلاتا ہے، اور بلوچستان میں واقع ہے، اور فوجی و جغرافیائی اہمیت کا حامل ہے

ملک افغانستان میں

سید حمید الدین صاحب لکھتے ہیں" آخر خیر و خوبی کے ساتھ ہم ظہر کے وقت شہر شال[1] میں داخل ہوئے یہاں کے لوگوں کی زبان افغانی ہے، دوسروں کی بات سمجھ نہیں سکتے وہ کمال خلوص اور اعتقاد کے ساتھ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے یہاں کا حاکم جو محراب[2] خاں کی طرف سے مقرر ہے، ایک عظیم الشان سردار ہے، اور رؤسائ و امراء کے طبقے میں ایسا دیندار آدمی کم دیکھنے میں آیا ہے، وہ بھی حضرت کی قدمبوسی کیلئے حاضر ہوا اور لشکر کی ضرورتوں کی تکمیل، بروقت خبر گیری اور دلجوئی کا انتہائی خیال رکھا اور حضرت کی خوشنودی سے مالا مال ہوا، وہاں سے دو کوس پر ایک دیہات میں سادات کا ایک گھر تھا، تیسرے روز اس گھر کے لوگوں نے کھانے اور میوے کی بڑی ضیافت کی اور حضرت کو سو آدمیوں کے ساتھ اپنے گھر لے گئے اور بڑی خوشی سے کھانا کھلایا، اسی روز شال کے حاکم نے حضرت کے ہاتھ پر ارادت اور جہاد کی بیعت کی اور حضرت کو بہت سے مجاہدین کے ساتھ اپنے گھر لے جا کر مہمانداری کا حق ادا کیا اور اس سفر میں

---

[1] یہ درہ بولان کے شمالی دروازے کے عین متصل ہے، ڈھاڈر قدیم سے تقریباً سترہ میل ہوگا (سید احمد شہید)

[2] محراب خاں جو اس وقت بلوچستان کا حاکم تھا محمود خاں کا بیٹا اور نصیر خاں اول کا پوتا تھا، نصیر خاں نے بلوچستان کو ایک مستقل حکومت کی حیثیت دی اس نے ۱۷۹۴ء میں وفات پائی۔

اپنی معیت کی درخواست کی، حضرت نے اس کے حق میں دعائیں کیں اور فرمایا کہ جب ہم بلائیں تو تم آجانا۔

دوسرے روز ۲۸ محرم الحرام کو آپ قصبۂ خوشاب و کاریز ملا عبداللہ سے کوچ کر کے قندھار کی طرف روانہ ہوئے، سیکڑوں سواروں نے اپنے گھر سے نکل کر راستہ میں ملاقات کی اور فرودگاہ تک ساتھ آئے، ہزاروں شرفاء و علماء و فضلائے شہر پیادہ پا استقبال کرتے تھے، اور سواری کے ساتھ ساتھ چلتے تھے کہ راستے اور سڑکیں تنگ ہوگئیں، ہجوم کی کثرت سے خویش و بیگانہ کی تمیز مشکل تھی، اس تزک و احتشام کے ساتھ آپ شہر کے قریب آئے، شہر سے ایک میل مغرب کی جانب دروازہ ہراتی کے قریب آپ کا خیمہ نصب ہوا اور لشکر نے قیام کیا۔

پردل خاں حاکم قندھار نے اپنے بھائی شیر دل خاں کی وفات کی وجہ سے جس کو چوتھا روز تھا، حاضری سے معذرت کی اور ضیافت کا سامان بھیج دیا، آپ نے سلام کہلایا اور فرمایا کہ کل صبح میں خود تعزیت کے لئے آؤں گا، دوسرے دن چالیس آدمیوں کے ساتھ آپ تعزیت و ملاقات اور مرحوم کی فاتحہ خوانی کی تقریب میں تشریف لے گئے، پُردل خاں اپنے تمام بھائیوں کے ساتھ دالان سے نکل کر استقبال کے لئے آیا اور بڑی عقیدت کے ساتھ ملاقات و معانقہ کیا، اندر لے جا کر اپنی مسند پر بٹھایا، آداب و تعظیم بجا لایا اور اس دور دراز سفر کے حالات و مقاصد دریافت کئے اور اس کی تفصیل معلوم کر کے ظاہری بے سروسامانی کے باوجود حضرت کی اولوالعزمی پر حیرت کی اور اس کو تائید الٰہی شمار کیا، دو گھنٹے اسی قسم کی گفتگو اور رسم فاتحہ خوانی کے بعد آپ باہر تشریف لائے۔[۱]

---

[۱] مکتوب سید حمید الدین، مکتوبات قلمی ۲۰۳، ۲۰۴۔

چار روز قندھار میں قیام رہا، خاص و عام میں سے کوئی نہ تھا، جو حاضر نہ ہوا ہو، ہر شخص نے باصرار معیت جہاد کی درخواست کی، نوبت اس کی پہنچی کہ بغیر آپ کی اجازت کے ہزار ہا اشخاص نے جہاد کے عزم سفر کا ساز و سامان درست کرنا شروع کر دیا، حکام کو معلوم ہوا تو شہر آشوبی کے خطرہ سے پریشان ہو کر نوابوں کو حکم دیا کہ شہر سے کسی کو نکلنے نہ دیں، لوگ اس پر بھی باز نہ آئے، تو حضرت کو پیغام بھیجا کہ آپ کے تشریف رکھنے سے سارا شہر شوقِ جہاد میں آپ کی معیت کے لئے بیقرار ہے، انتظام حکومت درہم برہم ہو رہا ہے، ہماری گزارش ہے کہ آپ کابل تشریف لے جانے میں تعجیل فرمایئے اور اہل شہر میں سے جو آپ کی معیت کی درخواست کرے قبول نہ فرمایئے۔

حضرت بے لطفی کے اندیشہ سے ۳ صفر کو قندھار سے روانہ ہو گئے اور کاریز حاجی عبدالعزیز پر قیام فرمایا، ۴ صفر کو وہاں قیام فرما کر قندھار سے کابل تک کے لئے اونٹ کرایہ پر لئے اور ۵ صفر کو وہاں سے کابل کی جانب روانہ ہو گئے اور قلعہ اعظم خاں پر منزل کی۔

افغانستان کے پایۂ تخت میں

غزنی میں بھی آپ کا اسی طرح استقبال ہوا جس طرح قندھار میں ہوا تھا، غزنی دو روز قیام کر کے آپ کابل روانہ ہوئے۔

راستہ میں ملا حاجی ملا علی ایک سردار فوجِ شاہی، حکومت کابل کی طرف سے پچاس سوار اور پیادوں کے ساتھ حاضر ہوئے اور سردار کابل کا سلام پہنچایا اور سرکاری طور پر آپ کا استقبال کیا، اکثر رؤساء و عمائد دار السلطنت اور ہزارہا خاص و عام آپ کے استقبال کے لئے شہر سے باہر آئے تھے، اور آپ کی سواری کے ہمراہ تھے، نصف راستہ پر امین اللہ خاں نائب سلطان محمد خاں بڑے تزک و احتشام سے سواروں اور پیادوں کے ساتھ آپ کا منتظر تھا، سلام و مزاج پرسی ہوئی، جہاں سے شہر کا دروازہ ایک کوس رہ جاتا ہے، وہاں سوار اور پیادہ استقبال کرنے والوں کا اس قدر ہجوم ہوا کہ راستہ چلنا مشکل ہو گیا، حصار کے دروازہ پر جہاں کوہ شمالی اور کوہ جنوبی آکر ملتے ہیں، اور ان کے درمیان سے کابل کی ندی بہتی ہے، اور اس کے شمالی ساحل پر شارعِ عام ہے اور اس درے سے مغرب کی طرف، جو وسیع میدان ہے، جب سواری وہاں پہنچی تو سلطان محمد خاں اپنے تین بھائیوں کے ساتھ پچاس سواروں کی جمعیت کے ساتھ استقبال کے لئے کھڑے ہوئے تھے، سید صاحب نے دُور سے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا،

انھوں نے ادب سے سلام کا جواب دیا اور سواری سے اتر آئے، آپ نے بھی سواری سے اتر کر مصافحہ و معانقہ کیا، پھر حضرت کو سوار کرا کر خود سوار ہو کر ہم رکاب چلے، بے شمار رؤسا و عمائد شہر جوق جوق آرہے تھے، اور سلام و مزاج پرسی کرتے تھے، گھوڑوں اور ہجوم کی وجہ سے ایسی گرد اڑتی تھی کہ کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی، سلطان محمد خاں نے اجازت چاہی اور اپنے نائب امین اللہ خاں سے کہا کہ حضرت کو شہر کے بازار میں سے ہو کر لے جاؤ تاکہ تمام اہل شہر آپ کے دیدار سے اپنی آنکھیں روشن کریں، آپ بازار سے گزر کر وزیر فتح خاں کی شاندار حویلی اور دلفزا پائیں باغ میں مقیم رہے۔

اس وقت ان بھائیوں میں (جنھوں نے افغانستان اور ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کو آپس میں تقسیم کر رکھا تھا) سخت رقابت و دشمنی تھی،[۱] جس کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کو اس علاقہ میں سخت نقصان پہونچا اور اسی وجہ سے لاہور کی سکھ حکومت کو اس کی جرأت ہوئی کہ وہ اس آزاد علاقہ پر جو سپہ گری و شہ سواری کا مرکز، فاتحین و کشور کشاؤں کا وطن، اور شیر مردوں کا مسکن سمجھا جاتا تھا للچائی ہوئی نظریں ڈال سکے اور اسی وجہ سے سکھ اور اس کے بعد انگریز ان کے بعض ایسے علاقے چھین لینے میں کامیاب ہو سکے جہاں ابھی تک کسی غیر ملکی کا قدم نہ پہونچا تھا، اور کفر کا علم

---

[۱] یہ خاندان بیس سے زیادہ بھائیوں پر مشتمل تھا، جو ایک باپ پائندہ خاں کی اولاد تھے، لیکن ان میں سولہ زیادہ نام آور اور ممتاز تھے اور اکثر افغانستان، سرحد، اور کشمیر کے مختلف علاقوں میں حکومت کرتے تھے، ان میں سردار دوست محمد خاں (امیر امان اللہ خاں کے دادا) سردار سلطان محمد خاں (شاہ نادر خاں اور ظاہر شاہ کے دادا) یار محمد خاں حاکم پشاور، محمد عظیم خاں حاکم کشمیر، پیر محمد خاں حاکم غزنی اور شیر دل خاں حاکم قندھار قابل ذکر ہیں۔

بلند نہ ہوا تھا۔[1]

سید صاحب یہاں ڈیڑھ ماہ کے قریب ان سب کو متحد کرنے اور ان کو ایسی قوت بنانے کی سعی کرتے رہے، جو نئے خطرہ سے مقابلہ کر سکے، اسلام کی کھوئی ہوئی عزت اور افغانیوں کے مجروح وقار و اعتبار کو بحال کر سکے، اور ان کی مدد سے پہلے سکھوں سے اور آخر میں انگریزوں سے کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکیں، اور ایک ایسی اسلامی حکومت اور عسکری قوت کی بنیاد ڈال سکیں، جو ہندوستان کی سرحد سے قسطنطنیہ کی فصیل تک وسیع ہو، لیکن آپ کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، اور آپ وہاں سے پشاور کے لئے روانہ ہوئے تاکہ اپنے لشکر کے لئے مناسب مرکز اور چھاؤنی تلاش کر سکیں، اور ان اعلیٰ مقاصد کے لئے تیاری شروع کر سکیں جن کے لئے انھوں نے اپنے گھر بار اہل و عیال اور اپنے محبوب و عزیز وطن کو خیر باد کہا تھا، پشاور میں تین روز آپ کا قیام رہا، وہاں سے ہشت نگر تشریف لے گئے، آپ کی تشریف آوری کی خبر سن کر اس مقام کے تمام مرد مور و ملخ کی طرح آپ کی زیارت کے لئے جمع ہو گئے، جوانب و اطراف کی عورتیں بھی مجتمع ہو گئیں، آپ اس وقت اونٹ پر سوار تھے، اونٹ کے زین پوش کی جھالر کو عورتوں نے تبرک کے طور پر توڑ لیا، اونٹ کی دم کے بال تک نوچ لئے، اونٹ کے پیروں کے نیچے کی خاک بھی تبرک سمجھ کر کوئی اپنی آنکھ میں لگاتی تھی، کوئی منہ پر ملتی تھی، کسی نے گھر لے جانے کے لئے

---

[1] اس بات کی تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجیے "تاریخ افغان" "AFGHANS HISTORY" از "ARTHUR CONOLLY" جو اس کی ضخیم کتاب "JOURNEY TO THE NORTH OF INDIA" (شمالی ہند کا ایک سفر) کا ضمیمہ و تکملہ ہے۔

وہ خاک اپنے کپڑے میں باندھ لی، سب لوگوں نے آپ کو لے جا کر بستی کے کنارے آپ کا خیمہ نصب کیا اور سب قافلہ وہیں اُترا، چند روز قیام کر کے اور وہاں کے مسلمانوں کو جہاد کی دعوت و تبلیغ فرما کر خویشگی ہوتے ہوئے نوشہرے تشریف لائے جہاں سے اس محبوب عمل عبادتِ عظمیٰ کا آغاز کیا گیا، جو برسوں کی دعوت و تبلیغ اور جد و جہد کا ماحصل اور اس پُرمشقت و پُرمحن سفر کا مقصد تھا جس کی نظیر پچھلی صدیوں کے فاتحین اور کشور کشاؤں کی تاریخ میں بھی ملنی مشکل ہے، اور جو صرف قوتِ ایمانی شوق و محبت اور اعتماد علی اللہ کا کرشمہ تھا، یہ سید صاحب کی عظمت و عزیمت اور حسن تربیت کی ایک ایسی یادگار ہے، جس سے ہندوستان کی ہزار سالہ اسلامی تاریخ خالی ہے۔

حکومت لاہور کو اعلام نامہ

۱۸ ر جماد الاول ۱۲۴۲ھ (۱۸ ر دسمبر ۱۸۱۲ء) کو آپ نوشہرہ[۱] پہونچے اور یہ فیصلہ کیا کہ مجاہدین کی پہلی چھاؤنی اور لشکرگاہ کی یہی چھاؤنی ہوگی، آپ نے یہ بھی عزم کیا کہ یہ جہاد سنت کے موافق ہوگا، اس لئے کہ یہ مجاہدین اپنے گھروں کو حب جاہ اور نفس کی چاہ کے لئے چھوڑ کر نہیں آئے ہیں، ان کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ کسی ریاست اور سلطنت کی بنیاد ڈالیں اور اس کے سایہ میں آرام کے ساتھ زندگی گزاریں اور لوگوں پر اپنا حکم چلائیں، وہ جاہلیت یا عصبیت کے پرچم کے نیچے جہاد نہیں کر رہے ہیں، جس کا مقصد صرف لوگوں کو ایک انسان کی غلامی سے نکال کر دوسرے انسان کی غلامی میں اور نفس کی خواہش سے دوسری خواہش کی گرفتاری میں لانا ہوتا ہے، وہ صرف اس لئے اپنا پسینہ اور خون بہا رہے ہیں، تاکہ اس سرزمین پر خدا کا نام بلند ہو، خدا کا دین اور قانون غالب ہو، اس لئے آپ نے عزم کیا کہ یہ سارا جہاد و قتال کتاب و سنت، اسوۂ نبوی اور صحابہ و تابعین کے نقش قدم پر ہو، اور وہ اس معاملہ میں صرف متبع ہوں مبتدع نہ ہوں۔

۱۔ نوشہرہ اس زمانہ میں انگریزوں کی بڑی فوجی چھاؤنی تھی، اب وہ مغربی پاکستان کے صوبہ سرحد کا ایک ضلع ہے۔

حضور صلے اللہ علیہ وسلم جب کسی لشکر کو روانہ فرماتے تو اس کو وصیت فرماتے تھے کہ جب تم مشرکین سے برسرپیکار ہونا چاہو تو ان کو تین باتوں کی دعوت دو، اگر ان تینوں میں سے وہ ایک بات بھی مان لیں تو ان سے درگزر کرو، پھر ان کو اسلام کی دعوت دو اگر وہ یہ دعوت قبول کرلیں تو ان کی بات مان لو اور ان سے اپنا ہاتھ روک لو، پھر ان کو مہاجرین کے وطن کی طرف ہجرت کرنے کی دعوت دو اور ان کو آگاہ کردو کہ اگر وہ ایسا کریں گے تو مہاجرین کے سارے حقوق ان کو حاصل ہوں گے، اور ان کی ذمہ داریاں بھی ان پر عائد ہوں گی، اگر وہ اس سے انکار کریں تو ان کو بتادو کہ ان کی حیثیت اعرابیوں کے برابر ہوگی، اور ان پر وہی قانون نافذ ہوگا جو عام مسلمانوں پر نافذ ہوتا ہے، اور ان کو غنیمت میں اس وقت تک حصہ نہ ملے گا جب تک وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر جہاد نہ کریں اگر وہ اس سے بھی انکار کریں تو ان سے جزیہ طلب کرنا، اگر وہ جزیہ دیں تو اپنا ہاتھ روک لینا اگر انکار کریں تو اللہ تعالٰے سے مدد طلب کرنا اور ان سے قتال کرنا[1]، مسلمانوں نے عہد آخر میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی اس وصیت کو بالکل فراموش کردیا تھا[2]، بالخصوص

---

[1] صحیح مسلم (بروایت سلیمان بن بریدہؓ)

[2] اس بات سے صرف حضرت عمر بن عبد العزیز مستثنٰی ہیں، جو شریعت کے مکمل قانون اور مالی و دیوانی و انتظامی و حربی معاملات میں سنت نبوی پر سختی سے کاربند رہے، اور جنھوں نے سمرقند کو فتح کرنے کے سات سال بعد واپس کردیا، اہل سمرقند نے ان سے شکایت کی کہ قتیبہ نے اس شہر پر اسلام کی دعوت دیئے بغیر قبضہ کرلیا اور ان کو جزیہ اور قتال میں انتخاب کا موقع نہیں دیا انھوں نے قاضی کو حکم دیا کہ اس معاملہ کی تفتیش کریں اگر سمرقند کے مشرکین کی بات صحیح ثابت ہو تو اسلامی لشکر کو شہر چھوڑنے کا حکم دیا جائے اور دوبارہ شریعت کے اس حکم پر عمل کیا جائے چنانچہ یہی ہوا اور اس کے نتیجہ میں شہر کے اکثر باشندے داخل اسلام ہوئے۔
(فتوح البلدان للبلاذری ص۴۱۱)

مسلم سلاطین و فاتحین اس کو نظر انداز کر کے یہ سمجھنے لگے تھے کہ جنگ کا شاید دین سے کوئی تعلق نہیں اور اس میں احکام شرعیہ کے اجرا کی کوئی ضرورت نہیں، گویا اسلام نے ان کو اس معاملہ میں آزاد اور شتر بے مہار کر دیا ہے کہ جو چاہیں کریں، وہ عہد آخر میں ملک گیری کی ہوس رکھنے والے عام فاتحین و سلاطین کے نقش قدم پر چلنے لگے، چنانچہ نہ اسلام کی دعوت دینے کی ضرورت باقی رہ گئی، نہ جزیہ کی مہلت دینے کی، اول و آخر ایک چیز ان کے سامنے رہ گئی اور وہ تھی جنگ اور صرف جنگ۔

سید صاحب نے ارادہ کیا کہ اس افضل ترین عبادت، بہترین عمل اور اپنے سب سے محبوب و عزیز کام کا آغاز اسی سنت کے احیا سے کریں جو صدیوں سے متروک و فراموش ہو چکی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس جدوجہد اور جہاد میں برکت عطا فرمائے اور اس کا نور پوری زندگی میں سرایت کر جائے، چنانچہ شرعی دستور کے مطابق آپ نے حاکم لاہور رنجیت سنگھ[1] کو اس مضمون کا اعلام نامہ تحریر فرمایا:۔

---

[1] رنجیت سنگھ .... (۱۷۸۰ء - ۱۸۳۹ء) ان حوصلہ مند و ممتاز جنگی قائدین میں ہے، جو اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط میں سامنے آیا اور اپنی حربی صلاحیت سے ایک مستحکم اور وسیع سلطنت کی بنیاد رکھی احمد شاہ ابدالی نے جو افغانستان کا بھی فرمانروا تھا جس وقت لاہور کی حکومت اس کے حوالہ کی اس وقت اس کی عمر بیس سال تھی لیکن تھوڑی ہی مدت میں نہ صرف اس نے آزادی کا اعلان کر دیا، بلکہ اپنی حکومت کے حدود بھی وسیع کرنے شروع کئے اور جلد ہی اس کی نوزائیدہ سلطنت کی قلمرو شمال و مغرب میں کابل تک اور جنوب و مشرق میں جمنا کے کناروں تک وسیع ہو گئی اس کی فوجوں نے ملک کے شمالی مغربی حصہ میں کافی دہشت پھیلا رکھی تھی، اور اپنی راہ میں حائل ہونے والی فوجی قوت اور سکھ ریاست کا خاتمہ کر دیا تھا، اس کی نوخیز سلطنت کے استحکام و قوت کے (باقی ص ۱۰۲ پر)

۱۔ یا تو اسلام قبول کر لو۔ (اس وقت ہمارے بھائی اور ہمارے مساوی ہو جاؤ گے، لیکن اس میں کوئی جبر نہیں۔)

۲۔ یا ہماری اطاعت اختیار کر کے جزیہ دینا قبول کرو، اس وقت ہم اپنے جان و مال کی طرح تمہارے جان و مال کی حفاظت کریں گے۔

۳۔ آخری بات یہ ہے کہ اگر تم کو دونوں باتوں میں سے کوئی بھی منظور نہیں تو لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ مگر یاد رکھو کہ سارا یاغستان اور ملک ہندوستان ہمارے ساتھ ہے، اور تم کو شراب کی محبت اتنی نہ ہوگی جتنی ہم کو شہادت کی ہے۔

حاکم لاہور نے اس کو ایک معمولی مکتوب سمجھ کر نظر انداز کر دیا، اس نے محسوس کیا کہ یہ مسلمانوں کے کسی شیخ اور دینی رہنما کا ایک دھمکی آمیز خط ہے جس کی پشت پر نہ کوئی حکومت ہے، نہ کوئی عسکری قوت اور جدید ہتھیاروں سے لیس باقاعدہ فوج، یہ کسی ایک عالم اور پیر کا وقتی جوش ہے، جو جہاد کے لفظ سے بہت جلد آمادۂ پیکار ہو جاتے ہیں، اور ان کے گرد پُر جوش

(باقی صدا۱۰ کا) عناصر چار تھے، پہلی چیز اس کی فطری قائدانہ صلاحیت دوسری اس کی فوج کی جنگ آزمائی اور وفاداری (جو زیادہ تر پنجاب کے کسانوں اور جنگی خاندانوں اور قبائل پر مشتمل تھی) تیسری چیز نفرت جو سکھوں اور خاص طور پر اکالی گروہ کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے جاگزیں تھی، چوتھی چیز مسلمانوں کا زوال، حربی و اخلاقی انحطاط اور انتشار و پراگندگی تھی جس کی کچھ تفصیل اوپر گذر چکی ہے، خود رنجیت سنگھ اس درجہ متعصب نہ تھا، اس نے اس کو ایک عملی حقیقت کے طور پر تسلیم کر لیا تھا، اور اپنی فوجوں کے مسلم دشمن جذبات کا پورا ساتھ دے رہا تھا اور اپنے سیاسی و حربی مصالح کے لئے انکو بہت کچھ چھوٹ دے رکھی تھی اس کے دور سلطنت میں مسلمان خوف و دہشت میں دن گزار رہے تھے، اور ایک ذلیل قوم کی طرح مختلف قسم کے مظالم اور اہانتوں کا شکار تھے (دیکھئے کتاب "RANJEET SINGH" از SIR LEPEL GRIFFIN)

مریدین کی ایک جماعت اکٹھا ہو جاتی ہے، لیکن جب حقیقت سامنے آتی ہے تو یہ سب ساتھی ان کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، اس کو گذشتہ سالوں میں اس طرح کے معاملات کا تجربہ ہو چکا تھا، اس نے کہا یہ وقتی گرج چمک ہے، جو ابھی غائب ہوتی ہے، اس نے اپنے کمانڈر بدھ سنگھ کو حکم دیا کہ وہ اس عجیب سرپھری جماعت پر نظر رکھے، اس کے بعد اطمینان کر کے اپنے امور سلطنت اور عیش و طرب میں مشغول ہو گیا۔

وقت گزرتا گیا اور ایک دن ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۲۴۲ھ کو مجاہدین نے بدھ سنگھ کے لشکر پر جو آمادۂ پیکار تھا، پہلا شبخون مارا اور اپنی شمشیر کے خوب جوہر دکھائے اس معرکہ میں ان کی شجاعت و بہادری اور جنگی قابلیت اندازہ سے بڑھ کر سامنے آئی اور یہ ثابت ہو گیا کہ وہ لقمۂ تر نہیں جس کو آسانی سے نگلا جا سکے، اس پہلے معرکۂ جہاد میں سکھوں کے سات سو فوجی مقتول ہوئے اور ستر سے کچھ اوپر مجاہدین نے جام شہادت نوش کیا۔

ایک مسلمان کا شوقِ شہادت

سید صاحب نے اکوڑہ پر شبخون مارنے کی غرض سے مجاہدین کی ایک منتخب جماعت تیار کی، یہ مجاہدین کا وہ پہلا دستہ تھا جس سے اس ملک میں بہت طویل عرصہ کے بعد خالص دینی بنیادوں پر جہاد فی سبیل اللہ کا آغاز ہوا۔

سید صاحب نے لشکر کے ذمہ داروں کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ انتخاب کر کے مضبوط و توانا اور سخت جان نوجوانوں کی ایک جماعت تیار کریں اس لئے کہ ان کو رات کو ایک طاقتور اور کثیر التعداد دشمن کا مقابلہ کرنا ہے۔

مجاہدین کی ایک فہرست سید صاحب کے سامنے پیش کی گئی آپ نے اس پر ایک نظر ڈالی تو اس میں عبد المجید خاں جہان آبادی کا نام بھی تھا، جو کئی روز سے بخار میں مبتلا تھے، آپ نے ان کا نام فہرست سے حذف کر دیا، جب عبد المجید خاں کو یہ اطلاع ملی کہ ان کا نام مجاہدین کی فہرست سے نکال دیا گیا ہے، وہ یہ خبر سن کر اسی بخار کی حالت میں بستر سے اٹھ کر سید صاحب کے پاس آئے اور پوچھا کہ ان کا نام فہرست سے کیوں حذف کر دیا گیا، سید صاحب نے ان کی تسلی کی اور فرمایا کہ تم کو بخار آتا ہے، اس لئے ہم نے تمہارا نام نہیں شامل کیا، انھوں نے کہا کہ حضرت آج اللہ کی راہ میں دشمن سے

پہلا مقابلہ ہے گویا آج جہاد فی سبیل اللہ کی بنا قائم ہوتی ہے، میں ایسا سخت بیمار نہیں ہوں کہ جا نہ سکوں میرا نام آپ مجاہدین میں ضرور داخل فرمائیں، آپ نے ان کا نام بھی فرد میں داخل کرایا اور کہا بارک اللہ وجزاک اللہ، اللہ تعالےٰ تم کو دین کی کوشش کی زیادہ توفیق عنایت کریں۔

غرض عبدالمجید خاں اکوڑہ کی جنگ میں مجاہدین کے ساتھ شریک ہوئے، دشمن کی تعداد مجاہدین سے دس گنا زیادہ تھی، لیکن اللہ تعالےٰ نے ان کو غالب اور فتحیاب کیا اور عبدالمجید خاں خلعت شہادت سے سرفراز ہوئے۔

جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے

اکوڑہ کی جنگ کے بعد بڑی تعداد میں لوگ سید صاحب کے گرد جمع ہو گئے لیکن یہ لوگ مختلف اغراض رکھتے تھے، بعض لوگ محض یہ دیکھ کر اس میں شامل ہوتے تھے کہ یہ ایک اہم جمعیت ہے، اور اس ابھرتی ہوئی قوت میں روز بروز اضافہ ہونے کا امکان ہے، اس لئے مصلحت اندیشی اور دور بینی کا تقاضا یہ ہے کہ اس نئی جماعت میں شمولیت اختیار کر لی جائے، بعض لوگ صرف مال غنیمت اور ہتھیار وغیرہ کی لالچ میں مجاہدین کے ساتھ ہو گئے تھے، بہت سے لوگ وہ تھے جن کی نیت واقعی درست تھی، اور ان کو صرف دینی جذبہ اور شوق شہادت یہاں کھینچ لایا تھا، اور وہ خلوص دل کے ساتھ راہِ خدا میں نکلے تھے، جس میں کسی لالچ، ریاکاری، جھوٹے فخر اور جاہلی حمیت کی آمیزش نہ تھی۔

اکوڑہ کی جنگ میں مجاہدین کی ایک مختصر جماعت کی کثیر و طاقتور دشمن پر کامیابی اور مجاہدین کی سرفروشی و جاں بازی کے واقعات کی صدائے بازگشت دُور دُور تک سنی گئی، اور اس کی وجہ سے بہت سے طالع آزما اور مہم جو نوجوانوں میں اس نوخیز طاقت میں شرکت کی خواہش پیدا ہونے لگی جس کا ستارۂ اقبال بلندی پر نظر آ رہا تھا چنانچہ

یہ لوگ فوج در فوج اس میں آ کر شامل ہونے لگے، ان کے سامنے نہ کوئی مقصد تھا، نہ دینی جذبہ، نہ کسی عہد و معاہدہ کا پاس، لوگوں کا ایک جمِ غفیر تھا جس کو موقع اور مصلحت نے یہاں اکٹھا کر دیا تھا، البتہ ان مجاہدین کا معاملہ اس سے بالکل مختلف تھا، جو ہندوستان سے سید صاحب کے رفیق تھے، اپنا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دے چکے تھے، اور آخری دم تک اطاعت و فرماں برداری پر آپ سے عہد کر چکے تھے، سید صاحب کو بھی ان کی دینی تربیت اور ان کی طرف پوری توجہ کرنے کا موقع ملا تھا، اور اسلامی کردار ان کے اندر راسخ ہو چکا تھا۔

وہ حکم کے بندے اور چشم و ابرو کے اشارے پر سر کٹانے والے تھے، حالی کے یہ اشعار ان کے بالکل مطابق حال تھے۔

شریعت کے قبضہ میں تھی باگ ان کی — بھڑکتی نہ تھی خود بخود آگ ان کی
جہاں کر دیا گرم گرما گئے وہ — جہاں کر دیا نرم نرما گئے وہ

اس طرح کی جماعت جہاں کہیں بھی ہو پورے اعتماد کی اہل ہے، اور بڑی سے بڑی ذمہ داری اس پر پورے اطمینان کے ساتھ ڈالی جا سکتی ہے اور قلت تعداد اور مادی ضعف کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

حضرو کے چھاپہ میں (جو سید صاحب کی اجازت سے مقامی لوگوں کی سرکردگی میں مارا گیا تھا) انتشار و لاقانونیت، مال غنیمت کی طمع اور جہاد کے بعض اسلامی احکام و آداب کی خلاف ورزی کی شکلیں سامنے آئیں اور ان کی وجہ سے سید صاحب اور آپ کے اہل الرائے رفقاء میں بڑی فکر و تشویش پیدا ہو گئی اور انھوں نے محسوس کیا کہ یہ بات ان مقاصد کے لئے جن کے لئے وہ ہجرت کر کے یہاں آئے ہیں، سم قاتل اللہ اور

اس کے رسولؐ کو ناراض کرنے والی اور وعدۂ نصرت کی تکمیل میں حائل ہونے والی ہے، اس کا انداد اور سد باب جلد ضروری ہے' اور اس کا آسان راستہ یہ ہے کہ یہ سب لوگ سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرلیں، آپ کو اپنا شرعی امیر اور امام المسلمین تسلیم کرلیں اور ہر حال میں آپ کی اطاعت اپنے اوپر لازم جانیں تاکہ ان کا یہ جہاد شرعی بن سکے اور اس کے احکام و آداب کی پوری رعایت اس میں موجود ہو۔

وہ اپنی دینی بصیرت، کتاب و سنت کے علم اور شریعت کے اصول و فروع سے گہری واقفیت کی بنا پر اچھی طرح جانتے تھے کہ ایک ایسے امیر کا انتخاب جو کتاب و سنت کی روشنی میں مسلمانوں کی رہنمائی کرے' احکام الٰہی کا نفاذ اور فصل خصومات کا کام انجام دے، اور جہاد کو از سرنو جاری کرے جو اسلام کا ایک ایسا رکن ہے، جس کو مسلمانوں نے ایک طویل عرصہ سے فراموش کر دیا ہے، اور اس کے نتیجہ میں ان کا شیرازہ منتشر ہوگیا ہے، اور ان کی حیثیت ایک ایسے ریوڑ کی ہوگئی ہے جس کا کوئی گلہ بان نہیں، ان کو معلوم تھا کہ حدیث و قرآن میں جہاد کی کتنی ترغیب آئی ہے، ان کے سامنے قرآن مجید کی یہ آیات تھیں۔

أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ۔ (سورۂ نساء ۵۹)	حکم مانو اللہ کا، اور حکم مانو رسول کا، اور جو اختیار والے ہیں تم میں۔

دوسری جگہ آتا ہے:۔

وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ۔ (سورۂ نساء ۸۳)	اور اگر اس کو پہنچاتے رسول تک اور اپنے اختیار والوں تک۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ان کے سامنے تھا۔

صلوا خمسکم، وصوموا شهرکم وادّوا زکوٰۃ اموالکم واطیعوا اذا امرکم تدخلوا جنّۃ ربّکم۔[1]

اپنے پانچ وقت کی نمازیں پڑھو، رمضان کے روزے رکھو، اپنے مال کی زکوٰۃ نکالو، اپنے امیر کی اطاعت کرو، اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے

مسلمانوں کے اتحاد و جمعیت کا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اتنا خیال تھا کہ آپ نے ان کے لئے ایک امیر کا ہونا ضروری قرار دیا، جو ان کے درمیان کتاب و سنت کی روشنی میں فیصلہ کرے، آسمانی شریعت کو نافذ کرے، ان کی دینی و دنیاوی ضرورتوں کی خبر گیری رکھے، یہاں تک کہ ان کی زندگی کا کوئی لمحہ بغیر کسی امیر کے نہ گزرے، حدیث شریف میں آیا ہے:۔

من استطاع منکم ان لا ینام نومًا ولا یصبح صبحًا الا وعلیہ إمام فلیفعل۔[2]

اگر تم میں سے کوئی ایسا اہتمام کر سکے کہ نہ سوئے اور نہ صبح کرے مگر اس حالت میں کہ اس پر کوئی امام ہو تو اس کو چاہیئے کہ ایسا کرے۔

دوسری حدیث میں آیا ہے:۔

اذا کان ثلٰثۃ فی سفر فلیؤمّروا أحدھم۔[3]

اگر کسی سفر میں تین آدمی بھی ہوں تو ایک کو امیر بنا لینا چاہیئے۔

آپ نے ان کو ایسی زندگی سے ڈرایا ہے جس میں مسلمان شتر بے مہار کی طرح زندگی گزارے، جو چاہے کرے، جس سے چاہے جنگ کرے، اس کا کوئی قائد اور امیر نہ ہو وہ کسی امر و نہی کا پابند نہ ہو، آپ نے ایسی زندگی کو جاہلیت سے تعبیر کیا ہے جس میں لوگ مویشیوں اور جانوروں کی طرح جہاں چاہتے ہیں منہ مار دیتے ہیں، اور محض عصبیت اور

---

[1] ترمذی۔ [2] ابن عساکر۔ [3] ابوداؤد۔

بیجا حمیت کی بنا پر ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں۔

ارشاد ہے:۔

من خرج من الطاعة وفارق الجماعة فمات مات ميتة جاهلية، ومن قاتل تحت راية عمية يغضب لعصبية او يدعوا لعصبية أو ينصر عصبية فقتل فقتلة جاهلية۔[1]	جو دائرہ اطاعت سے نکلا اور جماعت کو چھوڑا اس کے بعد مر گیا تو جاہلیت کی موت مرا اور جو کسی اندھے جھنڈے کے نیچے لڑا کسی عصبیت کے لئے غصہ میں آیا، عصبیت کی دعوت دی یا عصبیت کی حمائت کی اس کے بعد مارا گیا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔

دوسری حدیث میں آیا ہے:۔

الغزو غزوان فامامن ابتغى وجه الله واطاع الامام وانفق الكريمة وياسر الشريك واجتنب الفساد فان نومه ونبهه أجركله، واما من غزا فخرا ورياء او سمعة وعصى الإمام وافسد فى الارض فانه لم يرجع بالكفاف۔[2]	لڑائی دو قسم کی ہے جس نے صرف اللہ کی خوشنودی مد نظر رکھی، امام کی اطاعت کی، اپنا قیمتی و محبوب مال خرچ کیا اپنے ساتھی کی مدد کی، فساد سے دامن بچایا، تو اس کا سونا جاگنا سب اجر و ثواب ہے، اور جو فخر کے لئے یا ریا دکھاوے اور شہرت کے لئے لڑا، امام کی مخالفت کی، زمین میں فساد پھیلایا تو اس کو واجبی حصہ بھی نہ ملے گا۔

اس کے علاوہ اور بہت سی آیتیں اور حدیثیں اس باب میں آئی ہیں، جن سے

---

[1] مسلم [2] احمد و نسائی۔

امام کے تقرر اور اس کی اطاعت میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔

اس جماعت کی سب سے بڑی خصوصیت اور امتیاز یہی تھا کہ اس نے اسلام کے اس رکن عظیم کو جس کو مسلمانوں نے ایک طویل زمانہ سے فراموش کر رکھا تھا از سر نو زندہ کیا۔

جمعرات ۱۲ جمادی الثانیہ ۱۲۴۲ھ کا دن ہندوستان میں اصلاح و تجدید دین کی تاریخ کا وہ اہم دن تھا، جب عام مسلمانوں، علماء و مشائخ، خوانین و رؤساء و قبائل نے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت امامت کی اور احکام شرعیہ میں آپ کی کلی اطاعت اور صلح و قتال ہر حال میں آپ کی فرماں برداری کا عہد کیا اور آپ کو باضابطہ طریقہ پر امیر و امام المسلمین تسلیم کیا، دوسرے روز (۱۳ جمادی الآخرہ) آپ کے نام کے ساتھ جمعہ کا خطبہ پڑھا گیا۔

بیعت کے بعد آپ نے اعلان فرمایا کہ تمام لوگوں کو اب احکام شرعیہ میں مکمل اطاعت کرنا ہے، جاہلی عادات و اطوار اور قبائل میں جو غیر اسلامی رسوم و عادات بغیر کسی سند کے رائج ہو گئی ہیں، ان سب کو ترک کرنا ہے، خواہ اس سلسلہ میں مالی نقصانات برداشت کرنے پڑیں اور ان فوائد سے دست بردار ہونا پڑے جو قبیلہ کی سرداری اور امارت و ریاست سے ان کو اب تک حاصل تھے، خواہ یہ بات نفس پر کتنی شاق اور مریدین و معتقدین کے لئے از حد ناگوار اور ناقابل قبول ہو، اسی طرح اپنے اوپر اپنے اہل و عیال پر خاندانی معاملات اور دیوانی و فوجداری کے تمام قضیوں میں شریعت کا حکم نافذ کرنا ہے، بیعت کرنے والوں نے ان تمام باتوں کا عہد کیا اور اطاعت کی قسم کھائی۔

دیکھتے دیکھتے یہ خبر پورے علاقہ میں پھیل گئی، اور وہاں کے سربرآوردہ حضرات، رؤساء و امراء اور چھوٹے بڑے سب نے وہاں آکر آپ کے ہاتھ پر بیعت کی، اس مضمون کے

خطوط پشاور، بھاولپور، اور چترال کے امرار و نوابین کو بھیجے گئے اور انھوں نے مناسب طریقہ پر اس کا جواب دیا اور اس مبارک اقدام کی تعریف کی۔

سید صاحب نے خصوصی طور پر کچھ خطوط ہندوستان کے علمار، اعیان، اور امرار کو بھی ارسال کئے، مسلمانوں نے اپنے اخلاص، دینی غیرت اور فہم و بصیرت کے مطابق مسلمانوں کی زندگی اور ملک کے مستقبل پر اس کے اہم اور دوررس اثرات کو بالعموم محسوس کیا، اور بہت خوشی کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور خوش آمدید کہا۔

بہترین موقع جو ضائع کر دیا گیا

سید صاحب کی بیعت کا شہرہ دُور دُور تک پھیل گیا اور لوگ پروانوں کی طرح آپ کے گرد جمع ہو گئے، اور بیعت میں داخل ہونے لگے امرار پشاور نے (جو قدیم زمانہ سے "سود و زیاں" کی زبان کے سوا اور کوئی زباں نہیں سمجھتے تھے، اور ہر چیز کو نفع و نقصان کے موازنہ اور عملی فائدہ سے جانچنے کے عادی تھے اور جس کا ستارۂ اقبال بلند ہوتا تھا، اسی کا ساتھ دیتے تھے) جب یہ منظر دیکھا تو محسوس کیا کہ اس ابھرتی ہوئی طاقت سے کنارہ کش رہ کر اپنے خول میں زندگی گزارنا ان کے لئے مفید نہ ہو گا، دوسری طرف ان کے لئے اپنی ریاست، جاہ و منصب، خاندانی روایات اور قبائلی عادت سے بے تعلق ہونا بھی بہت شاق تھا، ان قبائلی روایات میں شریعت اور علمار شریعت کا کوئی عمل دخل نہ تھا، اور اس میں دین و سیاست کی جاہلی اور مسیحی یورپ کا اصول چلتا تھا کہ "جو خدا کا ہے، وہ خدا کو دو، اور جو قیصر کا ہے، وہ قیصر کو دو" دین ان کے نزدیک صرف عبادات اور بعض فقہی مسائل تک محدود تھا جس کی تشریح اور تلقین ان مولویوں کی ذمہ داری تھی، جو مساجد کے امام یا عربی مدرسوں میں معلّم تھے، ان مسائل کے سوا اور جتنے مالی، انتظامی، سیاسی اور شہری معاملات تھے نیز وہ تمام مسائل جو حکمرانی کے اختیارات سے متعلق تھے،

وہ سب ان امرار اور رؤسار کے دائرۂ اختیار میں تھے، جو باپ دادا سے اس کے وارث چلے آتے تھے، اور جنھوں نے یہ اقتدار نوکِ شمشیر اور زور بازو سے حاصل کیا تھا' یہ لوگ بڑی کشمکش کے ساتھ سید صاحب کے پاس حاضر ہوئے' ایک طرف ذاتی منافع شخصی مصالح، جاہلی عادات اور قبائلی روایات تھیں' دوسری طرف یہ نئی قوت تھی' جس کے اندر دینی اور سیاسی دونوں رنگ موجود تھے اور جس کی طاقت وشہرت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا، اور عام طور پر لوگ اس کی طرف مائل تھے، انھوں نے دیکھا کہ اگر انھوں نے اس موقع پر عجلت اور پیش قدمی سے کام نہ لیا تو زندگی کے قافلہ سے بچھڑ جائیں گے اور ان کو بہت پیچھے کی صف میں جگہ ملے گی، تیسری طرف یہ فکر ان کو دامنگیر تھی کہ اس سے ان کے اور رنجیت سنگھ کے تعلقات بھی کشیدہ ہونے کا امکان ہے، جس کی حمایت اور اعتماد ان کو حاصل تھا۔

بالآخر انھوں نے سید صاحب کی رفاقت کو ترجیح دی' سید صاحب کے پاس امرار سمہ[1] کے خطوط تائید و نصرت کے آچکے تھے، یہ ایک آزاد علاقہ تھا، اور ان لوگوں کے سیاسی اقتدار کی زد سے دُور تھا، انھوں نے محسوس کیا کہ شاید اس راستہ سے ان کو ان سرسبز و زرخیز علاقہ میں بھی دست درازی اور توسیع اقتدار کا موقع مل سکے گا، سید صاحب سے آئندہ ملاقات اور ملاطفت و نیازمندی میں ان کے اندر یہ جذبہ بھی کارفرما تھا، بہر حال ان سب باتوں کو پیش نظر رکھ کر سردار یار محمد خاں، سردار سلطان محمد خاں اور پیر محمد خاں تینوں بھائی اپنے لشکر اور توپوں کے ساتھ موضع سرمائی میں جو نوشہرہ سے

[1] سمہ' پشاور اور مردان کے درمیان واقع ہے، اس علاقہ میں یوسف زئی قبیلہ آباد تھا، یہاں سید صاحب نے قیام فرمایا اور آپ کے حامیوں کی بڑی تعداد وہاں پیدا ہو گئی۔

پانچ میل کے فاصلہ پر ہے آکر مقیم ہوئے، جب سید صاحب کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ وہاں تشریف لے گئے اور ان سب سے بیعتِ امامت لی۔

اس کے بعد مجاہدین اس علاقہ کے گوشہ گوشہ سے جمع ہونے شروع ہوئے یہانتک کہ ان کی تعداد اسّی ہزار تک پہونچ گئی اور اسلامی لشکر شیدو[1] روانہ ہوا وہاں پہونچ کر امرار پشاور کا لشکر بھی جس کی نفری بیس[2] ہزار تھی، اس میں شامل ہوگیا، اور اس کی تعداد ایک لاکھ تک پہونچ گئی، بہت دن کے بعد ایک پرچم کے نیچے اسلام کا اتنا بڑا لشکر جمع ہوا تھا، اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا، افغانیوں کو توفیق حاصل ہوتی، وہ اسلام اور مسلمانوں کے واقعی مخلص ہوتے امراء میں انانیت نہ ہوتی اور وہ وقت کی اہمیت و نزاکت کو محسوس کرتے تو ایک فیصلہ کن معرکہ زیادہ دور نہ تھا، جو ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا رخ یکسر تبدیل کر دیتا، اس لئے کہ مخلصین و مجاہدین کی یہ جماعت (جو بہت عرصہ کے بعد سر بکف میدان میں آئی تھی) اسلام اور مسلمانوں کے حق میں پوری طرح وفادار اور انانیت اور نفس پرستی سے آزاد تھی، اس کو ایک ایسے قائد و رہنما کی سرپرستی حاصل تھی، جس کی فہم دین بہت دقیق و نکتہ رس اور غلبۂ اسلام کی ہمت بہت قوی اور عالی تھی، اور اس میں امامت و قیادت کی تمام ضروری صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود تھیں، اور اس کا معاملہ خدا سے اور اس کے بندوں سے بالکل صاف اور ہر طرح کی آمیزش و آلائش سے پاک تھا، مزید یہ کہ دردمند دل، نکتہ رس دماغ، خود دار طبیعت اور جسمانی قوت اور زور بازو، سب اس جماعت کو حاصل تھے، اور تمام طبقے اس میں شامل تھے، دوسری طرف مسلمانوں کی ذلت اپنی انتہا کو پہونچ چکی تھی، اور اسی وجہ سے سب کی نگاہیں، اس جماعت پر

---

[1] شیدو اکوڑہ سے چار میل کے فاصلہ پر شرق کی سمت میں ہے۔

مرکوز ہو کر رہ گئی تھیں، اللہ کے مخلص و مقبول بندے اور پورے ہندوستان کے منتخب و برگزیدہ مشائخ و علماء اللہ تعالےٰ کے سامنے اس کی کامیابی و فتح مندی کے لئے دعاگو تھے، مورخ نے اپنا قلم روک لیا تھا کہ اس کو ہماری قدیم تاریخ کا ایک نیا باب تحریر کرنا ہے، وہ قدیم تاریخ جس نے ناکامی کی تلخیوں، انتشار و تفرقہ آرائی، قیمتی مواقع کے ضیاع، احسان فراموشی اور محسن کشی، امراء و ارباب حکومت کی غدّاری، وزراء کی خیانت اور دوستوں کی طوطا چشمی اور بے وفائی کے حیرت انگیز مناظر بارہا دیکھے ہیں۔

کیا آج یہ تاریخ ایک نئے اور روشن ورق اور فتح و اقبال کے ایک نئے عنوان کو تحریر کرنے کی اجازت دے سکے گی!

لیکن افسوس کہ اس تاریخ نے نیا ورق الٹنے کے بجائے حق و باطل کے اس نئے معرکہ میں بھی حسب دستور اپنے پرانے اوراق کی ورق گردانی کی، چنانچہ امیر جماعتِ مجاہدین کے کھانے میں زہر ملا دیا گیا، جس نے آپ کے جسم و اعصاب پر پورا اثر ڈالا اور آپ پر غشی کے دورے پڑنے لگے، اس وقت میدان کارزار گرم تھا، اور فریقین نبرد آزمائی میں مشغول تھے، سید صاحب کبھی غشی اور غفلت کی حالت میں ہوتے تھے کبھی ہوش میں، کہ یار محمد خاں کا یہ پیغام (جس کے پیچھے خلوص نہ تھا) پہونچا کہ آپ جنگ میں شریک ہوں، اس نے سواری کے لئے ایک ہاتھی بھی بھیجا جس کے پیر میں لنگ تھا، مقصد یہ تھا کہ سید صاحب سکھوں کی قید میں آجائیں اور میدان ان کے لئے صاف ہو جائے، سید صاحب اسی حالت میں ہاتھی پر سوار ہوئے اور معرکہ میں شریک ہو گئے اس درمیان میں جنگ نے بہت شدت اختیار کر لی اور فتح کی علامات بھی ظاہر ہونے لگیں اور بعض لوگوں نے اس ہوش اور بیہوشی کی کیفیت میں سید صاحب کو فتح کی بشارت بھی دے دی۔

اس جنگ میں امرا پشاور اور ان کے لشکر نے بہت سرد مہری کا مظاہرہ کیا، اسی دوران سکھوں کی طرف سے ایک گولہ یار محمد خاں کے پاس آکر گرا اس نے اسی وقت اپنے گھوڑے کی باگ موڑی اور میدان جنگ سے فرار اختیار کیا اور اس کے ساتھ اس کا لشکر بھی واپس گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ کا سارا بوجھ مجاہدین پر پڑ گیا اور وہ نہایت دلیری اور جوانمردی کے ساتھ دشمن کے مقابلہ پر ڈٹے رہے۔

سید صاحب کی علالت نے طول کھینچا لیکن اللہ تعالےٰ کو مسلمانوں کے ساتھ خیر منظور تھی، اور سید صاحب کو ابھی کچھ دن اور اسلام اور مسلمانوں کی خدمت اور رہنمائی کرنی تھی، آپ کو بار بار قے آتی اور ہر قے کے ساتھ زہر کی کچھ مقدار خارج ہو جاتی، لشکر کے اہل الرائے حضرات نے اس وقت یہ مناسب جانا کہ لشکر مجاہدین کسی محفوظ اور مضبوط جگہ پر قلعہ بند ہو جائے، اور جب پراگندگی اور عمومی انتشار ختم ہو اور سید صاحب کی صحت بحال ہو جائے تو اس وقت دوبارہ حملہ کیا جائے، دوسری طرف سکھوں نے امرا پشاور سے ساز باز کر کے سید صاحب کو گرفتار کرنے کی سازش کی تھی، لیکن مخلص اور ہوشمند فیلبان نے اس بات کو تاڑ لیا اور سید صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ اس جگہ سے فی الحال ہٹ جائیں، چنانچہ کچھ مجاہدین آپ کو لے کر قریب کی ایک پہاڑی کے دامن میں مقیم ہو گئے، عام مجاہدین جن میں بڑی تعداد زخمیوں کی تھی، قریب کے دیہاتوں میں چلے گئے جہاں ان کو مرہم پٹی اور سانس لینے کا موقع مل گیا وہاں کے مسلمانوں نے کمال گرمجوشی اور خندہ پیشانی کے ساتھ ان کو خوش آمدید کہا اور ان کی ضیافت و خاطر داری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، اس کے بعد سید صاحب بھی وہاں تشریف لے گئے اور آپ کے دیدار سے ان لوگوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں سب آپ کی صحت و سلامتی پر خدا کا شکر بجا لائے۔

جب سب لوگ ایک جگہ جمع ہوئے تو سید صاحب نے ان سے فرمایا کہ "یہ جو کچھ حال ہم پر اور سب بھائیوں پر گزرا کچھ جناب الٰہی میں ہم لوگوں سے خطا اور بے ادبی ہوئی ہے، اسی کا یہ بدلہ ہے، اور یہ بھی ایک امتحان الٰہی تھا، وہ سبحانہ و تعالےٰ ایسی ایسی آزمائشوں پر ہم لوگوں کو اور ہمارے مجاہدین کو ثابت قدم رکھے، اور ہماری تکلیف کو راحت سے بدل دے اور ان لوگوں کا زہر دینا بھی حکمت الٰہی سے خالی نہیں، یہ بھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت ہم سے ادا ہوئی" پھر آپ نے ننگے سر ہو کر جناب باری میں الحاح وزاری کے ساتھ دعا کی کہ "الٰہی ہم سب ترے بندے ذلیل و خاکسار، عاجز و ناچار ہیں اور تیرے سوا ہمارا کوئی حامی و مددگار نہیں، محض تیرے ہی فضل و کرم کے امیدوار ہیں، ہم تیری آزمائش و امتحان کے قابل نہیں، ہماری خطاؤں کو نہ پکڑ، اپنی رحمت سے معاف کر، اور ہم کو اپنی راہ مستقیم پر ثابت قدم رکھ اور جو لوگ تیری اس راہ کے مخالف ہیں، ان کو ہدایت کر" اسی طرح کے الفاظ بار بار کہے، لوگ آمین آمین کہتے تھے، دعا کے بعد آپ نے سب کو تسلی اور دلاسہ دیا کہ بھائیو، مت گھبراؤ، اللہ تعالےٰ تم پر اپنا فضل و کرم کرے گا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سب یار محمد خاں کی سازش تھی، جو اس نے رنجیت سنگھ کی خوشنودی کے لئے تیار کی[1]

یہ "مسرت انگیز خبر" دربار لاہور میں بڑی مسرت کے ساتھ سنی گئی، حکومت لاہور

---

[1] اس عہد کے ایک ہندو مورخ لالہ سوہن لال نے اپنی کتاب "عمدۃ التواریخ" میں لکھا ہے کہ اس پورے علاقہ میں یہ بات مشہور عام ہے کہ یار محمد خاں نے سید صاحب کے کھانے میں زہر ملا دیا تھا اور اسکے بعد اپنے لشکر سمیت وہاں سے فرار اختیار کیا تھا اس لئے کہ انکے اور رنجیت سنگھ کے درمیان گہرے دوستانہ روابط تھے

اس پوری مدت میں فکر و تشویش میں رہی کہ اس فیصلہ کن معرکہ کا (جو ملک کی پوری تاریخ کا رخ تبدیل کر دینے کے لئے کافی تھا) نتیجہ کیا نکلنے والا ہے، جب حکام لاہور نے یہ مژدہ سنا کہ پشاور کے مخلص دوستوں نے ان کو جنگ کی زحمت سے بچا لیا اور ایک بڑی قوت اور لشکر جرار سے مقابلہ کی ضرورت باقی نہ رہی جو ایک عرصہ سے ان سے نبرد آزمائی کے لئے تیار تھا تو حکومت کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی چنانچہ باقاعدہ اس کی تقریب منائی گئی، گولے داغے گئے، دکانوں پر سجاوٹ کی گئی، مہاراجہ نے جشن عام کا اعلان کر دیا، اور اظہار مسرت کے طور پر زر کثیر غریبوں میں تقسیم کیا گیا۔[1]

لیکن ان باتوں کے باوجود سید صاحب کے عزم و ارادہ میں کوئی کمزوری پیدا نہیں ہوئی، آپ نے نئے ذوق و شوق اور جوش و جذبہ کے ساتھ جہاد کی دعوت دینی شروع کی، بنیر اور سوات کے علاقوں میں (جو جغرافیائی لحاظ سے بہت اہمیت رکھتے تھے، اور وہاں بہت جنگجو افغانی قبائل آباد تھے) طویل تبلیغی و اصلاحی دورے کئے گاؤں اور دیہاتوں میں کئی روز بلکہ کئی کئی ہفتے قیام فرمایا اور وہاں کے علماء و مشائخ سے مل کر ان کے اندر ایمان کی دبی ہوئی چنگاری بھڑکانے اور دینی حمیت، دینی جذبات، اور صحیح شعور پیدا کرنے کی کوشش کی۔

اسی زمانہ میں ہندوستان سے مجاہدین کی بڑی بڑی جماعتیں آپ سے آکر ملیں، جن میں بعض بڑے بڑے علماء، آزمودہ کار اور پرجوش سپاہی، اور پرجوش حوصلہ مند نوجوان شامل تھے، اسی زمانہ میں آپ نے والی چترال کے پاس بہت سے تحفوں کے ساتھ ایک وفد بھیجا اور ان کو جہاد میں شرکت اور مجاہدین کی نصرت کی دعوت دی۔

---

[1] ظفر نامہ از دیوان امرناتھ ص ۱۸۱ ۔

اس سفر میں جو لوگ آپ کے ساتھ آکر شامل ہوئے اُن میں مولانا عبدالحی اور شیخ قلندر بھی تھے جن کے ساتھ اسّی مجاہدین کا قافلہ تھا، شیخ رمضان سہارنپوری کے ساتھ سو آدمی تھے، شیخ احمداللہ میرٹھی کے ساتھ ستّر کے قریب اور شیخ مقیم رامپوری کے ساتھ چالیس کے قریب تربیت یافتہ مسلح جوان تھے، جو امور جنگ اور فنون سپہ گری سے بخوبی واقف تھے، اس مبارک دورہ میں ہزاروں آدمیوں نے آپ کے ہاتھ پر توبہ اور جہاد کی بیعت کی، بکثرت لوگوں کی اصلاح ہوئی، بچھڑے ہوئے بھائیوں اور اہل خاندان گلے ملے اور شیر و شکر ہو گئے۔

تین ماہ کے اس دورہ کے بعد جس میں بہت سے نئے آدمی آپ کے شریک کار بنے اور بڑی بڑی جماعتیں داخل بیعت ہوئیں، آپ پنجتار واپس آگئے جو سوات کی سرحد پر واقع ہے، اور اس کے تین طرف پہاڑ ہیں، اور اس وجہ سے اس نے مضبوط قلعہ کی شکل اختیار کر لی ہے، سردار فتح خاں جو خدو خیل قبیلہ کے سردار تھے، آپ سے بیعت تھے، انھوں نے آپ کو یہاں قیام کرنے اور اس کو مجاہدین کی مستقل چھاؤنی اور مرکز بنانے کی دعوت دی، سید صاحب نے ان کی درخواست قبول کی اور سوات اور بنیر سے واپسی کے بعد اسی کو اپنا مستقر بنایا۔

اسلامی لشکر کے شب و روز

پنجتار میں مجاہدین کو ایک طویل عرصہ کے بعد استقرار نصیب ہوا، ان کو مسلسل نقل و حرکت اور طویل رہ نوردی کے بعد کچھ سانس لینے کا موقع ملا اور امن و سکون کی لذت سے وہ آشنا ہوئے اور اس موقع پر ان کا اسلامی اخلاق و کردار جس کی تربیت سخت سے سخت وقت میں کی جا چکی تھی، پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوا، اور ان پہاڑوں سے گھرے ہوئے گوشہ میں اپنی پوری رعنائی کے ساتھ سامنے آیا، یہ وہ زندگی تھی جس میں جہاد فی سبیل اللہ کے ساتھ عبادت و مجاہدہ، اور زہد و جفاکشی کے ساتھ اخوت و مساوات خدمت و غمخواری، اور ایثار و ہمدردی جمع تھی، وہ اپنے دشمنوں کے لئے سخت گیر تھے، اور دوستوں اور بھائیوں کے لئے نرم خو، رات کے عبادت گزار، دن کے شہسوار، نرم دلی و تواضع کے ساتھ خودداری و خودنگری کا ایسا اجتماع اور اسلامی معاشرہ کی ایسی زندہ اور متحرک تصویر تاریخ نے طویل زمانہ کے بعد دیکھی تھی۔

یہ زندگی ان دو قدیم اسلامی بنیادوں پر قائم تھی، جن پر مدینۃ الرسول (صلے اللہ علیہ وسلم) کا اسلامی معاشرہ قائم کیا گیا تھا، اور جن کا اسلامی تاریخ اور انسانیت کی چارہ سازی اور رہنمائی میں بڑا حصہ ہے، ان میں پہلی چیز ہجرت تھی، دوسری چیز نصرت،

مسلمان دو حصوں میں منقسم تھے، ایک وہ مہاجرین تھے جنھوں نے ہندوستان سے اللہ کی راہ میں ہجرت کی، دوسرے انصار جو قدیم باشندے تھے، اور جن کے بہت گہرے روابط مہاجرین سے قائم کیے گئے تھے، اسلامی اخوت کا قدیم و عمیق رشتہ اس کے علاوہ تھا، مہاجرین کی کل تعداد ایک ہزار تھی جس میں تین سو سید صاحب کے ساتھ پنجتار میں رہے، اور سات سو قریب کے مواضعات اور دیہاتوں میں پھیل گئے جو بہت قریب تھے، اور اس طرح ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے جس طرح ایک شہر کے مختلف محلے، غلہ اور ضروریات کا دوسرا سامان مثلاً کپڑے وغیرہ ان سب کو بیت المال سے تقسیم کیا جاتا تھا جو سید صاحب نے شرعی اصولوں پر قائم کیا تھا۔

اس اسلامی نو آبادی میں زندگی کا نظام کھانے پینے میں کفایت اور اعتدال پر قائم تھا، یہاں کھانے پینے اور راحت و آرام کا زیادہ انتظام نہ تھا، جو مہاجرین کے یہاں آئے تھے ان کے گھروں میں راحت و آرام کا پورا سامان موجود تھا، لیکن یہ محض خدا کی خوشنودی کے لئے اس کو چھوڑ کر یہاں آئے تھے،[۱] ان کے سامنے اللہ تعالےٰ کا یہ فرمان تھا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَئُوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (سورہ توبہ ۱۲۰)

(اور) یہ (ساتھ جانے کا ضروری ہونا) اس سبب سے ہے کہ ان کو اللہ کی راہ میں جو پیاس لگی اور جو ماندگی پہنچی اور جو بھوک لگی اور جو چلنا چلے جو کفار کے لئے موجب غیظ ہوا ہو اور دشمنوں کی جو کچھ خبر لی ان سب پر انکے نام ایک ایک نیک کام لکھا گیا یقیناً اللہ تعالےٰ مخلصین کا اجر ضائع نہیں کرتے

---

[۱] یہ معلومات مولانا عبدالحیؒ کے ایک خط سے ماخوذ ہیں، جو انھوں نے سرحد سے اپنے بعض دوستوں کو لکھا تھا

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ان کے سامنے تھا کہ "ابن آدم نے اپنے شکم سے زیادہ کسی بڑے برتن کو کبھی نہیں بھرا ابن آدم کو کمر سیدھی رکھنے کے لئے چند لقمے کافی ہیں، لیکن اگر اس سے کوئی چارہ نہ ہو تو ایک تہائی کھانے کے لئے رکھے، ایک تہائی پینے کے لئے ایک تہائی سانس لینے کے لئے"[1]

اس زندگی میں ان کے قائد اور امام بھی ان کے ساتھ شریک تھے، جب وہ بھوکے ہوتے تو سید صاحب بھی بھوکے رہتے، وہ کھاتے تو آپ بھی کھاتے، مقامی لوگ جنھوں نے ان کو اپنے یہاں جگہ دی تھی اور ٹھیرایا تھا جاگیر داروں اور نوابین و امراء میں نہ تھے، بلکہ ان میں سے اکثر معمولی کاشتکار تھے، اور متوسط درجہ کی معیشت رکھتے تھے، اور اپنی استطاعت کے موافق مہاجرین کی خبر گیری اور ہمدردی و غمخواری میں کوئی کمی نہ کرتے تھے۔

مہاجرین کی زندگی بہت سادہ اور فطری انداز کی تھی اس میں کوئی تکلف اور تصنع نہ تھا، کبر و نخوت اور جاہلی عادات و رسوم جو مسلمانوں کے اندر ان کے عہد اقتدار میں مصنوعی تمدن کی وجہ سے داخل ہو گئی تھیں، مثلاً جاہلی نخوت، اور پیشوں اور برادریوں پر طنز و تفریق اور ان کی وجہ سے کسی کو ذلیل سمجھنا، غریبوں کے کاموں سے گھن کرنا، اب اس کے برخلاف ہر شخص ایک دوسرے کی خدمت میں چاق چوبند اور ایک دوسرے کی ضرورت پوری کرنے کا شائق تھا، ضرورت پر وہ ایک دوسرے کی حجامت بنا لیتے کپڑے دھوتے چکی پیستے، کھانا پکاتے، لکڑیاں کاٹتے، جانوروں کا چارہ تیار کرتے گھوڑوں کی مالش کرتے، مریضوں کی تیمارداری کرتے، جھاڑو دیتے اور کوڑا اٹھاتے کسی بھائی کی سلائی جوڑائی یا جوتے کی ٹکائی کا کام ہوتا تو وہ للہ فی اللہ بلا اجرت انجام دیتے، سب مل کر

---

[1] ترمذی

زمین پر سوتے، ہر قسم کی مشقت برداشت کرتے، نامناسب الفاظ اور درست و نازیبا باتوں سے پرہیز کرتے، غیبت، چغل خوری، بغض و حسد، زبان درازی سے بچتے، ان کے دل ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے، اور راہ خدا میں محبت و رفاقت ان کی پہچان اور علامت بن گئی تھی، ان میں ایسے لوگ بھی تھے، جو ناز و نعم کے پروردہ اور اپنے گھر میں عیش و آرام کے دلدادہ تھے، خدم و حشم ان کے آگے پیچھے رہتے تھے، ان کو والدین کی ناز برداری اور شفقت اور مریدین و اہل تعلق کی محبت و عقیدت حاصل تھی، لیکن یہاں وہ اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ تنگی و فراخی اور خدمت و مشقت ہر چیز میں برابر کے حصہ دار اور شریک کار تھے۔

ان کے بعد ہندوستان سے جو قافلے اور وفود آئے وہ اس طرز زندگی سے پوری طرح مانوس نہ تھے، اور ان کے اندر اس اعلیٰ کردار اور اسلامی اخلاق کا پرتو پوری طرح پیدا نہ ہوا تھا، اور کسی امیر اور مربی کی صحبت و تربیت ان کو حاصل نہ تھی، چنانچہ ان میں بعض لوگوں کو اس طرح کے کاموں سے کچھ عار محسوس ہوا اور انھوں نے کہا کہ یہ نیچے لوگوں اور شاگرد پیشہ طبقہ کے کام ہیں، اشراف اور اونچے خاندانوں اور گھرانوں کے لئے یہ باتیں کسی طرح مناسب نہیں، سید صاحب کو بھی اس بات کا اندازہ ہو گیا، آپ کا طریقہ یہ تھا کہ اگر کچھ بات کہنی ہوتی یا کسی کو نصیحت اور تنبیہ کرنی ہوتی تو آپ اس شخص کو اپنا مخاطب نہ بناتے تاکہ اس کو شرمندگی نہ ہو، بلکہ عمومی انداز میں بات کہتے، اور مثالوں اور حکایتوں کے پیرایہ میں اس کو سمجھاتے، چنانچہ آپ نے ایک موقع پر ایک مثال دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:-

"ایک عورت کا خاوند مر گیا اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، اس کا خاوند کچھ مال و دولت چھوڑ کر نہیں مرا وہ بیچاری چرخہ کاتتی ہے، پسائی کرتی ہے، سلائی کرتی ہے، اور ہر طرح کی

محنت مزدوری جو بن پڑتی ہے کرتی ہے، اور بچوں کو پالتی ہے، صرف اس امید پر کہ یہ پرورش پاکر جوان ہوں گے نوکری چاکری کریں گے بڑھاپے میں مجھے روٹی دیں گے خدمت کریں گے۔

میرا بڑھاپا آرام سے بسر ہوگا، اس کی یہ امید موہوم ہے، یقینی نہیں، اگر وہ لڑکے زندہ رہے، اور صالح اور لائق ہوئے اپنی ماں کا حق پہچانا تو اُس کی آرزو پوری ہوئی، اگر وہ نالائق اور نکمے نکلے تو وہ بھیک کرمری، یہاں جو ہمارے بھائی محض خدا کے واسطے خاص نیت سے چکی پیستے ہیں، کھانا پکاتے ہیں، لکڑی چیرتے ہیں، گھاس چھیلتے ہیں، گھوڑا ملتے ہیں، کپڑے سیتے ہیں، اپنے ہاتھ سے کپڑے دھوتے ہیں، اور اسی طور کے سب کام کرتے ہیں، یہ تمام داخل عبادت ہیں، اور حضرت پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام سے ثابت ہیں، سب اولیاء اللہ آج تک ایسے ہی کام کرتے آئے ہیں، جتنے کام شرع کے موافق ہیں، کسی کے کرنے میں عار نہیں، ان سب کاموں کا اجر اللہ اور اُس کے رسولؐ کے ارشاد کے مطابق اللہ تعالےٰ کے یہاں ملنا یقینی ہے، سب بھائیوں کو چاہیئے کہ ان کاموں کو فخر و عزت اور سعادت دارین سمجھ کر بلا عار و انکار کیا کریں، اور یہ ہمارے صاحب ایمان مسلمان بھائی اپنے گھربار، خویش و تبار، ناموس و نام عیش و آرام، ترک کرکے محض اللہ رسولؐ کی خوشنودی کے لئے آئے، ہمارے لئے گوہر نایاب اور لعل بے بہا کے ٹکڑے ہیں کہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں میں سے چھٹ کر آئے ہیں ان کی قدر و منزلت ہم جانتے ہیں ہر ایک نہیں پہچان سکتا''۔

اس طرح کے موثر و عمومی خطاب اور بلیغ و حکیمانہ پیرایۂ بیان کا اثر یہ پڑتا تھا کہ سننے والوں کے دل خود بخود نرم پڑ جاتے، ان کی گرہ کھل جاتی اور یہ ایمانی فضا سب کو اپنے رنگ میں رنگ لیتی اور وہ محسوس کرتے کہ اس اخلاق و کردار پر عمل اور اس میں اپنے رفتار

کی ہمرکابی ان کے لئے آسان ہے۔

سید صاحب ان تمام کاموں میں اپنے رفقاء کا ہاتھ بٹاتے تھے، ایک مرتبہ آپ نے دیکھا کہ شیخ الٰہی بخش رامپوری چکی پیس رہے ہیں، آپ بھی ان کے ساتھ بیٹھ کر ان کا ہاتھ بٹانے لگے اور فرمایا کہ میں مکہ مکرمہ میں چکی پیسا کرتا تھا، چاہتا ہوں کہ یہاں بھی اس کی مشق جاری رہے، یہ خبر گرم ہوئی تو بہت سے لوگ جمع ہو گئے اور جس کو اس کام سے عار آتا تھا وہ اس کو فخر و عزت کی بات سمجھنے لگا جب کبھی ایندھن کا ذخیرہ ختم ہو جاتا تو آپ کلہاڑیاں منگواتے اور جنگل کی طرف چلتے آپ کو دیکھ کر دوسرے لوگ کلہاڑیاں اٹھا لیتے اور ساتھ ہو لیتے، یہ خبر پورے لشکر میں پھیل جاتی اور جس کو کلہاڑی ملتی وہ اپنے امیر کی اقتدا میں اس کام میں لگ جاتا اور دیکھتے دیکھتے لکڑی کا ایک بڑا ذخیرہ تیار ہو جاتا۔

ایک بار لوگوں نے شکایت کی کہ نماز میں کنکریاں بہت چبھتی ہیں، آپ نے حکم دیا کہ درانتیاں جمع کی جائیں اور فرمایا کہ کل جنگل چلیں گے اور گھاس کاٹ کر یہاں بچھا دیں گے چنانچہ دوسرے روز یہی ہوا اور گھاس کا فرش تیار کر دیا گیا، ایک بار بعض لوگوں نے شکایت کی کہ خیموں میں دھوپ سے پورا بچاؤ نہیں ہے جس سے بڑی تکلیف ہے، آپ نے درانتیاں جمع کروائیں اور دوسرے روز میدانوں میں جا کر خس اور گھاس کٹوائی اور خس کی ٹٹیوں سے بہت خوبصورت رہائشی کمرے بنائے جب اہل لشکر نے یہ منظر دیکھا تو انھوں نے بھی خس کی ٹٹیوں اور لکڑیوں کی مدد سے اپنے چھوٹے چھوٹے مکانات بنا لئے اور اس کی وجہ سے دھوپ کی حدت اور بارش اور سردی سے بڑی حد تک عافیت ہو گئی۔

جب لشکر میں پانی کی کمی پڑتی تو آپ مشک اٹھا کر پانی کے لئے چلتے آپ کو دیکھ کر سب مشکیں اور گھڑے اٹھا لیتے اور پورے لشکر کو پانی مل جاتا، اکثر آپ نہر کے کنارے

بھاری بھاری پتھر مسجد کے فرش کی تعمیر کے لئے لاتے اور اس میں کسی کی مدد قبول نہ کرتے، اکثر آپ ایسے وزنی پتھر اٹھا لیتے جو لشکر کے بڑے قوی اور بہادر بھی آسانی سے اٹھا نہ سکتے تھے۔

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کا بھی یہی حال تھا، وہ اس محنت شاقہ اور کار خیر میں سب سے آگے رہنے کی کوشش کرتے اور مجاہدین کے تمام کاموں میں شریک رہتے، اور کسی موقع پر ان سے ممتاز و نمایاں ہونے کی کوشش نہ کرتے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی لشکر میں خدمت و مساوات اور اخوت اسلامی کی ایک لہر دوڑ گئی، لوگ ایک دوسرے کو راحت و آرام پہونچانے میں سبقت کرتے تھے، اور کسی کے کام آنے میں فخر و عزت اور مسرت محسوس کرتے تھے، مورخین نے جماعت مجاہدین کے اعلیٰ اخلاق و کردار، ہمدردی اور مساوات، سچی اخوت، ایثار و خود شکنی، نفس کی مخالفت، امانت داری و پاکبازی، حکم شریعت کے سامنے کامل سپر اندازی اور اطاعت کاملہ کے بکثرت و حیرت انگیز واقعات محفوظ کر دیئے ہیں، اور ان کی چند جھلکیاں آئندہ صفحات میں پیش کی جا رہی ہیں۔

معاف کرنے والے

ایک مرتبہ ایک خادم لاہوری نام کے جو بہت سادہ مزاج اور غریب شخص تھے، اور شیخ عنایت اللہ کے ساتھ مل کر گھوڑوں کا چارہ تیار کرنے کا کام ان کے سپرد تھا، شیخ عنایت اللہ خاں سے کسی بات پر ناراض ہوئے، عنایت اللہ خاں سید صاحب کے قدیم رفقا میں سے تھے، اور ان کو سید صاحب کے ہاں خاص منزلت حاصل تھی، شیخ عنایت اللہ میں بھی کچھ زائد تیزی آگئی اور بات بڑھی تو انھوں نے لاہوری کو ایک ایسا گھونسہ مارا کہ وہ زمین پر گر پڑے اور تکلیف سے کراہنے لگے، جب سید صاحب کو اس کا علم ہوا تو عنایت اللہ خاں کو آپ نے سخت سست کہا اور بہت ملامت کی اور کہا کہ تم اپنے دل میں یوں جانتے ہو گے کہ ہم سید صاحب کے پرانے رفیق اور ان کے پلنگ کے پاس رہتے ہیں، تم کو یہ خیال نہیں ہے کہ ہم یہاں اللہ کے واسطے آئے ہیں، اور کام ایسے نکمے کرتے ہو تم سمجھتے ہو کہ لاہوری قاضی مدنی کا سائیس اور کم رو اور حقیر ہے یہی جان کر تم نے اس کو مارا یہ تم نے بڑی زیادتی اور حرکت بیجا کی، ہمارے نزدیک تم اور لاہوری بلکہ سب برابر ہیں، کسی کو کسی پر فوقیت نہیں ہے سب لوگ یہاں خدا کے واسطے آئے ہیں۔

اس کے بعد آپ نے حافظ صابر تھانوی اور شرف الدین بنگالی سے فرمایا کہ

ان دونوں کو قاضی حبان کے پاس لے جاؤ عنایت اللہ کی زیادتی ہے، ان سے کہنا کہ اس معاملہ میں کسی کی رو رعایت نہ کریں، شرع شریف کے موافق فیصلہ کر دیں۔

اگلے روز دو تین گھڑی دن چڑھے حافظ صابر شرف الدین لاہوری اور عنایت اللہ کو لے کر قاضی کے پاس گئے انھوں نے عنایت اللہ لاہوری کو سامنے بٹھایا پہلے عنایت اللہ کی طرف مخاطب ہو کر خوب ملامت کی کہ تم نے بہت بُرا کیا اور تم سزا کے قابل ہو، پھر لاہوری کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ بھائی صاحب تم بہت نیک بخت اور بے شر آدمی ہو تم سب صاحب ہندوستان اپنا گھر بار چھوڑ کر محض جہاد فی سبیل اللہ کے واسطے آئے ہو کہ اللہ تم سے راضی ہو اور آخرت میں ثواب ملے، اور دنیا کا کارخانہ تو چند روز کے لئے خواب و خیال کی طرح ہے، سو بات یہ ہے کہ عنایت اللہ تمہارا بھائی ہے اور اس سے شامت نفس کے سبب یہ قصور ہو گیا اس نے تم کو مارا تم اگر اس کا قصور معاف کر دو اور دونوں مل جاؤ تو بہت خوب بات ہے، اللہ تعالےٰ کے یہاں اس کا اجر پاؤ گے اور جو تم اس کا عوض لو گے تو برابر ہو جاؤ گے جو معاف کرنے میں ثواب ہے، وہ نہ ملے گا، معاف کرنا بھی خدا رسول کا حکم ہے، اور عوض لینا بھی، مگر معاف کرنے میں ثواب اور عوض لینے میں اپنے نفس کی خوشی ہے۔

یہ بات سن کر لاہوری نے کہا کہ قاضی صاحب اگر ہم عنایت اللہ کو معاف کر دیں تو ثواب پاویں گے اور جو اپنا عوض لے لیں تو برابر ہو جاویں گے بھلا کسی طرح کا گناہ تو نہیں ہے، انھوں نے کہا کچھ گناہ نہیں ہے، دونوں حکم خدا رسولؐ کے ہیں جو چاہو منظور کرو، لاہوری نے کہا میں تو اپنا حق چاہتا ہوں، قاضی صاحب نے کچھ دیر سکوت کر کے فرمایا کہ بھائی لاہوری حق تو تمہارا یہی ہے کہ تم بھی عنایت اللہ کو اسی جگہ مارو اور

عنایت اللہ کو لاہوری کے سامنے کھڑا کر دیا کہ اپنا عوض لے لو۔ لاہوری نے کہا حق ہمارا یہی ہے کہ ہم بھی اسی جگہ دو گھونسے ماریں، قاضی صاحب نے کہا بیشک یہی بات ہے۔

اس وقت جو لوگ موجود تھے، سب کی امیدیں منقطع ہو گئیں، اور یقین ہو گیا کہ لاہوری بے عوض لئے نہ چھوڑے گا، لاہوری نے کہا اچھا بھائیو جو سب حاضر ہو گواہ رہو کہ قاضی صاحب نے ہم کو ہمارا عوض دلایا ہم لے سکتے ہیں، مگر ہم نے محض اللہ کی رضامندی کے لئے چھوڑ دیا، پھر اس نے عنایت اللہ کو اپنے سینہ سے لگا لیا اور مصافحہ کیا تمام لوگ جو وہاں تھے، لاہوری کو آفریں کرنے لگے اور شاباش دینے لگے کہ تم نے بڑے دینداروں کا کام کیا۔

بس اتنی بات تھی

"ہم نے آج سے تم کو لشکر میں غلہ اور آٹے کی تقسیم پر مقرر کیا" یہ بات سید صاحب نے لشکر کے ایک ایسے کمزور اور نحیف الجثہ شخص سے فرمائی جن کو بیماری نے اور دبلا کردیا تھا، ان صاحب کا نام عبدالوہاب تھا، اور یہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے، انھوں نے عرض کیا کہ میں حاضر ہوں مگر کئی عارضوں میں گرفتار ہوں، اور اس حال میں تھوڑا تھوڑا قرآن مجید بھی حفظ کرتا ہوں، اور یہ محنت کا کام ہے، اس کے واسطے طاقت اور تندرستی چاہیئے۔

آپ نے یہ سن کر سکوت کیا پھر فرمایا "مولوی صاحب! تم بسم اللہ کر کے مسلمان بھائیوں کی خدمت کے لئے کمر باندھو، ہم تمہارے واسطے دعا کریں گے انشاء اللہ تمہارے عارضے جاتے رہیں گے، اور طاقت و توانائی بھی آجائے گی اور اسی خدمت عظمیٰ کے انجام دینے کے دوران میں تم کو قرآن شریف بھی حفظ ہو جائے گا۔"

یہ بشارت سن کر وہ خوش ہوئے، اور اسی روز غلہ بانٹنے لگے، تمام لوگ ان سے راضی تھے، اور سید صاحب سے ان کی خوبیاں بیان کرتے تھے، چند روز میں اسی خدمت کے اندر اللہ تعالیٰ نے ان کے تمام امراض دور کر دیئے اور وہ بالکل صحیح سالم اور طاقتور ہو گئے، اسی خدمت کے اندر قرآن مجید اُن کو حفظ ہو گیا، ایک روز سید صاحب نے

خوش ہو کر فرمایا کہ مولوی اب تو اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل و کرم سے تم کو خوب تندرست و توانا کر دیا اور قرآن مجید بھی تم کو حفظ ہو گیا، انھوں نے عرض کیا کہ ہاں اللہ تعالےٰ نے آپ کی دعا کی برکت سے میری دونوں مرادیں پوری کر دیں، اب آپ میرے واسطے دعا کریں کہ میرا قرآن شریف پختہ ہو جائے میری یہ آرزو ہے کہ ایک بار تراویح میں قرآن مجید اوّل سے آخر تک آپ کو سنا دوں، آپ نے فرمایا بہت خوب ہم دعا کریں گے اب انشاء اللہ قرآن شریف نہ بھولو گے تم جو خالصاً للہ مسلمان بھائیوں کی خدمت کرتے ہو، اللہ تعالےٰ نے تم کو گویا مزدوری میں یہ عنایت کیا ہے۔

مولوی عبدالوہاب صاحب کا ہر روز یہ معمول تھا کہ قرآن شریف پڑھتے جاتے تھے اور غلہ یا آٹا لوگوں کو تقسیم کرتے جاتے تھے، ایک ایک کو دیتے اور زبان سے نہ گنتے مگر کبھی کسی کے آٹے غلہ میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ آتی۔

ایک روز آٹا تقسیم کر رہے تھے، کہ امام علی عظیم آبادی آٹا لینے کو آئے وہ بڑے قوی اور جسیم تھے، آٹا باری سے تقسیم ہوتا تھا، وہ پہلے مانگنے لگے مولوی صاحب نے کہا کہ تمہاری باری ابھی آتی ہے، ٹھیر جاؤ، وہ جلدی کرنے لگے انھوں نے نہ مانا، آخر میں امام علی نے مولوی صاحب کو دھکا دیا، اور وہ گر پڑے، وہاں قندھاری بھی آٹا لینے کو بیٹھے تھے، ان کو بُرا معلوم ہوا اور وہ سب مل کر میر امام علی کو مارنے پر تیار ہوئے مولوی صاحب نے قندھاریوں کو روکا اور کہا وہ ہمارا بھائی ہے، دھکا دیا تو ہم کو دیا تم سے کیا مطلب، وہ سب نادم ہو کر چپ ہو رہے، مولوی صاحب نے ان کو آٹا دیا، وہ اپنے ڈیرے پر گئے، لوگوں نے سید صاحب سے جا کر یہ قصہ بیان کیا جب اس دن مولوی صاحب رات کو حضرت کے پاس گئے آپ نے پوچھا کہ "مولوی صاحب آج میر امام علی نے تم سے کیا قصہ کیا انھوں نے کہا میرے نزدیک

انھوں نے کچھ نہیں کیا وہ تو بڑے نیک بخت آدمی ہیں، وہ آٹا لینے کو آئے اور مجھ سے مانگا ان کی باری نہ تھی، انھوں نے جلدی کی اس میں ان کا دھکا میرے لگ گیا" بس اتنی بات تھی" سید صاحب یہ بات سن کر خاموش ہو رہے، کسی نے یہ بات میر امام علی کو پہونچائی کہ مولوی عبدالوہاب نے تمہارے متعلق سید صاحب سے ایسی گفتگو کی وہ اپنی حرکت پر بہت نادم ہوئے اور اسی وقت سید صاحب کے سامنے آ کر مولوی عبدالوہاب سے اپنی خطا معاف کرائی اور مصافحہ کیا۔

کئی سال کے بعد موضع راج دواری میں مولوی عبدالوہاب نے سید صاحب کو تراویح میں قرآن شریف سنایا اور اس کے بعد ہی ذی قعدہ میں بالاکوٹ کی جنگ میں شہید ہوئے۔

دشمن کے ساتھ امانت و دیانت

مجاہدین میں اسلامی تعلیمات و آداب (جس کی تربیت ان کے قائد اور مربی کے ہاتھوں ہوئی تھی) اس طرح راسخ ہو چکے تھے، اور ان کو اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا کہ یہ اخلاق و آداب ان کی طبیعت ثانیہ بن گئے تھے، جو دوست دشمن، قریب و بعید، کسی میں امتیاز نہ کرتی تھی، اور سفر و حضر، خوشی و ناخوشی، کسی حالت میں بھی ان کا ساتھ نہ چھوڑتی تھی، یہاں اس امانت و دیانت کا ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے، جو ان حضرات کا شعار اور مزاج و ذوق تھی، اور ان کے رگ و ریشہ میں پیوست ہو چکی تھی۔

پنجتار کے ایک مجاہد فتح علی کو بغرض علاج پشاور جانے کی ضرورت پیش آئی، اور ان کو وہاں ایک سکھ افسر سے واسطہ پڑا، یہ وہ وقت تھا کہ مسلمانوں اور سکھوں میں جنگ جاری تھی۔

افسر نے کہا کہ میاں صاحب آپ کہاں سے آئے اور کہاں جا رہے ہیں، آپ بلا کچھ خیال کئے اپنا حال مجھے بتا دیں۔

فتح علی صاحب نے ہمت کر کے اور دل مضبوط کر کے جواب دیا کہ میں ہندوستان سے امیر المومنین حضرت سید احمد صاحب کے ساتھ یہاں آیا ہوں اور میں ان کے لشکر میں نوکر

اور امیر المومنین کے ماننے والے نہ جھوٹ بولتے ہیں نہ کسی کو دھوکہ دیتے ہیں، خواہ وہ ان کا دوست ہو یا دشمن، اس لئے کہ امیر نے ان کی ایسی ہی تربیت کی ہے، امیر المومنین خود بہت اعلیٰ اخلاق کے مالک ہیں، بہت سخی، کریم النفس، وعدہ کے سچے اور عہد کے پکے ہیں، غرض زبان ان کی تعریف کرنے سے قاصر ہے، اگر آپ ان سے ملیں گے تو بہت خوش ہوں گے وہ اللہ تعالےٰ کے ایسے ولی اور خدا رسیدہ بندے ہیں کہ اگر ان کو کوئی تکلیف پہونچاتا ہے تو وہ اللہ تعالےٰ کی ناراضی مول لیتا ہے۔

سکھ افسر نے یہ سن کر جواب دیا کہ، میاں جی، جو کچھ تم نے کہا ہے، سچ ہے، میں پہلے بھی آپ کے امیر صاحب کے بارے میں یہی سن چکا ہوں اور مجھے ان سے ملنے کا بہت شوق ہے، اور میرا ارادہ ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا ہے، میرا بھائی لاہور سے آجائے تو یا تو میں خود حاضر ہوں گا یا اس کو ان کے پاس بھیجوں گا۔

اس نے یہ بھی کہا کہ آپ مجھ کو خفیہ طور سے امیر صاحب کی ساری باتیں بتائیں میں چاہتا ہوں کہ آپ سے اس سلسلہ میں روزانہ کچھ معلومات حاصل کروں، فتح علی صاحب نے کہا کہ امیر المومنین کا اخلاق و شرافت، حوصلہ و ہمت، دریا دلی اور نرمی و شفقت ایسی ہے کہ جو آپ کے پاس تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ جاتا ہے، وہ پھر ان کو چھوڑنا نہیں چاہتا، میں چار پانچ دن میں واپس جانا چاہتا ہوں، میری تمنا ہے کہ ایک بار میں خیر آباد کا قلعہ دیکھ لیتا اس لئے کہ لوگ مجھ سے اس بارہ میں ضرور پوچھیں گے اور میں کچھ بتا نہ سکوں گا۔

وہ افسر بولا، میاں جی تمہارا معاملہ عجیب ہے تم ہم سے لڑتے بھی ہو اور ہمارے دشمن سے بھی ملے ہوئے ہو، پھر تم کو یہ کہنے کی جرأت کیسے ہوتی ہے کہ میں تم کو اپنے مستحکم قلعہ اور وہاں کے فوجی ٹھکانے دکھانے کے لئے تیار ہو جاؤں گا تمہیں ڈر نہیں لگتا۔

فتح علی صاحب نے جواب دیا ڈر کس بات کا ہے؟ امیرالمومنین کے ساتھی خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، مجھے آپ کریم النفس معلوم ہوئے اس لئے میں نے یہ خواہش کی کہ آپ کے ذریعہ میں یہ قلعہ دیکھ لوں۔

یہ جواب سن کر سکھ افسر ہنس پڑا اور کہنے لگا کہ آپ کچھ نہ کیجئے میں نے یہ سب مزاحاً کہا تھا، میں آپ کے لئے ایک چٹھی لکھ دوں گا وہ آپ پہرہ داروں کو دے دیجئے گا تو آپ کو اندر جانے کی اجازت مل جائے گی۔

اس کے بعد اس افسر نے قلم دوات منگوایا اور پہرہ داروں کے نام ایک سفارشی رقعہ لکھ کر فتح علی صاحب کے حوالہ کیا، فتح علی صاحب اس کو لے کے گئے، ان کو داخلہ کی اجازت مل گئی، اور انھوں نے قلعہ کی خوب سیر کی، اور دن ڈھلتے جب فتح علی صاحب واپس آئے تو انھوں نے دیکھا کہ ان کا میزبان افسر سخت نشہ کی حالت میں بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے، اس کے گلے میں سونے کی ایک زنجیر، کان میں سونے کی بالی تھی، اور قریب ہی تلوار پڑی تھی، جس کا دستہ سونے کا تھا، جب اس کی نظر فتح علی صاحب پر پڑی تو اس نے پوچھا، میاں جی اٹک کا قلعہ تم نے دیکھ لیا؟ فتح علی صاحب نے جواب دیا کہ ہاں، اس کے بعد اس پر غنودگی طاری ہو گئی، اور وہ سو گیا، فتح علی صاحب بیان کرتے ہیں کہ وہ برابر سوتا رہا، یہاں تک کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں کوئی چور اچکا نہ آ جائے اور اس کے سونے سے فائدہ اٹھا کر یہ سب کچھ اڑا لے جائے، وہ کہتے ہیں کہ یہ سوچ کر میں نے ایک لاٹھی لے لی اور اس کے گھر کے دروازہ پر کھڑا ہو گیا، آدھی رات کے قریب افسر کی آنکھ کھلی اور اس نے دیکھا کہ میں کھڑا پہرہ دے رہا ہوں یہ دیکھ کر اس نے کہا کہ میاں جی، تم ابھی تک جاگ رہے ہو، میں نے کہا آپ نشہ میں تھے، اور سو رہے تھے، اور آپ کا قیمتی سامان میرے سامنے پڑا ہوا تھا مجھے

ڈر ہوا کہ کوئی چور ڈاکو اس پر ہاتھ صاف نہ کر دے یا آپ کو کوئی نقصان نہ پہونچ جائے، اس نے کہا کہ میاں جی تم ٹھیک کہتے ہو مجھ جیسے آدمی کے لئے نشہ وشہ عیب کی بات ہے، اس کے بعد اس کی آنکھ پھر لگ گئی۔

جب صبح ہوئی اور دن چڑھ گیا تو وہ مجھے اپنے ساتھ خیر آباد کے قلعے دکھانے کے لئے لے گیا اور اس کے ساتھ ہم لوگ واپس آئے۔

میں اس کے ساتھ آٹھ روز ٹھیرا اس درمیان میں وہ روز مجھ سے سید صاحب کے بارے میں پوچھتا اور میں آپ کی کچھ باتیں عرض کرتا، ایک روز اس نے کہا کہ ایک دن آپ نے مجھے شراب سے بچنے کی نصیحت کی تھی، آج میں نے توبہ کی کہ اتنی زیادہ اب نہ پیوں گا کہ ہوش و حواس جاتا رہے۔

فتح علی صاحب کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں بحفاظت اپنے لشکر پہونچ گیا۔

ایک رہزن کی توبہ و اصلاح

اس اسلامی نو آبادی میں جو بھی آتا اور اس کو دو چار دن قیام کا موقع ملتا وہ مجاہدین کے اخلاق و کردار سے ضرور متاثر ہوتا خواہ وہ کسی اچھی نیت سے نہ آیا ہو۔ یہ وہ لوگ تھے، جن کے ہمنشین ان کے فیض و برکت سے محروم نہیں رہتے۔

اس سلسلہ کا ایک واقعہ بطور مثال یہاں پیش کیا جاتا ہے:

ایک قریبی گاؤں ٹوپی میں پھلیلہ نام ایک شخص بڑا ظالم اور مردم آزار تھا، تمام بستی والے اس سے تنگ اور عاجز تھے، آخر سب نے متفق ہو کر اس کو ٹوپی سے نکال دیا وہ وہاں سے دریائے اٹک اتر کر سکھوں میں جا رہا اور ان سے موافقت پیدا کی، انھوں نے اٹک کے کنارے اس کے لئے ایک برج بنا دیا اور زراعت کے واسطے کچھ زمین بھی دی، وہ اس برج میں رہنے لگا پچاس ساٹھ آدمی ہر وقت اس کے پاس رہتے تھے، وہ اکثر ٹوپی کے علاقہ میں ڈاکہ مارا کرتا تھا، اور وہاں بیٹھ کر کھاتا تھا، ایک مرتبہ سکھوں کو اپنے ساتھ لے کر مشوانی قوم کے ایک آباد موضع کو خوب لوٹا اس بستی کے اسّی آدمی مارے گئے، اور پھر اس بستی پر قبضہ کر کے خود وہاں رہنے لگا، ان بستیوں کے لوگ سید صاحب کے پاس نالشی ہوئے اور اس کی سرکوبی کی درخواست کی آپ نے ان کی تسلی اور دلجمعی کر کے واپس کر دیا اور پھلیلہ کے پاس اس مضمون کا خط بھیجا کہ تم مسلمان ہو تم کو مناسب نہیں ہے کہ تم اپنے مسلمان بھائیوں کو لوٹو مارو اور تنگ کرو تم یہاں ہمارے پاس چلے آؤ، ہم تم کو تمہاری بستی میں بسا دیں گے، اور جو تمہاری زمین جاگیر ہوگی تم کو دلا دیں گے اور انشاءاللہ تعالیٰ تم کو ایک گاؤں اور دیں گے۔

جب یہ خط اس کو ملا اس نے اپنے ساتھیوں سے صلاح لی سب نے کہا چلنا ہی مناسب ہے، کیونکہ وہ سید اور ہم سب کے امام اور بادشاہ ہیں، ہم سب کو تو پکڑنے سے رہے، اگر دو چار کو ہم میں گرفتار کر لیں گے تو ہم جیسا ہوگا دیکھ لیں گے، چنانچہ پھلیلہ مع سب میں آکر سید صاحب سے ملا آپ بہت خوش ہوئے، اس نے تین گھوڑے، چار بندوقیں، اور نو تلواریں جو سکھوں سے ایک روز پہلے لوٹی تھیں، آپ کی نذر کیں، آپ نے اس کے آدمیوں کو ایک ایک پگڑی اور ایک ایک لنگی عنایت کی، اور پھلیلہ کو ایک سبز دوشالہ بہت سے کپڑے اور کچھ نقد روپے دیئے، پھر پھلیلہ نے اور اس کے آدمیوں نے آپ سے بیعت کی اور فسق و فجور اور

بُرے کاموں سے توبہ کی، تین روز آپ نے اس کو اپنے پاس رکھا اور اس کو خوب نصیحت فرمائی اور تسلی کر کے رخصت کیا تھوڑے دن کے بعد آپ نے موضع ٹوپی کے رئیسوں کو اور پھلیلہ کو بلایا اور ان سے صلح صفائی کرائی اور پھلیلہ کا جو حق ٹوپی میں تھا ان رئیسوں سے دلا دیا اور ایک گاؤں جو دریائے اٹک کے کنارے ایک ٹیکری پر ویران پڑا تھا، اور وہاں اکثر مسافر لوگ لٹ جاتے تھے، وہ پھلیلہ کو دلوا دیا اور فرمایا کہ اب وہیں رہا کرو۔

اس کے بعد پھلیلہ کی زندگی میں انقلاب سا آگیا اور تمام اچھی باتیں اس نے اختیار کرلیں، کئی معرکوں میں اس نے اپنے جوہر دکھائے اور اس سے دین کو اور مسلمانوں کو بڑی تقویت ہوئی اور ان کے ہاتھ مضبوط ہوئے۔

دو جاسوسوں کا قبول اسلام

پنجتار کے قیام میں دو سکھ آپ سے ملنے آئے آپ نے ان سے آنے کا سبب پوچھا انھوں نے عرض کیا کہ صرف آپ کی ملاقات کو آئے ہیں، آپ نے فرمایا خیر تم ہمارے مہمان ہو، جب تک چاہو رہو، آپ نے ان کے واسطے اپنے یہاں سے جلنس مقرر کر دیا، وہ دونوں روزانہ فجر و عصر کی نماز کے بعد آپ کے پاس بیٹھتے تھے، اور آپ کی باتیں سُن کر اپنے بستر پر چلے جاتے تھے، آپ نے ان سے فرمایا کہ تمہیں جو کچھ ضرورت ہوا کرے ہم سے کہہ دیا کرو، اور کسی بات کا اندیشہ نہ کرنا، مگر وہ کچھ نہیں کہتے تھے، دس بارہ دن کے بعد انھوں نے ایک دن عرض کیا کہ حضرت

اتنے دن ہم آپ کی خدمت میں رہے، آپ کی باتیں خوب سنیں جو کچھ لوگوں سے آپ کے اوصاف حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ سنے تھے ان سے بڑھ کر پایا اور آپ کا طریقہ اور دین ہم کو بہت پسند آیا، اب ہم چاہتے ہیں کہ ہم کو بھی یہ دین اور طریقہ آپ تعلیم کریں۔

سید صاحب یہ سن کر بہت خوش ہوئے، اور اسی وقت ان کو کلمۂ شہادت پڑھا کر مسلمان کیا اور بڑے کا نام عبدالرحمٰن اور چھوٹے کا نام عبدالرحیم رکھا اور میاں جی چشتی سے فرمایا کہ ان کو اپنے ڈیرے میں لے جا کر نماز سکھاؤ اور شیخ ولی محمد صاحب سے فرمایا کہ ان کو دو دو جوڑے کپڑے بنوا دو، اسی روز سید صاحب نے ان کا ختنہ بھی کرا دیا، بعد میں انھوں نے سید صاحب سے بیان کیا کہ ہم کو خیرآباد سے سکھوں کے سالار نے آپ کے پاس بھیجا تھا کہ ہم لوگوں سے خلیفہ صاحب کی خوبیاں اور بزرگیاں بہت سنتے ہیں، سو تم خود جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھ آؤ اور ہم سے آ کر بیان کرو، اس واسطے ہم آپ کو دیکھنے آئے تھے، یہاں اللہ تعالیٰ نے آپ کے طفیل سے ہم کو اسلام کی نعمت عطا فرمائی، سید صاحب یہ سن کر بہت خوش ہوئے ان کو دو گھوڑے دیئے اور فرمایا کہ تمہاری خوشی ہو تو ہمارے لشکر میں رہو اور چاہو تو خیرآباد میں اپنے افسر کے پاس جاؤ تم کو اختیار ہے، وہ دو مہینے کے قریب لشکر میں رہے اور نماز سیکھی اور رخصت ہو کر خیرآباد یا کسی اور طرف کو چلے گئے۔[1]

نظام قضا و احتساب کا قیام

تھوڑے دن کے بعد سید صاحب نے اس علاقہ میں نظام شرعی کا اجرا کیا اور ممتاز

---

[1] سیرت سید احمد شہید ص ۲۹۔

افغانی عالم قاضی محمد جان کو وہاں کا قاضی القضاۃ مقرر کیا، ہر گاؤں میں قاضی اور مفتی محتسب اور صدقات اور عشر و زکوٰۃ کی تحصیل کے لئے عمال اور محصل مقرر کئے، ساری آمدنی بیت المال میں باضابطہ جمع کی جاتی اور پھر وہاں سے شرعی اصولوں کے مطابق تقسیم ہوتی، قاضی محمد جان صاحب نے مقامی اور غیر ملکی علماء کے مشورہ سے تارکین فرائض اور مرتکبین منہیات کے لئے سزائیں اور جرمانے تجویز کئے اور اس کی وجہ سے بہت سی خرابیوں کا سدباب ہوا بہت سے فاسق و فاجر، اوباش و بے دین لوگ اپنی حرکتوں سے باز آئے، اور معاشرہ ان کے شر اور بدکرداری سے محفوظ ہو گیا نمازیوں کی تعداد میں بھی بڑا اضافہ ہوا اور اس آیت کی عملی تفسیر نگاہوں کے سامنے آگئی کہ:۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝

(سورہ حج - ۴۱)

یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دیدیں تو یہ لوگ (خود بھی) نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور (دوسروں کو بھی) نیک کاموں کے کرنے کو کہیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام تو خدا ہی کے اختیار میں ہے

چلتی پھرتی چھاؤنی اور علمی درسگاہ

یہ اسلامی نو آبادی تصوف کی کوئی خانقاہ یا تارکین دنیا کی کوئی رباط اور درویشوں کی جائے قیام نہ تھی، یہ ایک دینی اور تربیتی مرکز کے ساتھ فوجی چھاؤنی اور شہ سواری و سپہ گری کا

مرکز بھی تھی، مجاہدین و مہاجرین اپنے کو مسلسل حالتِ جنگ میں سمجھتے تھے، اور ہر خطرہ کے مقابلہ کے لئے ہر وقت کمر بستہ رہتے تھے، اور سامان جہاد تیار رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ سید صاحب مجاہدین کی جماعت کے ساتھ ایک قریب کی گھاٹی میں تشریف لے گئے جو پنجتار سے ایک میل کے فاصلے پر تھی، وہاں ایک ٹیلہ تھا جس کی بلندی سطح تھی، آپ نے توپ خانہ کے لئے اس جگہ کو تجویز فرمایا اور حکم دیا کہ پنجتار سے توپیں لاکر یہاں نصب کی جائیں چنانچہ یہاں توپ خانہ قائم ہوا اور بموں، گولوں اور بارود کا ایک ذخیرہ بھی وہاں اکٹھا کیا گیا، اور توپچیوں اور گولہ اندازوں کے لئے کوارٹر بھی تعمیر کئے گئے، موضع قاسم خیل میں گولے بنانے کا ایک کارخانہ قائم کیا گیا اور سید صاحب وہاں تشریف لے گئے اور گولوں کی تیاری کے سارے مراحل بچشم خود دیکھے، شہ سواری اور گھوڑ دوڑ کے مقابلے اور جنگی مشقوں کا بھی انتظام کیا گیا، اس میں سید صاحب نے بھی حصہ لیا اور مختلف فنون سپہ گری میں آپ کا امتیاز ظاہر ہوا اور آپ کی مہارت اور فوقیت کا بڑے بڑے شہ سواروں اور زور آزماؤں نے اعتراف کیا اور معلوم ہوا کہ آپ اس میں بھی ایجاد و اجتہاد کے مرتبہ پر فائز ہیں، اور ان فنوں سے محض عملی واقفیت اور مہارت رکھنے والوں میں نہیں جو صرف لکیر کے فقیر ہوتے ہیں۔

اس نو آبادی میں جسمانی ورزشیں اور جنگی مشقیں روز کا معمول اور وہاں کی عام زندگی میں شامل تھیں، مجاہدین ایک دوسرے سے فنون حرب میں استفادہ کرتے تھے، لیکن ان لوگوں میں سید صاحب کے بعد مولانا احمد اللہ صاحب ناگپوری اور رسالدار عبدالحمید خاں سب سے پیش پیش تھے، اور ہر چیز میں اول آتے تھے، چنانچہ سید صاحب نے ان کو حکم دیا کہ وہ مجاہدین کو گھوڑ سواری، نیزہ بازی، اور تیر اندازی نیز بندوق چلانے اور شمشیر کے جوہر دکھانے کی باقاعدہ مشق کرائیں جب مقامی باشندوں نے (جو فطری طور پر جنگ جو واقع ہوئے تھے) یہ منظر دیکھا تو

ان کو ان غریب الوطن مہاجرین کی مہارت پر بڑی حیرت ہوئی اور ان کمالات میں استاد مان لیا، اور وہ بھی ان مشقوں اور تیاریوں میں شریک ہو گئے اور ان سے بہت استفادہ کیا، جسمانی ورزش اور جنگی مشقوں کے بہت سے مرکز کھول دیئے گئے، سید صاحب نے رسالدار عبدالحمید خاں کو گھوڑ سوار دستہ کا افسر اعلیٰ اور فوج کا سپہ سالار مقرر کیا اور ان کے لئے خوب دعا کی اور ایک اصیل گھوڑا جو آپ کو نواب وزیر الدولہ والیٔ ٹونک نے نذر کیا تھا، ان کو عطا کیا اور ان کے سر پر اپنے ہاتھ سے عمامہ باندھا، عبدالحمید خاں اس عزت افزائی اور سرفرازی پر بہت خوش ہوئے، خدا کا شکر ادا کیا اور مسجد جا کر شکرانہ کی دو رکعت نماز پڑھی، اسی دن سے ان کے اخلاق و کردار میں نمایاں فرق محسوس ہوا، طبیعت میں نرمی پیدا ہو گئی، اور بہت بردبار کریم النفس، مسلمانوں کے ہمدرد اور دشمنان دین کے لئے سخت و تند خو نظر آنے لگے اور مایار کے ایک معرکہ میں شہادت سے سرفراز ہوئے، مسلمانوں پر ان کی وفات کا بڑا اثر تھا اور سب ان کے لئے دل سے دعا گو اور ان کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔

مجاہدین کی سرگرمیاں

اس پوری مدت میں سید صاحب نے اطراف و جوانب کے سرداروں سے رابطہ قائم رکھا، ان سے مراسلت کرتے اور کبھی کبھی خود ان سے جا کر ملتے اور جہاد اور دین کی نصرت پر انھیں آمادہ کرنے کی کوشش کرتے، اس سلسلے میں پائندہ خاں والی امب کا نام قابل ذکر ہے، جو اپنی شجاعت و قوت میں مشہور تھے۔

سید صاحب مختلف جگہوں پر مجاہدین کے سریّہ اور دستے بھیجتے، ان معرکوں میں مجاہدین کی شجاعت وہمت، احکام شرعیہ کی اطاعت اور ڈسپلن کی پابندی، اور مال غنیمت کے موقع پر ان کی پاکبازی ودیانت خوب کھل کر ظاہر ہوتی اور اسی کے ساتھ مقامی سرداروں اور امرار کے شخصی مفادات، قبائلی خصومات اور دینی حمیت کی کمی اور خطرہ کی طرف سے بے شعوری صاف دیکھی جا سکتی تھی، غرض مختلف مقامات پر ایسے معرکے پیش آئے جن میں مجاہدین کی ہمت وشجاعت اور سرفروشی وجان سپاری نمایاں ہو کر سامنے آئی اور ان تمام معرکوں اور لڑائیوں میں مولانا محمد رامپوری کا پایہ سب سے بلند رہا۔

اس زمانہ میں مجاہدین کے جو نئے قافلے ہندوستان سے پہونچے ان کی تعداد پندرہ سے کم نہ تھی، ان میں بڑے بڑے علمار، اہل وجاہت اور بہت سے غیور و پرجوش نوجوان شامل تھے، نیز سید صاحب کے بھانجے سید احمد علی اور دوسرے اقارب تھے، اسی کے ساتھ مجاہدین کے اعوان وانصار اور جماعت کے دوسرے افراد[۱] کی طرف سے روپیہ بھی آیا جو مختلف دینی مصالح اور ضروریات پر صرف ہوا۔

خطوط ایک خفیہ زبان میں لکھے جاتے تھے، جس کو صرف جماعت کے علمار سمجھتے تھے، ان میں سے بہت سے خطوط عربی میں بھی لکھے جاتے تھے۔

سید صاحب نے جہاد کی دعوت کے لئے مختلف علاقوں میں واعظین بھیجے اور جماعت کے ممتاز علمار کو ہجرت وجہاد کی دعوت، عقیدۂ صحیحہ کی اشاعت اور خرافات وجاہلیت کے خاتمہ کے لئے ہندوستان روانہ کیا، ان لوگوں میں مولانا محمد علی رامپوری اور مولانا

---

[۱] ان میں سرفہرست مشہور محدث مولانا محمد اسحاق دہلوی نبیرۂ حضرت شاہ عبدالعزیز ہیں، جو عہد آخر میں درس حدیث کے سب سے بڑے استاد اور اس فن کے امام سمجھے جاتے ہیں۔

ولایت علی عظیم آبادی بھی تھے، جو سید صاحب کے اہم خلفاء اور رفقاء میں تھے۔

دوسرا دورہ آپ نے سوات کا کیا اور اس کے پایہ تخت خہر میں پورے ایک سال قیام رہا، یہ پورا زمانہ آپ نے دعوت و اصلاح وعظ و ارشاد میں گزارا اور اس میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، قبائلی سردار اور سربرآوردہ اور ممتاز علماء آپ کو ہر وقت گھیرے رہتے تھے۔

اس کے بعد خہر کے مجاہدین دوبارہ اپنی جنگی مشقوں، نیزہ بازی، گھوڑ دوڑ اور چاند ماری میں مشغول ہو گئے، کبھی کبھی سید صاحب اس میں شرکت کرتے اور ان کو مفید مشورے دیتے اور اپنی مہارت اور ہنرمندی پر ناز اور تکیہ کرنے سے آگاہ کرتے اور محض خدا پر اعتماد اور اس سے مدد طلب کرنے کی ترغیب دیتے، خہر ہی میں ارباب بہرام خاں کی سرکردگی میں ایک چھاپہ پشاور کے قریب تمان زئی میں بھیجا گیا اس میں سید صاحب نے بنفس نفیس شرکت کی، اس چھاپہ میں مجاہدین کو سخت زحمتوں کا سامنا کرنا پڑا، قریب تھا کہ گرمی کی شدت اور پیاس اور صحرانوردی میں وہ سب ہلاک ہو جائیں، لیکن اللہ تعالےٰ نے فضل فرمایا اور وہ بحفاظت اپنے مستقر پر واپس ہوئے۔

عالم ربانی کی وفات

خہر (سوات) میں شیخ الاسلام مولانا عبدالحی کا سانحۂ وفات پیش آیا، یہ ایک ایسی مصیبت عظمیٰ تھی، جس میں لوگوں نے ایک دوسرے کی تعزیت کی، ان کی وفات سے

مسلمان ایک عالم ربانی مخلص داعی اور شفیق باپ کی محبت سے محروم ہو گئے آخری ایام میں ان کی قوت ایمانی اور غیرت دینی پورے جوش میں تھی، ثقہ راوی بیان کرتے ہیں۔

سید صاحب مولانا عبدالحی صاحب کو دوسرے امور کی نگرانی کے لئے وطن چھوڑ آئے تھے، اور یہ کہہ آئے تھے کہ بعد میں ان کو بلالیں گے، اس درمیان میں، مولانا اپنی طلبی کا اس بے چینی اور اشتیاق سے انتظار کرتے رہے، جیسے وہ ماہی بے آب ہوں یا جلا وطنی اور قید میں زندگی گزار رہے ہوں، جب طلبی ہوئی، تو خوشی سے دیوانہ وار اِدھر سے اُدھر دوڑتے تھے، اور کہتے تھے کہ "سید صاحب نے مجھے یاد فرمایا ہے، سید صاحب نے مجھے یاد فرمایا ہے" اس کے بعد ان طویل ریگستانوں، دریاؤں، اور پہاڑوں کو بدقت تمام عبور کر کے جس طرح اور مجاہدین نے کیا تھا، وہاں پہونچے جب سید صاحب کو ان کی آمد کی اطلاع ہوئی تو آپ بہت خوش ہوئے اور آپ نے ان کے لئے بہت اہتمام کیا، وہاں سے مولانا عبدالحی صاحب نے اپنے ایک دوست کو خط میں لکھا کہ میں سنتا اور پڑھتا آیا تھا، کہ مومن جب جنت میں پہونچیگا تو دنیا کی ساری تکلیفیں اور مصائب و آلام یک لخت بھول جائیگا اور اس کا سب تکان اسی وقت دور ہو جائے گا، یہی قصہ یہاں میرے ساتھ پیش آیا میں جب اپنے احباب و محسن کے پاس پہونچا تو سفر کی ساری تھکاوٹ دور ہو گئی۔

اس کے بعد مولانا دعوت و اصلاح اور وعظ و ارشاد کے کام میں تندہی سے مشغول ہو گئے، جب وفات کا وقت قریب ہوا تو آپ نے سید صاحب سے کہلوایا کہ میری خواہش تھی کہ میدان جنگ میں میری موت ہوتی، لیکن تقدیر الٰہی سے بستر پر جان دے رہا ہوں، سید صاحب کو اطلاع ہوئی تو آپ تشریف لائے اور حال پوچھا، مولانا نے کہا کہ نہایت تکلیف ہے، آپ میرے واسطے دعا کریں، اور میرے سینہ پر اپنا قدم رکھ دیں کہ اس کی برکت سے اللہ تعالےٰ

اس مصیبت سے مجھکو نجات دے، آپ نے فرمایا، مولانا صاحب آپ کا سینہ کتاب وسنت کے علم کا گنجینہ ہے، میری کیا مجال کہ میں اس پر پاؤں رکھوں، پھر آپ نے بسم اللہ کر کے اپنا ہاتھ رکھدیا، مولانا کو قدرے تسکین ہوئی اور کئی بار "اللہ الرفیق الاعلیٰ، اللہ الرفیق الاعلیٰ" اپنی زبان سے کہا اور انتقال فرمایا۔

نظام شرعی کی تجدید اور امامت وامارت کا قیام

ان حالات کو دیکھ کر اسلام کے اس رکن عظیم کی برکتوں اور فائدوں پر ان لوگوں کا عقیدہ اور پختہ ہوگیا جنھوں نے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور آپ کو اپنا امام اور امیر تسلیم کیا تھا، ان کو محسوس ہوا کہ اس نظام کو اور وسیع کرنے، اس کا دائرہ اختیار بڑھانے اور اس کو مستحکم بنیادوں پر قائم کرنے کی ضرورت ہے، ان کو یقین تھا کہ اگر خدا کی نصرت درکار ہے تو اطراف وجوانب کے مسلمان باشندوں کو احکام شرعیہ قبول کرنے کی دعوت دینا ضروری ہوگا اور ان کو اس پر آمادہ کرنا ہوگا کہ وہ افغانی رسم ورواج اور اس ملکی دستور سے دست بردار ہوں جو اسلامی تعلیمات اور اسلامی... احکام سے متصادم ہے اور امام کی ایسی اطاعت کریں کہ اس میں بدعات ومنکرات اور ہوا پرستی کا کوئی دخل نہ ہو، شرعی جہاد اسی وقت مکمل ہوگا اور اللہ تعالےٰ کی تائید ونصرت نازل ہوگی۔

سید صاحب نے سوات کے دار السلطنت خہر میں ایک سال سے زیادہ عرصہ گزارا (جمادی الآخرہ ۱۲۴۳ھ۔ جمادی الآخرہ ۱۲۴۴ھ) اس نظام شرعی کی مزید توسیع اور

استحکام کی غرض سے آپ پنجتار تشریف لے گئے اور وہاں آپ نے امیر کے تقرر اور اس کی اطاعت پر زور دیا اور اس موضوع پر علمار دین سے تبادلۂ خیال کیا انھوں نے اس اہم فریضہ کے معاملہ میں اپنی کوتاہی کا اعتراف کیا، اس موقع پر علمار اور سرداران قبائل کی ایک بڑی تعداد نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی، پنجتار میں آپ نے فتح خاں پر (جن کی وجہ سے اس جگہ کا انتخاب عمل میں آیا تھا) یہ بات واضح کردی کہ وہ یہاں اس شرط پر قیام کرسکتے ہیں، کہ وہ اپنے رئیسانہ و امیرانہ عادات و روایات اور شریعت کے منافی تمام رسوم، موروثی آداب اور لوازم جاہ و منصب سے دستبردار ہوجائیں اور اپنا شمار عام آدمیوں میں کریں، نظام شرعی کے سامنے سر تسلیم مکمل طور پر خم کردیں، اور اس معاملہ میں اپنے بھائیوں اور عزیزوں کے ساتھ جانب داری نہ برتیں اور کسی قسم کی مداہنت اور منافقت سے کام نہ لیں، آپ نے وہاں کے علمار اور مدرسین کو دعوت نامہ بھیجا اور تقریباً دو ہزار عالم اور ان کے ساتھ شاگردوں کی ایک بڑی جماعت جس کی تعداد بھی دو ہزار سے کم نہ ہوگی آپ کی دعوت پر وہاں حاضر ہوئے آپ نے قبائل کے نامور سرداروں اشرف خاں اور خادی خاں کو بھی مدعو کیا اور شروع شعبان میں ان علمار و رؤسار اور سرداران قبائل کی ایک بڑی کانفرنس منعقد ہوئی، سید صاحب نے علمار اور فقیہوں کو ایک استفتا ارسال کیا کہ جو امام کی مخالفت اور امام کے خلاف بغاوت کرے اس کا شرعی حکم کیا ہے ان لوگوں نے اس استفتار پر اپنے دستخط اور مہریں ثبت کیں، جمعہ کی نماز کے بعد سب علمار اور سرداروں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی جو لوگ اس سے پہلے بیعت کرچکے تھے، وہ بھی اس میں شریک ہوئے۔

تیسرے جمعہ ۱۵ شعبان ۱۲۴۴ھ کو فتح خاں نے ارباب حل و عقد اور اپنے قبیلہ کے اصحاب الرائے کو جمع کیا آپ نے ان سب سے بیعت لی اور ایک عالم صالح مولانا

سید محمد میر کو پنجتار کے علاقہ کا قاضی القضاۃ مقرر کیا، احکام شرعیہ نافذ کیے گئے، نزاعات شرعِ اسلامی کی روشنی میں طے کیے جانے لگے، تارکینِ نماز اور فساق و فجار کی تادیب کے لئے محتسب مقرر کیے گئے اور اس نظام کی برکتیں بہت جلد ظاہر ہونا شروع ہوئیں، دین کا اقتدار اور شوکت و عزت قائم ہوئی، سو سو سال سے لوگوں نے جو حقوق غصب کر رکھے تھے اور جن زمینوں اور املاک پر قبضہ کر رکھا تھا، وہ سب مستحقین کو واپس ملیں جن لوگوں کے حقوق چھینے گئے تھے، یا جن کی آبروریزی ہوئی تھی انھوں نے داد خواہی کی اور اپنے حقوق حاصل کیے، اس نظام نے تھوڑے دن میں وہ کر دکھایا، جو بڑی بڑی منظم حکومتیں نہیں کر سکتیں، اس احتساب و نگرانی کا اثر یہ ہوا کہ لوگ ادائیگی فرائض میں پوری طرح مشغول ہو گئے یہاں تک کہ پورے پورے گاؤں میں ایک آدمی بھی ڈھونڈنے سے نماز کا تارک نہ ملتا، غرض بہت عرصہ کے بعد دین نے سربلندی و قوت حاصل کی اور اس کا رعب و دبدبہ لوگوں کے دلوں پر قائم ہوا۔

فرانسیسی جنرل کے سامنے

مشہور فرانسیسی جرنیل وینٹورہ (VANTORA)[۱] نے اپنے لشکر کے ساتھ

۱؎ جنرل وینٹورہ (VANTORA) رنجیت سنگھ کے ممتاز غیر ملکی فوجی قائدین میں تھا، اور وہاں اسکو جو احترام اور اعتماد حاصل تھا وہ کسی اور غیر ملکی کو نہ تھا، یہ اٹلی کے ایک ممتاز خاندان سے تعلق رکھتا تھا، اور ایک طویل زمانہ تک نپولین کی ماتحتی میں اسپین اور اٹلی کی فوج میں ملازم رہا۔ (باقی صفحہ۱۵۱ پر)

دریائے سندھ پار کیا اور قلعہ ہنڈ[1] میں ڈیرہ ڈال دیا معلوم ہوا کہ اس کو خاوی خاں نے طلب کیا ہے، وینٹورہ نے سرداران قبائل سے حسب معمول ٹیکس وغیرہ کا مطالبہ کیا جیسا وہ ہر سال کیا کرتا تھا لیکن اس بار ان سرداروں نے ٹیکس ادا کرنے سے انکار کر دیا اس لئے کہ وہ اب سید صاحب سے بیعت کر چکے تھے، اور آپ کی اطاعت اپنے اوپر لازم کر چکے تھے، ان کے اندر دینی حمیت اور افغانی غیرت پیدا ہو گئی، جب انھوں نے محسوس کیا کہ معاملہ سنگین ہے، اور اس سے مفر نہیں معلوم ہوتا تو ان میں بہت سے لوگ سید صاحب کے پاس پہونچ گئے اور آپ کی پناہ میں آگئے، وینٹورہ کو جب یہ معلوم ہوا تو اپنے لشکر کو لے کر پنجتار کے قریب ٹھیر گیا، اور سید صاحب کو ایک خط لکھا جس میں ان کی بہت تعریف کی اور درخواست کی کہ حاکم لاہور کو جو ٹیکس اور تحائف قبائل کی طرف سے سال بہ سال دیا جاتا ہے، وہ حسب سابق ان کو دیا جایا کرے، اس نے سید صاحب سے ان کی یہاں آمد کا مقصد و منشا بھی دریافت کیا، سید صاحب نے

(باقی صـ۱۴۹ کا) جنگ کے خاتمہ کے بعد اس نے فرانس کو خیرباد کہا اور فوجی ملازمت کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا، مصر اور ایران میں بھی اس نے کچھ دنوں قیام کیا، پھر ہرات اور قندھار کے راستے سے ہندوستان آیا، جب مہاراجہ کو اس کی دیانت و امانت، وفاداری اور تجربہ کاری پر اعتماد ہو گیا تو اس نے اپنے لشکر خاص کی ذمہ داری اسکے سپرد کی جو فوجی تربیت اور ہتھیار بندی میں دوسرے تمام لشکروں سے ممتاز تھا، اس نے مہاراجہ کے لئے بڑی خدمات انجام دیں، جس سے اس کی فوقیت اور وفاداری ظاہر ہوئی، مہاراجہ اس کو بڑی عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا، اور اسی لئے اس نے اسکو قسمت لاہور کا حاکم مقرر کیا، شاہی دربار میں اس کی جگہ تیسرے نمبر پر تھی، ۱۸۴۳ء میں رنجیت سنگھ کی موت کے بعد وہ ملازمت سے سبکدوش ہو گیا۔ (تلخیص از کتاب RANJEET SINGH از سر لیپل گریفن صـ۹۷،۹۹)

[1] دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر ایک مضبوط قلعہ اور شہر جو خاوی خاں کے زیر اقتدار تھا۔

اپنے جواب میں اپنی ہجرت اور جہاد کے مقاصد کی وضاحت کی اور اس کو اسلام کی دعوت دی اور یہ لکھا کہ وہ اللہ تعالٰے کے تابعدار بندے ہیں خود ان کو اس معاملہ میں کوئی دخل نہیں ہے، آپ نے اس علاقہ میں سکھوں کے مظالم اور دست درازیوں کا بھی ذکر کیا اور آخر میں لکھا کہ ان کو ان سرداروں سے ایسی درخواست کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، آپ نے یہ خط مولانا خیرالدین شیر کوٹی کے ہاتھ جو اس جماعت میں بہت فہیم و بزرگ سمجھے جاتے تھے، ارسال فرمایا، انھوں نے یہ خط اس کے حوالہ کیا اور اس سے بہت مناسب انداز میں گفتگو کی جس سے ان کی فہم ولیاقت اور حزم و تدبر کا پتہ چلتا ہے۔

اب سید صاحب نے جنگ کی تیاری کا حکم دیا اور ایک دستہ جس میں تین سو سوار تھے، مولانا خیرالدین کی سربراہی میں روانہ کیا اور اس دستہ نے ونیٹورہ کے لشکر کے سامنے ڈیرہ ڈال دیا، دوسری طرف ونیٹورہ کو مسلمانوں کی تیاری کا علم ہوا اللہ تعالٰے نے مجاہدین کی تعداد کو دشمن کی نظر میں زیادہ کر دیا، قریب کے مواضعات اور دیہاتوں سے جو لوگ بھاگ کر پنجتار آگئے تھے، ان کو بھی اس نے مجاہدین میں شامل سمجھا اور اس کو شبخون کا اندیشہ ہوا اس کے دل میں ان کا رعب سما گیا، اور وہ واپس لوٹ گیا اور دریا عبور کر کے پنجاب کے حدود میں داخل ہو گیا۔

اگلے سال یہ قائد لشکر لیکر اپنے مقرر وقت پر پھر پہونچا اور وہاں کے قبائل سے سالانہ ٹیکس اور تحائف طلب کئے اس کا جواب اس کو وہی ملا جو گذشتہ سال ملا تھا، چنانچہ اس نے اپنے لشکر کا رخ پنجتار کی طرف کر دیا، مہاراجہ نے گذشتہ سال واپسی پر اس کو ملامت کی تھی اور اس کو بزدلی اور خوف پر محمول کیا تھا، اس بار اس کی جاہلی حمیت کی رگ پھڑک اٹھی اور اس نے یہ داغ دھونے کا عزم مصمم کر لیا، اس کے لشکریوں کی تعداد دس ہزار تھی اور خادی خاں نے

بھی اس کے ساتھ ساز باز کرلی تھی۔

سید صاحب نے امراء اور قبائل کے سرداروں کو خطوط ارسال کئے اور یہ رائے ظاہر کی کہ دونوں پہاڑوں کے درمیان ایک ایسی دیوار تعمیر کی جائے جس کی چوڑائی چار ہاتھ ہو تا کہ لشکر کا راستہ روکا جا سکے، سارے مجاہدین اور اطراف کے لوگ بہت شوق و ذوق سے اس کام میں لگ گئے اور بہت کم وقت میں اس کو تیار کر دیا، آپ کا خیال ہوا کہ پیچھے کا راستہ بھی بند کر دیا جائے سب مہاجرین اور مجاہدین اس کام میں لگ گئے اور غزوۂ خندق کی یاد تازہ ہو گئی، مہاجرین نے زمین تقسیم کرلی اور اس پشتہ کی تعمیر میں مشغول ہو گئے، سید صاحب نے کھڑے ہو کر ان کے سامنے غزوۂ احزاب کا واقعہ بیان کیا اور ان کو بتایا کہ مسلمانوں نے کس طرح خندق کھودنے کے لئے زمین تقسیم کرلی تھی، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس ان کے ساتھ شریک تھے، اور آپ نے اس پر اجر کثیر اور فتح مبین کی بشارت بھی دی تھی۔

دوسرے روز صبح جب مجاہدین نماز فجر کی تیاری کر رہے تھے، ان کو یہ اطلاع ملی کہ حریف کا گھوڑ سوار دستہ دیوار کی پشت پر پہونچ چکا ہے، یہ اطلاع سن کر سید صاحب اور مجاہدین نماز سے جلد فراغت کر کے اسلحہ بندی اور تیاری میں مشغول ہوئے، اتنے میں صبح ہو گئی دشمن نے دیہاتوں میں آگ لگا دی اور پوری فضائے آسمانی گھنے دھوئیں سے بھر گئی، اس کی آڑ میں اس کے لشکر نے پیشقدمی شروع کی دوسری طرف سید صاحب مجاہدین کے ساتھ آگے بڑھے اور پشتہ کے سامنے رک گئے، اور لشکر کی فوجی اعتبار سے تنظیم کی اور غازیوں کو مختلف جگہوں پر متعین کیا، مولانا محمد اسماعیل صاحب نے بیعت رضوان کی آیات مجاہدین کے سامنے تلاوت کیں، اس کی تشریح کی، اور اس بیعت کے فضائل بیان کئے، لوگوں نے سید صاحب سے از سر نو بیعت کی اور اللہ تعالےٰ سے اس بات کا عہد کیا کہ وہ میدان سے پیچھے نہ ہٹیں گے،

یا فتح ہوگی یا شہادت۔

لوگوں میں ایک نئی زندگی اور جوش پیدا ہوگیا اور مسرت اور شوقِ شہادت کی لہر ان کے اندر دوڑ گئی، سب سے پہلے مولانا محمد اسماعیل صاحب نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اس کے بعد اور لوگ بیعت میں شامل ہوئے، لوگوں کے جوش و مسرت کا یہ عالم تھا کہ لوگ ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے، اس نئے اور اثر انگیز منظر کو دیکھ کر بہت سی آنکھیں اشکبار ہوگئیں، سید صاحب نے اس موقع پر دعا کی اور اپنے ضعف و عجز اور بے بسی و لاچاری اور اللہ تعالےٰ کے سامنے فقر و احتیاج کا دل کھول کر اظہار کیا، لوگوں پر ایک بیخودی کی کیفیت طاری تھی، کسی کو کسی بات کا ہوش نہ تھا، رحمت و سکینت اور شوق شہادت نے پوری فضا کو متاثر کر رکھا تھا، لوگوں نے ایک دوسرے سے غلطیاں معاف کرائیں گلے ملے اور رخصت ہوئے کہ اگر زندہ رہے تو دنیا میں ورنہ انشاء اللہ جنت میں ملاقات ہوگی، لوگوں نے ایک دوسرے کو وصیت کی کہ اگر کوئی شہید ہو تو اس کو اٹھانے کے بجائے آگے بڑھیں، اور دشمن کا مردانہ وار مقابلہ کریں۔

سید صاحب نے جنگی پوشاک پہنی اور مسلح ہوکر پشتہ کی طرف بڑھے، آپ کے ساتھ کم و بیش آٹھ ہزار ہندوستانی اور قندھاری مجاہد تھے، آپ نے ان سے فرمایا کہ جلدی نہ کریں اور جب تک وہ فائر نہ کریں، اس وقت تک کوئی فائر نہ کرے اور نہ پشتہ کو پار کرنے کی کوشش کرے، آپ نے یہ بھی حکم دیا کہ مجاہدین سورۂ قریش کا زیادہ سے زیادہ ورد رکھیں پھر آپ خاموش ہوکر متوجہ الی اللہ ہوگئے، لشکر میں جھنڈے نصب کئے گئے ایک جھنڈا ایک عرب شیخ محمد کے ہاتھ میں بھی تھا جو حج سے واپسی پر آپ کے ساتھ ہوگئے تھے، اور بڑے مخلصین میں سے تھے۔

ونٹورہ نے ایک ٹیلہ پر چڑھ کر حاضری کھائی اور اس کے بعد دوربین لگا کر میدان جنگ کو دیکھنے لگا، اس نے دیکھا کہ مجاہدین کے لشکروں سے پورا میدان بھرا ہوا ہے، یہ دیکھ کر

اس پر ایک ہیبت طاری ہوئی اور وہ خاوی خاں کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا کہ آپ نے ہمارے ساتھ دھوکہ کیا اور مجاہدین کی طاقت اور تعداد کو کم کر کے دکھایا، اب پیادوں اور سواروں کے اس لشکر جرار کو دیکھئے اور ان جھنڈوں کو دیکھئے جو ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں، پھر اپنے ساتھیوں کو لے کر وہ نیچے اترا اور دیوار کے سامنے رک گیا اتنے میں سکھوں نے دیوار گرانی شروع کی، سید صاحب کا اشارہ پاتے ہی مجاہدین نے حملہ کر دیا اور فائرنگ شروع کر دی ونٹورہ کو یقین ہو گیا کہ شکست ہونا ہے، اس لئے اس نے اپنے لشکر کو واپسی کا حکم دے دیا مجاہدین نے پنجتار کے آگے تک لشکر کا تعاقب کیا مجاہدین کی تعداد درحقیقت اتنی نہ تھی جتنی ونٹورہ نے محسوس کیا تھا یہ صرف اللہ تعالےٰ کی مدد اور نصرت تھی وہ جس وقت اور جس طرح چاہتا ہے، آسمان و زمین کے لشکروں سے کام لے لیتا ہے۔

جب ونٹورہ کی پسپائی مکمل ہو گئی تو مجاہدین خدا کا شکر بجالائے، پنجتار کے اسی نالہ کے کنارے وضو کیا اور دوگانہ شکر ادا کیا۔

وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ۔ (احزاب - ۲۵) اور جنگ میں اللہ تعالےٰ مسلمانوں کیلئے آپ ہی کافی ہوگیا

ایک تجربہ کار فرانسیسی جرنیل کی میدان جنگ سے اس طرح پسپائی جو اکثر معرکوں میں کامیاب رہا اور مرکز مجاہدین سے اس کا اس طرح فرار ایک ایسا واقعہ تھا جس کی صدائے بازگشت دُور دُور تک سنی گئی اور دیہاتوں اور شہروں ہر جگہ یہی موضوع سخن بن گیا، چنانچہ اوائل ذی الحجہ ۱۲۴۴ھ میں مختلف قبائل کے مسلمان مرکز پہونچے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی اور نظام شریعت کو قبول کیا، ستمہ میں ایک مضبوط قلعہ تھا، جو امان زئی کہلاتا تھا، اس میں تقریباً بارہ ہزار افغانی رہتے تھے، جن کا مشغلہ ہی لڑنا اور مرنا مارنا تھا، ان سب نے بھی سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی اور ادائگی عشر کا وعدہ کیا، ایک دوسرے قبیلہ کے

سردار مقرب خاں کی وفاداری بھی کھری ثابت ہوئی مشرکین پر جزیہ عائد کیا گیا اور مسلمانوں پر عُشر۔

لیکن خادی خاں حاکم ہنڈ بدستور اپنی انانیت اور عناد پر قائم رہا، اور اس نے اپنی قسمت دشمنانِ دین سے وابستہ کرلی، بعد میں پتہ چلا کہ وینٹورہ کو حملہ کرنے پر اسی نے اکسایا تھا، اور معاملہ کو بالکل ہلکا کر کے پیش کیا تھا اسی نے اس کو لالچ دلائی اپنے تمام وسائل سے اس کی مدد کی اور اس کا پورا خیر خواہ بن گیا، اس کا اسی طرح باقی رہنا اور اس سے چشم پوشی کرنا مسلمانوں کی مصلحت کے خلاف تھا، اور اس سے نظام شرعی کا رعب و دبدبہ ختم ہوتا تھا اور منافقین کو بغاوت کرنے اور سر اٹھانے کی شہ ملتی تھی، اس لئے لشکر مجاہدین کے سمجھ دار لوگوں بالخصوص مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی یہ رائے ہوئی کہ ان لوگوں کی تادیب اور اتمام حجت ضروری ہے، اور اگر وہ انکار کریں تو اس شر سے بچنے کا ضروری انتظام کرنا چاہیئے، انھوں نے اس آیت سے استدلال کیا۔

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ
اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا ۚ فَإِنْ بَغَتْ
إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي
تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ ۚ فَإِنْ
فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ
وَأَقْسِطُوا ۖ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝
(الحجرات - ٩)

اور اگر مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان اصلاح کر دو پھر اگر ان میں کا ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو جاوے پھر اگر رجوع ہو جائے تو ان دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ اصلاح کر دو اور انصاف کا خیال رکھو بیشک اللہ انصاف والوں کو پسند کرتا ہے،

مولانا محمد اسماعیل صاحب دو سو مجاہدین کو لے کر خاوی خاں کے مقابلہ پر آئے اور اس سے بہت نرمی سے گفتگو کی اور بہت دیر تک نصیحت کرتے رہے، اور بغاوت و نافرمانی، عہد توڑنے اور امام کی اطاعت سے سرکشی کے نتائجِ بد سے آگاہ کرتے رہے، لیکن ان میں سے کسی بات کا بھی اس پر اثر نہ پڑا، خاوی خاں نے یہ سن کر کہا کہ: خفا نہ ہونا، ہم لوگ رئیس اور حاکم ہیں، سید بادشاہ کی طرح ملا مولوی نہیں ہیں، ہماری شریعت جدا ہے، ان کی جدا، ان کی شریعت پر ہم پٹھان لوگ کب چل سکتے ہیں، بار بار سید بادشاہ ہمارے پیچھے کیوں پڑتے ہیں، ہمارے حق میں ان سے جو کچھ ہو سکے وہ در گزر نہ کریں۔

جب گفتگو منقطع ہو گئی امید باقی نہ رہی کہ وہ راہ راست پر آئے گا، اور اللہ و رسول کی اطاعت اور احکام شریعت قبول کرے گا تو اہل الرائے اس نتیجہ پر پہونچے کہ اس کی تادیب اور سزا ضروری ہے، چنانچہ معاملہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب ہی کے حوالہ کیا گیا، اس لئے کہ کوئی دوسرا لشکر مجاہدین میں ان کے مرتبہ کا نہ تھا بلکہ سید صاحب کے خواص میں بھی شجاعت و دور اندیشی، سیاسی بصیرت اور قائدانہ صلاحیت میں کوئی ان کا ہم پلہ نہ تھا۔

مولانا محمد اسماعیل صاحب پانچ سو چیدہ مجاہدین کے ساتھ جو بہت چست و چالاک اور بہادر تھے ہنڈ کی طرف روانہ ہوئے اور صبح کی پو پھٹتے وقت قلعہ میں داخل ہو گئے۔

خاوی خاں اس اچانک حملہ سے بوکھلا گیا، اور مجاہدین کے ہاتھوں مارا گیا، اور اسلامی لشکر اس مضبوط اور قلعہ بند شہر پر قابض ہو گیا جو ایک فصیل سے گھرا ہوا تھا، اور جس میں غلہ اور اسلحہ کا بڑا ذخیرہ موجود تھا، اس چھاپہ میں صرف خاوی خاں اور ایک کسان مارا گیا مجاہدین میں کسی ایک کے خراش بھی نہ آئی غرض یہ معاملہ امن کے ساتھ سر ہوا، اور مجاہدین کو ایک بڑے فتنہ سے جس نے ان کی یکسوئی و دلجمعی کو ختم کر رکھا تھا، اور ان کی قوت کو عرصۂ دراز سے کمزور کر دیا تھا، نجات ملی۔

اب یار محمد خاں کی باری تھی، جو اس فتنہ کا سرغنہ تھا، اور مجاہدین کے خلاف برابر سازشیں کرتا رہتا، اور ہوا کا رخ دیکھتا رہتا تھا، اس نے اپنے تخریبی مقاصد کی تکمیل کے لئے سید صاحب کی جان لینے کی سازش کی اور سکھوں کے ساتھ مِل کر ان کو اس پر آمادہ کیا کہ ہنڈ میں مجاہدین کی سرکوبی کے لئے حکومت لاہور اپنا لشکر بھیجے اور خاوی خاں کی جگہ امیر خاں کو وہاں کا حاکم بنائے، اس نے اپنے لشکر کو امیر خاں کے مرکز ہریانہ میں اتارا، اس کے ساتھ چھ توپیں اور ہاتھیوں اور اُونٹوں کی ایک بڑی تعداد اور بہت بڑا لشکر تھا، ہریانہ پہونچتے ہی اس نے توپیں چلانی شروع کیں تاکہ مقامی باشندوں کے دلوں پر جو توپوں کی آواز سے بہت ڈرتے تھے، اس کا رعب بیٹھ جائے، بہت سے مذبذب اور منافق قسم کے لوگ اس کے ساتھ شامل ہو گئے، اور انھوں نے دیہاتوں کو لوٹنا اور کھیتوں کو برباد کرنا شروع کیا اور اطراف و جوانب میں دہشت پھیلا دی، دونوں لشکروں میں چھوٹی موٹی جھڑپیں بھی ہوتی رہیں، لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

اس پریشانی میں سید صاحب اور یار محمد خاں میں کئی بار سلسلہ جنبانی قائم ہوا، اور سید صاحب نے اس کو بہت سمجھایا بجھایا، خدا کی یاد دلائی اور بغاوت و سرکشی کے انجام سے آگاہ کیا، لیکن یار محمد خاں نے صلح کے پیغام کو بہت غرور اور انانیت کے ساتھ سنا اور اس کو مکمل طور پر رد کر دیا۔

اب مجاہدین بھی جنگ پر مجبور ہوئے اور راتوں رات ایک لشکر لے کر جس کی تعداد پیادے اور سوار ملا کر آٹھ سو سے زیادہ نہ تھی، یار محمد خاں کے قریب پہونچ گئے، اس لشکر کی قیادت مولانا محمد اسماعیل صاحب کے ہاتھ میں تھی، یہ معرکہ زیدہ میں پیش آیا، مجاہدین غیر معمولی جرأت کے ساتھ آگے بڑھے اور نعرۂ تکبیر بلند کیا اور ایک ٹکڑی نے تیزی سے آگے بڑھ کر سب سے پہلے

دشمن کی توپوں پر قبضہ کیا یہ دیکھ کر درانیوں کے قدم اکھڑ گئے اور وہ اپنا سب سازو سامان میدان میں چھوڑ کر بھاگے یہاں تک کہ گھبراہٹ میں اپنے جوتے پہننا بھی بھول گئے، جب مجاہدین وہاں پہونچے تو ان کو بہت سے جوتے جو درانی خوف ودہشت سے چھوڑ گئے تھے، دستیاب ہوئے، دیگچیاں چولھے پر تھیں اور کھانا تیار ہونے کے قریب تھا لیکن عجلت اور گھبراہٹ میں ان کو کھانے کا موقع نہ مل سکا، یار محمد خاں اس لڑائی میں سخت زخمی ہوا اور جس جگہ وہ لیجایا جارہا تھا، وہاں پہونچنے سے پہلے ہی ختم ہوگیا، مسلمانوں کو بہت مال غنیمت ہاتھ لگا اور بہت اسلحہ ان کے قبضہ میں آئے، کچھ لڑکیاں بھی ملیں جن کو درانیوں نے قریب کے دیہاتوں سے اغوا کیا تھا، مولانا محمد اسماعیل صاحب نے ان کو ان کے گھروں تک پہونچوا دیا۔

سید صاحب پنجتار فتحیاب ہو کر واپس آئے اور اس فتح پر خدا کا شکر بجا لائے، لوگ ان کو تہنیت پیش کرنے کے لئے جمع ہونے لگے، مبارکباد اور خدا کے شکر سے پوری فضا گونج رہی تھی، سید صاحب نے کھڑے ہو کر مالِ غنیمت کی چوری کی مذمت میں تقریر کی اور اس کے لئے جو وعیدیں آئی ہیں ان سے آگاہ کیا اور یہ بتایا کہ اس سے دین کو اور مسلمانوں کے مصالح کو کتنا نقصان پہونچتا ہے، اور اعمال صالحہ اور جہاد کا اجر اس سے کس طرح رائیگاں ہوتا ہے، آپ کی اس تقریر کا مقامی لوگوں پر بہت اثر پڑا اور انھوں نے میدان جنگ میں جو کچھ لوٹا تھا اور جو بیت المال کا حق تھا وہ مسجد میں لا کر ڈھیر کر دیا، اس میں پانچ سو گھوڑے اور بہت سے خیمے اور شامیانے وغیرہ تھے، اس کا خمس اللہ کی راہ میں خرچ کیا گیا اور غنیمت مجاہدین میں اللہ ورسول کے حکم اور قرآن وسنت کے اصول پر تقسیم کردی گئی، پیادے کو ایک حصہ اور سوار کو دو حصے دیئے گئے، جب مجاہدین کو مال غنیمت میں ان کا حصہ پہونچ گیا تو انھوں نے کہا کہ ہم کو راشن بیت المال سے ملتا ہے، اور ہماری ضرورت وہاں سے پوری ہوتی ہے، اس لئے

ہم کو یہ حصے لینے کا کوئی حق نہیں، اور یہ سب بیت المال میں جانا چاہئے، سید صاحب نے یہ سنا تو فرمایا کہ یہ تمہارا حق اور تمہاری ملکیت ہے، اس میں جس طرح چاہو، تصرف کر سکتے ہو یہ سن کر اکثر لوگوں نے اپنا حصہ بیت المال کو دے دیا اور جو ضرورت مند تھا، اس نے اس سے خود فائدہ اٹھایا۔

اس فتح کا وہاں کے لوگوں پر بڑا اثر پڑا اور وہ راستے جو مجاہدین کے لئے مسدود تھے، کھل گئے، اور مجاہدین و مہاجرین کے قافلے بے روک ٹوک ہندوستان سے آنے لگے ... اور جو امداد و رقومات وہ ہندوستان سے یہاں پہونچانا چاہتے تھے، بحفاظت پہونچنا شروع ہو گئیں اور اسلام کی شوکت و عظمت اور رعب و دبدبہ ہر طرف نظر آنے لگا۔

خاوی خاں کا بھائی امیر خاں زمین جائداد کے جھگڑے میں اپنے بعض مخالفین کے ہاتھوں جن سے اس کی دیرینہ دشمنی تھی قتل ہوا، دعوت وجہاد کے لئے فضا صاف ہو گئی اور راہِ حق کی دشواریاں اور رکاوٹیں بڑی حد تک دُور ہو گئیں اور بدکردار اپنے انجام بد کو پہونچ گئے اور اللہ تعالےٰ کا یہ فرمان حرف بحرف سچ ثابت ہوا کہ۔

وَلَا یَحِیْقُ الْمَکْرُ السَّیِّئُ اِلَّا بِاَھْلِہٖ۔ (سورۂ فاطر-۴۳)

بُرے مکر اور تدبیر کا نتیجہ ان ہی مکر والوں پر الٹ پڑتا ہے۔

عہد کے سچے بات کے پکے

اب مجاہدین ان سرداران قبائل (جو مجاہدین سے برسرپیکار تھے) یا ان کی منافقت

ظاہر ہو چکی تھی، اور انھوں نے دشمنوں سے ساز باز کر رکھا تھا) کے متعدد فوجی مرکزوں اور اہم اڈوں پر قابض ہو چکے تھے، ان مرکزوں میں سب سے زیادہ اہم عشرہ اور امب کے مرکز تھے، جہاں پائندہ خاں کی حکمرانی تھی، چھتربائی بھی ان کی دستبرد سے محفوظ تھا۔

پھلڑہ[1] میں ایک بڑا معرکہ مجاہدین اور سکھوں کے درمیان پیش آیا اور سخت جنگ ہوئی اسی معرکہ میں سید صاحب کے بھانجہ سید احمد علی بھی شہید ہوئے انھوں نے بہت جوانمردی کا ثبوت دیا اور پہاڑ کی طرح اپنی جگہ جمے رہے، ان کی اس ثابت قدمی اور قربانی نے غزوہ موتہ کی یاد تازہ کر دی، اس معرکہ میں انھوں نے سیدنا جعفر بن ابی طالب کی تقلید کی جب ان کی بندوق نے کام کرنا چھوڑ دیا تو وہ اس کے کندے سے لڑتے رہے یہاں تک کہ وقت شہادت آپہونچا، اس معرکہ میں مجاہدین کو اپنے جوہر دکھانے اور مردانگی کا ثبوت دینے کا خوب موقع ملا اور ہر ایک مردانہ وار بہادروں کی طرح لڑا اور پہاڑوں کی طرح اپنی جگہ ڈٹا رہا۔

ان نوجوانوں میں میر احمد علی بہاری بھی تھے، جو بندوق سر کرنے اور نشانہ بازی کے اتنے ماہر تھے، کہ تیلی پر نشانہ لگائیں تو خطا نہ ہو، ان کی گولیوں سے دشمن کے سوار بڑی تعداد میں مارے گئے، ان کو دشمنوں نے اپنے گھیرے میں لے لیا، اور بڑے بڑے شہ سواروں اور جنگ جو نوجوانوں نے ان کے اردگرد گویا ایک جال سا بنا دیا، بہادر اور شیر دل جوان نے ان سب کو للکارا اور کہا کہ تمھیں تمہارے خدا کا واسطہ کوئی مجھ پر گولی نہ چلائے پہلے خدا کے لئے ذرا میرے ہاتھ دیکھ لو میری شمشیر زنی اور شجاعت کی داد دے لو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس جال سے باہر ہونے کی کوشش نہ کروں گا، پھر وہ تلوار سے اس طرح کھیلنے لگے جیسے یہ میدان جنگ نہیں،

---

[1] پھلڑہ مانسہرہ سے دس میل کے فاصلہ پر ہے اور پہاڑوں کے درمیان ایک آباد موضع ہے جس میں نہر سرن بہتی ہے

کھیل کا میدان ہو اور قربانی کا نہیں کسی فن کا مظاہرہ ہو، انھوں نے اپنے کمال فن سے سب کو حیرت میں ڈال دیا، سر اور شانے اور کلائیاں کٹ کٹ کر چاروں طرف گر رہے تھے، آخر کار ایک دشمن نے ان پر گولی چلادی اور وہ شہادت سے سرفراز ہوئے۔

جب سید صاحب کو اپنے بھانجے سید احمد علی کی خبر شہادت ملی تو آپ نے فرمایا، الحمدللہ اس کے بعد آپ نے دیر تک سکوت فرمایا، جب راوی نے آپ کو یہ بتایا کہ جتنے زخم لگے وہ سب ان کے چہرے پر آئے تو آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے آپ دونوں ہاتھوں سے آنسو پونچھتے جاتے تھے، اور الحمدللہ الحمدللہ فرماتے جاتے تھے، بے شک اللہ تعالےٰ کا ارشاد بالکل حق اور سچ ہے۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا (سورہ احزاب۔ ۲۳)

ان مومنین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انھوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اس میں سچے اترے پھر بعضے تو ان میں وہ ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے اور بعضے ان میں مشتاق ہیں اور انھوں نے ذرا تغیر و تبدل نہیں کیا۔

کہ عنقا را بلند است آشیانہ

دریائے سندھ کے اس کنارے پر مجاہدین کی سرگرمیوں نے حکومت لاہور کی نیند حرام کر دی تھی، اور اس کو ان سے مستقل تشویش اور پریشانی لاحق ہو گئی تھی، رنجیت سنگھ ان فوجی قائدین

میں سے تھا جن کا عقیدہ تھا کہ چنگاری کو کبھی حقیر نہ سمجھنا چاہیئے، خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی اور کمزور ہو، وہ سمجھتا تھا کہ اس تحریک جہاد کے قائد سے مفاہمت کا دروازہ اب بھی کھلا ہوا ہے، اور اس خطرہ اور اندیشہ سے نجات حاصل کرنا ممکن ہے، اس کے دل میں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ وہ ایک طالع آزما اور جنگ جو شخص ہیں اور کچھ آراضی اور جاگیر دے کر ان کو خوش کیا جا سکتا ہے، اس کو اپنی زندگی میں ایسے بہت سے امراء و اشراف اور سرداران قبائل اور علماء و مشائخ کا تجربہ ہوا تھا، جنھوں نے بہت زور شور سے علم جہاد بلند کیا اور اپنے گرد بہت سے جنگ جو اور عہدہ و منصب کے طلب گار جمع کر لئے لیکن آخر میں کسی جاگیر اور زمین جائداد پر قناعت کر کے بیٹھ رہے یا حکومت نے ان کے لئے کوئی وظیفہ مقرر کر دیا اور ان کی طرف سے بے فکر ہو گئی۔

رنجیت سنگھ نے یہی طریقہ امیر مجاہدین پر آزمانا چاہا اور یہ فیصلہ کیا کہ ان سے مول تول کیا جائے، اور ضرورت ہو تو قیمت بھی بڑھا دی جائے تاکہ یہ چنگاری بھڑک کر سرحد و افغانستان کو اپنے لپیٹ میں نہ لے لے اور ان قبائل میں روح جہاد نہ پیدا کر دے، اور اس کے تخت و تاج کو خطرہ لاحق ہو جائے، اس مقصد سے حکومت لاہور نے ایک موقر وفد حکیم عزیز الدین کی سربراہی میں بھیجا، حکیم صاحب حکومت کے مشیر خصوصی، رکن رکین تھے، اور بہت سیاسی بصیرت کے حامل اور حکومت کے خیر خواہ تھے، مہاراجہ کو ان کے خلوص اور عقل و ذہانت پر بڑا اعتماد تھا، ان کی مدد کے لئے اس نے ونٹورہ کو بھی بھیجا، اور ان دونوں کو ہدایت کی کہ وہ سید صاحب سے گفتگو کر کے ان کو مطمئن کرنے کی کوشش کریں، حکیم عزیز الدین صاحب کے ساتھ مہاراجہ کا ایک خط بھی تھا، جس میں اس نے بہت ملاطفت اور نرمی کا اسلوب اختیار کیا تھا، سید صاحب کی بہت تعریف کی تھی، اور ان کی دینی و روحانی منزلت کا اعتراف کیا تھا، اور یہ لکھا تھا کہ اگر وہ ملک چاہتے ہیں، تو مہاراجہ دریائے سندھ کے اس پار کا سارا علاقہ ان کو دینے کو تیار ہیں

وہ جیسے چاہیں اس میں تصرف کر سکتے ہیں، اس صورت میں مہاراجہ ان سے سالانہ ٹیکس بھی وصول نہ کرے گا، سید صاحب اپنی جگہ پر ذکر و عبادت میں مشغول رہیں، اور جنگ و جدال، اور قبائلی جھگڑوں سے کنارہ کش ہو جائیں اور جہاد و غزا کا خیال ترک کر دیں یا مہاراجہ کے ساتھ مل جائیں اس شکل میں ان کو مہاراجہ کے لشکر کا سپہ سالار مقرر کر دیا جائے گا۔

سید صاحب نے اس سفارت کا بہت کشادہ دلی اور خوش اخلاقی اور بہت سکون و تحمل کے ساتھ استقبال کیا اور اس کے مسلمان سفیر کے سامنے ہجرت و جہاد کے اغراض و مقاصد اور ان محرکات و عوامل سے آگاہ کیا جو ان کو ایسے دور دراز علاقہ میں کھینچ کر لائے ہیں اور اس مضبوط و طاقتور حکومت کے مقابلہ پر لا کھڑا کیا ہے۔

مسلمان سفیر سید صاحب کی اس زبان کو سمجھتے تھے، اور ان کو اس ایمانی اسپرٹ کا اندازہ تھا جو اس غیور مومن کے دل میں موجزن تھی، اور اس پوری گفتگو پر سایہ فگن تھی، اپنے طویل تجربہ، غیر معمولی ذہانت، وسیع علم اور مختلف طبقات سے واقفیت کی بنا پر ان کو اس کا اندازہ تھا کہ وہ کسی اور مٹی کے بنے ہوئے ہیں، اور ان کو عام سپہ سالاروں، جنگ بازوں اور سودے بازی کرنے والوں کے پیمانہ سے نہیں ناپا جا سکتا، جو جہاد و قتال کو صرف کرسی اقتدار اور حصول مال و منال کا ذریعہ اور پل بناتے ہیں، انھوں نے محسوس کیا کہ کوئی ایمانی کرنٹ ان کے دل کو چھو رہا ہے، اور ان کے جسم اور اعصاب میں سرایت کر گیا ہے، سید صاحب کی قوت ایمانی اور اعتماد و یقین نے ان کو ہلا کر رکھ دیا۔

سید صاحب نے ان سے فرمایا کہ:-

"ہم جو مسلمانوں کے اس ملک میں اتنے لوگوں کے ساتھ آئے ہیں، تو نہ کسی کی ریاست چھیننے کی غرض سے آئے ہیں، نہ ملک گیری کے شوق میں، ہم تو محض جہاد فی سبیل اللہ اور

اعلاء کلمۃ اللہ کے واسطے آئے ہیں، اور جو رنجیت سنگھ اتنے ملک دینے کا لالچ دیتا ہے، اگر وہ اپنا تمام ملک دے تب بھی ہم کو غرض نہیں ہے، البتہ اگر وہ مسلمان ہوجائے تو ہمارا بھائی ہے، اللہ کی تائید سے جو ملک ہمارے ہاتھ لگے ہیں، ہم اس کو دے دیں اور جو اس کا ملک ہے وہ بھی اس کے پاس ہے

حکیم صاحب نے کہا ہم غائبانہ آپ کا جو حال لوگوں سے سنتے تھے، اس سے زیادہ ہم نے آپ کو پایا آپ کا دعویٰ سچا ہے، سوائے "آمنا وسلمنا" کے ہمارے پاس کوئی جواب نہیں، سید صاحب نے حکیم صاحب کو بہت خاطر داری اور عزت و توقیر سے اپنے یہاں اُتارا اور مہمانی کی، آپ کے لشکر میں ڈوگروں کا ایک جمعدار رنجیت سنگھ یہاں سے کسی امر میں ناخوش ہو کر چلا آیا تھا، آپ نے اس کو اور پچاس ساٹھ اس کے ساتھ کے ڈوگروں کو نوکر رکھ لیا تھا، اس کے نام کا بھی مہاراجہ کا ایک پروانہ حکیم صاحب لائے تھے کہ اپنے لوگوں کے ساتھ ہمارے یہاں چلا آئے حکیم صاحب نے وہ پروانہ اس جمعدار کو دیا، اور اپنے ساتھ لے جانا چاہا اس نے آکر یہ حال حضرت سے عرض کیا آپ نے فرمایا تم کو اختیار ہے چلے جاؤ، جو کچھ اس جمعدار اور اس کے ساتھیوں کی تنخواہ چڑھی تھی، آپ نے سب اپنے یہاں سے دلوادی، حکیم عزیز الدین صاحب رخصت ہونے لگے تو آپ نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے نام دعوت اسلام کا مضمون جو حکیم عزیز الدین صاحب سے زبانی فرمایا تھا لکھوا دیا۔

دوسری طرف جنرل ونٹورہ ایک بڑے لشکر کے ساتھ (جو بارہ ہزار سواروں اور پیادوں پر مشتمل تھا) پشاور کے قریب دریائے لنڈے کے کنارے آکر ٹھہر گیا، اور یہ خواہش ظاہر کی کہ لشکر مجاہدین میں کسی سمجھدار آدمی کو ملاقات کے لئے بھیجا جائے تاکہ اس مسئلہ پر گفتگو کرلی جائے، سید صاحب نے اس کے لئے مولانا خیر الدین شیر کوٹی کا انتخاب کیا جو لشکر میں بہت فہیم و زیرک سمجھے جاتے تھے، اور بہت صائب الرائے، حاضر جواب اور اچھی گفتگو کرنے والے تھے،

سید صاحب ان کے مداح اور معترف تھے، اور ان پر پورا اعتماد کرتے تھے۔

مولانا خیر الدین شیرکوٹی نے فرانسیسی جنرل سے ہتھیار سے لیس ہو کر اس کے خیمہ میں ملاقات کی۔

انھوں نے دیکھا کہ دونوں ولایتی افسر (ونٹورہ اور ایلارڈ) اپنی کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں، ایک چھوٹی میز ان کے سامنے رکھی ہے، ان کی کرسیوں کے علاوہ اور کوئی کرسی خیمے میں نہیں ہے البتہ ایک عمدہ اور بہت بڑا قالین میز کے نیچے بچھا ہوا ہے، حاجی بہادر شاہ خاں "السلام علیٰ من اتبع الھدیٰ" کہتے ہوئے داخل ہوئے، اور میز کے قریب بیٹھ گئے وزیر سنگھ خیمے کے دروازے پر رہا اس وقت ونٹورا نے اخبار نویس اور حکیم عزیز الدین کو بھی بلا کر وکیلوں کے پاس بٹھایا۔

ونٹورا نے سفراء سے خطاب کر کے پوچھا کہ آپ میں مولوی کون ہے؟ حاجی صاحب نے مولوی خیر الدین کی طرف اشارہ کیا، ونٹورا جوان آدمی تھا، اور فارسی پر خوب قدرت رکھتا تھا اس نے کہا کہ میں آپ سے کچھ علمی گفتگو کرنا چاہتا ہوں، مولوی خیر الدین صاحب نے فرمایا کہ اگر گفتگو دینی امور و مسائل میں ہوگی تو صاف اور تلخ جواب سے آزردہ اور برافروختہ نہ ہوں، ورنہ ایسی گفتگو کی ضرورت نہیں، ونٹورا نے کہا جو کچھ آپ کے دل میں آئے بے تکلف کہئے میں بُرا نہ مانوں گا لیکن جواب عالمانہ ہونا چاہیے، اس لئے کہ میں آپ کے دین سے واقف ہوں خاص طور پر میں نے آپ کی تاریخ اور دینیات کی کتابیں بہت پڑھی ہیں دوسرا ولایتی افسر (الارڈ) جو معمر تھا، کم گو اور خاموش تھا۔

ونٹورا نے گفتگو شروع کی اور کہا کہ جس زمانہ میں ہمارا ڈیرہ حضرو میں تھا، اس زمانہ میں ایک فقیر صورت شخص خلیفہ صاحب کی طرف سے ہم سے ملا تھا، اس نے کہا تھا کہ اگر سرکار

خالصہ (مہاراجہ) ملک یوسف زئی کا مالیہ ہماری معرفت وصول کر لیا کرے تو سرکار کو فوج کشی کی تکلیف اور زیر باری سے چھٹی مل جائے اور علاقے کے لوگ سال بہ سال تاخت و تاراج ہونے اور ویرانی اور آتش زنی کی مصیبت سے بچ جائیں، ہم کو یہ بات معقول معلوم ہوئی اس لئے کہ اس میں فریقین کا فائدہ ہے، سرکار کو سرگردانی اور رعیت کو پریشانی سے ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے گی میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ یہ بات صحیح ہے؟

مولوی خیر الدین صاحب نے فرمایا کہ یہ بات محض دروغ اور بے اصل ہے، اس دروغ گو نے محض اپنی جان بچانے کے لئے آپ سے یہ بات بنائی، خلیفہ صاحب کو کفار کی اطاعت اور ان کو مالیہ دینے سے کیا سروکار؟ اس لئے کہ وہ اس علاقہ دور دراز میں ملک و جاگیر کے حصول کے لئے نہیں آئے۔

ونٹورا نے کہا اچھا اگر ان کو کسی قسم کی طمع نہیں ہے تو اس بے سروسامانی کے ساتھ ایک ایسی ہستی سے کیوں برسر جنگ ہیں جو خزانوں دفتروں اور فوج اور لشکروں کی مالک ہے؟

مولوی صاحب نے فرمایا کہ آپ نے سنا ہوگا کہ خلیفہ صاحب ہندوستان میں صاحبِ وجاہت و عزت ہیں، لاکھوں آدمی بڑے فخر و مسرت کے ساتھ آپ کے سلسلۂ بیعت میں داخل ہیں، آپ وہاں امراءِ عالی مقام کی طرح عیش و آرام کے ساتھ زندگی گزار سکتے تھے، آپ کو ترکِ وطن اور کوہ گردی کی ضرورت نہ تھی۔

ونٹورا نے کہا کہ ہاں مجھے معلوم ہے کہ خلیفہ صاحب کو یہ سب عیش و عزت اپنے مقام پر بھی حاصل تھی، اور وہاں کے اہلِ حکومت آپ کی بڑی عزت و توقیر کرتے تھے، مولوی صاحب نے فرمایا کہ ایسی دولت و عزت کو خیر باد کہہ کے سفر کی صعوبتیں اور وطن کی مفارقت اور ایک امید موہوم کے پیچھے دن رات کوہستان میں مشقت کا اختیار کرنا اور بے سروسامانی کے باوجود ایک

طاقتور دشمن کے مقابلہ کا عزم رکھنا جو ملک و افواج کا مالک ہے، کون دانشمند روا رکھتا ہے؟

اب آپ متوجہ ہو کر سنئے کہ اس کا سبب یہ ہے کہ آپ کو معلوم ہے کہ دین اسلام میں پانچ احکام فرض کا درجہ رکھتے ہیں، جن کی ادائیگی کی خداوند عالم کی طرف سے تاکید شدید ہے، اور وہ نماز روزہ زکوٰۃ حج اور جہاد ہے، نماز ہر مسلمان پر فرض ہے، غنی ہو یا فقیر، اسی طرح روزہ، البتہ زکوٰۃ غنی پر فرض ہے، سال گزر جانے پر وہ اپنے مال کا چالیسواں حصہ راہِ خدا میں نکالتا ہے، ان تینوں سے مشکل تر حج کا فریضہ ہے، وہ اگرچہ عمر بھر میں غنی پر ایک بار ہی فرض ہے، لیکن چونکہ اس کے لئے اکثر سمندر کا سفر کرنا اور اپنے کو خطرات میں ڈالنا اور اپنے خاندان و خانماں سے جدا ہونا ضروری ہوتا ہے، اور بھی بہت سی مشقتیں اس سے وابستہ ہیں، اس لئے اکثر مالدار دنیا طلب اس فریضہ کی ادائیگی میں سستی سے کام لیتے ہیں، اور اس سعادت سے محروم رہتے ہیں، اس سلسلہ میں آپ نے سنا ہوگا کہ سید صاحب نے بے سروسامانی کے باوجود سیکڑوں آدمیوں کی معیت میں حج کیا، اور اس میں ہزاروں روپے صرف ہوئے کہ کسی امیر کبیر کو بھی اس عالی حوصلگی اور دریا دلی کے ساتھ حج کرنے اور کرانے کی توفیق نہیں ہوئی، فرض و نٹورا نے کہا کہ آپ سچ کہتے ہیں کہ اس شان کے ساتھ اس زمانہ میں کسی نے حج نہیں کیا۔

مولوی صاحب نے کہا جہاد کی عبادت حج سے بھی دشوار تر ہے، وہ دولت کی کثرت اور فراوانی پر بھی موقوف نہیں، وہ محض توفیق الٰہی پر منحصر ہے، اللہ تعالےٰ محض اپنے فضل سے کسی کو اس سعادت کے لئے انتخاب فرمالیتا ہے، انھیں مشکلات و خصوصیات کی بنا پر اس عبادت کا ثواب دوسری عبادت کے مقابلہ میں زیادہ ہے، اس لئے کہ اس عبادت میں جان و مال اور اہل و عیال سے دست بردار ہونا پڑتا ہے، یہ بھی یاد رہے کہ یہ جہاد محض ہمارے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم ہی پر فرض نہیں تھا، بلکہ حضرت ابراہیم و موسیٰ و داؤد علیہم السلام

پر بھی فرض تھا، آپ کو خود تاریخ کی کتابوں سے یہ بات معلوم ہوئی ہوگی، وینٹورا نے کہا جی ہاں، مولوی صاحب نے فرمایا کہ سید صاحب عنایت الٰہی سے مقبول بارگاہ اور صاحب ارادہ و عالی ہمت بزرگ ہیں، انھوں نے اس فریضہ کی ادائیگی کا تہیہ کیا اس کی ادائیگی کی دو شرطیں ہیں، ایک یہ کہ جماعت مجاہدین کا کوئی امیر یا امام ہو جس کی ماتحتی میں شرعی طریقہ پر جہاد کیا جائے دوسرے یہ کہ کوئی دارالامن ہو، جہاں سے اس فریضہ کی ابتدا کی جائے ہندوستان میں کوئی دارالامن نہیں ہے، وہاں یہ معلوم ہوا کہ یوسف زئی سکھوں کے ساتھ جہاد کرتے رہتے ہیں، لیکن ان کا کوئی شرعی امیر یا امام نہیں، ان کا ملک کوہستان اور جائے امن ہے، اس لئے آپ چھ سو اشخاص کے ساتھ اس ملک میں تشریف لائے، اور اس ملک کے مسلمانوں کو اس فریضہ کی ادائیگی کی ترغیب دی اور ان کو اس پر آمادہ کیا، یہاں تک کہ ان لوگوں نے آپ کے دست مبارک پر بیعت امامت کر کے آپ کو اپنا سردار بنایا، اسی وقت سے آپ کو امیر المومنین اور خلیفہ کے لقب سے موسوم کیا جاتا ہے۔

یہ بھی آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جہاد جنگ و ملک گیری کا نام نہیں، جہاد کا شرعی مفہوم یہ ہے کہ اعلاءِ کلمۃ اللہ، کفار کا زور توڑنے اور ان کے دین و مذہب کی شورش کو دفع کرنے کی امکانی کوشش کی جائے، یہ بھی یاد رہے کہ جماعت مجاہدین کے امام کے لئے یہ بھی شرط نہیں کہ اس کی تیاریاں اور ساز و سامان دشمن کے ساز و سامان کے مساوی ہو، دین کی ترقی اور اس کے سامان کی فراہمی کی کوشش البتہ شرط ہے، پس اگر جنگ پیش آ جائے اور مصلحت کا تقاضا ہو تو جنگ کی جائے، اور فتح ہو جائے تو دشمنوں کے مال کو مالِ غنیمت بنانا اور ان کے زن و فرزند کو اسیر کرنا اور ان کے ملک پر قبضہ کرنا بھی روا ہے، بہرحال اصلی مقصود ترقیِ دین ہے، فتوحات اس کا ثمرہ ہیں، بلکہ اعلیٰ درجہ کی فتح یہ ہے کہ جب تک جان میں جان ہے، غازی و مجاہد ہی رہیں، جن کے

فضائل اور مراتب و مناقب قرآن مجید میں واضح اور مفصل طریقہ پر بیان کئے گئے ہیں، اور اگر کفار کے ہاتھ سے خدا شہادت نصیب فرمائے تو زہے نصیب! رسالت کے بعد اس مرتبہ سے بڑھ کر کوئی مرتبہ ہی نہیں۔

وینٹورا نے کہا کہ ہاں بیشک آپ کے مذہب میں شہید کا بڑا مرتبہ ہے، مولوی صاحب نے فرمایا کہ آپ پر بڑا تعجب ہے کہ آپ نے ابھی اقرار کیا تھا، تمام پیغمبروں نے اپنے اپنے زمانہ میں جہاد کیا پھر آپ یہ کہتے ہیں کہ "تمہارے مذہب میں" بھلا اس قید کی کیا ضرورت تھی، آپ کو تو یہ کہنا چاہئے تھا کہ پیغمبروں کے یہاں یہ عبادت اعلیٰ مرتبہ کی ہے۔

وینٹورا نے کہا میں نے یہ مانا، لیکن یہ بات عقل کے خلاف معلوم ہوتی ہے کہ اس بے سروسامانی کے ساتھ کہ خلیفہ صاحب کے پاس نہ افواج ہیں، نہ توپ خانہ، نہ سرمایہ نہ ملک، لیکن ان کے عزائم یہ ہیں! مولوی صاحب نے فرمایا ہاں، اہل دنیا کو فوج، توپ اور خزانوں پر اعتماد ہوتا ہے، اور ہم کو اللہ تعالیٰ کی قدرت پر توکل و اعتماد ہے، ہم نہ فتح کا دعویٰ کرتے ہیں نہ شکست سے ملول ہوتے ہیں، یہ دونوں چیزیں اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہیں، ہمارا عقیدہ ہے کہ "كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ" (البقرہ ۲۴۹)

اگر آپ کو اس سے انکار ہے تو آپ کی تاریخ دانی کا دعویٰ غلط ہے اس لئے کہ کتب تاریخ سے ثابت ہے کہ بہت سے زبردست و سرکش اور کثیر التعداد گروہ حقیر و کمزور لوگوں کے ہاتھ سے زیر و پامال ہوئے، خصوصاً جب کہ ضعفاء اللہ تعالیٰ کے دین کی حمایت و نصرت کے لئے کمربستہ ہوتے ہیں، چنانچہ پیغمبروں کو بھی ایسے معاملات پیش آئے جو تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہیں، کسی پیغمبر کے پاس بھی خزانہ، توپ، اور فوج نہ تھی، تھوڑے سے پیروؤں کے ساتھ جو غریب و فقیر تھے، انھوں نے بڑے بڑے زبردستوں اور گردن فرازوں کو

خاک میں ملا دیا، ان کے جانشینوں اور نائبین نے بھی عظیم الشان سلطنتوں کو درہم برہم کر دیا اس سلسلہ میں زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں، آپ خود تاریخ داں ہیں، تاریخ کی کتابیں خود رہنمائی کرنے کے لئے کافی ہیں۔

اس موقع پر جنرل الارڈ نے کہا کہ یہ نہیں ہوا کرتا کہ بے سروسامان صاحب سازوسامان کے مقابلہ میں اور غیر مسلح مسلح کے مقابلہ میں کامیاب ہوں، ونٹورا نے کہا کہ نہیں، مولوی صاحب صحیح کہتے ہیں کہ بڑوں نے چھوٹوں کے ہاتھ سے شکست کھائی۔

ونٹورا نے بحث کے آخر میں کہا میری صرف اتنی خواہش ہے کہ میرے اور خلیفہ صاحب کے درمیان تحفے تحائف کی رسم جاری ہو جائے پہلے میں کوئی چیز بھیجوں پھر خلیفہ صاحب کوئی تحفہ بھیج دیں تاکہ یہاں سے واپس جانے کے لئے مجھے کوئی عذر مل جائے، اس کے بعد خلیفہ صاحب کو یوسف زئیوں کے ملک کا اختیار رہے، جو چاہیں کریں، خالصہ کی فوج پھر اس ملک پر کبھی نہ آئے گی۔

مولوی صاحب نے فرمایا کہ خلیفہ صاحب کو تمہاری محبت اور دوستی سے کوئی غرض نہیں، اگر آپ کو غرض ہو تو پہلے آپ سلسلہ جنبانی کریں خلیفہ صاحب بڑے بلند حوصلہ اور عالی ہمت ہیں، وہ آپ کے تحفوں کا جواب ضرور دیں گے، لیکن خلیفہ صاحب کی سرکار کا تحفہ یہی ہے کہ کسی کو سربند کسی کو کلاہ اور کسی کو جبہ بھی عنایت فرماتے ہیں، ان کی سرکار میں ہتھیار بھی بڑے بڑے بیش قیمت ہیں، تعجب نہیں کہ ان میں سے بھی کچھ عنایت فرمائیں۔

ونٹورا نے کہا سربند اور کلاہ کو ہم کیا کریں گے؟ ہاں اگر تحائف کے عوض میں ایک گھوڑا خلیفہ صاحب عنایت فرمادیں تو معقول بات ہوگی، مولوی صاحب نے کہا کہ میں آپ کا مطلب سمجھا ہم گھوڑا آپ کو ہرگز نہ دیں گے، ونٹورا نے کہا آپ انکار کر رہے ہیں، آپ

خلیفہ صاحب کو لکھئے وہ اس تجویز کو پسند فرمائیں گے، اس کے لئے دور اندیشی کی ضرورت ہے۔

اس وقت حکیم صاحب اخبار نویس بلکہ حاجی بہادر شاہ خاں تک نے مولوی صاحب کو اشارہ کیا کہ ونٹورا جو کچھ کہہ رہا ہے اس کو قبول کر لیں مگر مولوی صاحب اپنی عقلِ دور اندیش سے معاملہ کی تہ تک پہنچ گئے[1]، اور فرمایا یہ بات اس کے لئے تو مناسب ہے، جو ملک اور جاگیر پر قابض ہو، لیکن اس شخص کے لئے مناسب نہیں جس نے جہاد محض اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لئے شروع کیا ہو، جس طرح جو شخص نماز روزہ اور دوسرے اعمال صالحہ محض خلق اللہ میں بزرگی حاصل کرنے کے لئے کرے، عذاب و وبال کا مستحق ہے، اسی طرح جہاد فسادِ نیت کے ساتھ موجب وبال ہے، میں ایسی بات خلیفہ صاحب کو نہیں لکھ سکتا، اس نیت میں ہم اور خلیفہ صاحب یکساں ہیں، فرق اتنا ہے کہ ہم نے ان کو اپنا امام قرار دیا ہے، اس لئے کہ امام کا تقرر شرائط جہاد میں سے ہے، جو چیز جہاد کے ثواب کو باطل کرنے والی ہے، اس کے انکار میں ہم اور خلیفہ صاحب برابر ہیں۔

ونٹورا نے دو تین بار یہی بات دہرائی مولوی صاحب نے فرمایا کہ اس بات کو بار بار دہرانے سے کچھ فائدہ نہیں، گھوڑا تو گھوڑا ہے ہم تو گدھا بھی تم کو نہیں دیں گے ہمارا تو ارادہ خود آپ سے جزیہ اور خراج لینے کا ہے ہم آپ کو خراج کیا دیں گے؟

ونٹورا نے کہا کہ اگر خلیفہ صاحب اپنی کرامت سے اس بے سروسامانی اور قلتِ فوج کے ساتھ ایسی صاحب حشمت وجاہ سرکار پر فتحیاب ہو جائیں، اس صورت میں ہم سرکارِ خالصہ

---

[1] ونٹورا کا مقصد یہ تھا کہ کسی طرح سید صاحب تحفہ میں ایک گھوڑا ونٹورا کے پاس بھیج دیں اور وہ اور مہاراجہ کی حکومت لوگوں میں مشہور کر سکے کہ سید صاحب نے نعل بندی دیکر مہاراجہ کی حکومت کا باج گذار اور علاقہ دار ہونا منظور کر لیا مولوی خیر الدین صاحب اس نکتہ کو سمجھتے تھے۔ اس لئے وہ کسی طرح گھوڑے کے تحفہ کا اقرار کرنا نہیں چاہتے تھے۔

کو چھوڑ کر خلیفہ صاحب کی طرف رجوع کر لیں گے، مولوی صاحب نے کہا کہ میں خلیفہ صاحب کا حال تم سے کیا کہوں، آپ نے خود دیکھا نہیں، اگر ملاقات کا حوصلہ ہو تو تیار ہو جائیے انشاء اللہ ان کی گفتگو سن کر سوائے آمنا و صدقنا کہنے کے اور کچھ نہ کہیں گے۔

یہ سن کر ونٹورا نے کہا "نہیں نہیں" پھر وہ تھوڑی دیر خاموش رہا، اس کے بعد کہا کہ آپ کو اس مضمون کے لکھ کر بھیجنے میں عذر رہے، تو زبانی آپ یہ پیغام پہنچا دیں گے؟ مولوی صاحب نے فرمایا کہ آپ کے کچھ کہنے پر منحصر نہیں، میں ذرہ برابر بھی ان سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گا" اور ساری گفتگو بے کم و کاست نقل کر دوں گا، ونٹورا نے کہا اس کے بعد جو آپ ارشاد فرمائیں، وہ حضور میں ہم تک پہنچا دیں، مولوی صاحب نے کہا جواب کا پہنچانا یا نہ پہنچانا ہمارے اختیار میں نہیں، یہ خلیفہ صاحب کی رائے اور حکم پر منحصر ہے، اس وجہ سے میں اس کا وعدہ نہیں کرتا۔

ونٹورا نے کہا کہ آپ نے میرے سامنے جو کچھ کہا ہے، کیا آپ کھڑک سنگھ کے سامنے بھی کہہ دیں گے؟ مولوی صاحب نے فرمایا کچھ آگے بڑھ کر کہوں گا۔

بات یہاں تک پہنچی تھی کہ ونٹورا نے کہا کہ آپ اس وقت تشریف لے جائیں، ہم پھر کسی اور وقت بلائیں گے۔

مولوی صاحب وہاں سے رخصت ہو کر حکیم عزیز الدین کے ڈیرے پر آئے، اور کھانا تناول کیا، نماز مغرب تک وہیں رہے، نماز کے بعد اپنے ڈیرے پر آئے، دوسرے روز وزیر سنگھ نے آکر خفیہ طریقہ سے بیان کیا کہ آج ظہر کے وقت کھڑک سنگھ کے ڈیرے پر دونوں ولایتی افسر اور خاوی خاں کا بھائی امیر خاں اکٹھے تھے، انھوں نے مشورہ کیا کہ یہ مولوی بہت تیز مزاج ہے، ہماری بات قبول نہیں کرتا پنجتار کی طرف فوج کا جانا ضروری ہے

ایک پہر رات رہے کوچ کی تجویز ہوئی اس کی اطلاع مولانا اسماعیل کو ضرور ہونی چاہیئے اسی وقت مولوی صاحب نے اس ملا کی معرفت جس کے یہاں وہ مقیم تھے، ایک شخص کو پنجتار روانہ کیا اور قاصد سے فرمایا کہ جو جو دیہات راستہ میں پڑیں وہاں کے لوگوں کو خبردار کرتے جانا کہ کل سکھوں کا لشکر پنجتار پر چڑھائی کرے گا، اپنی اپنی جان و مال سے ہوشیار رہیں، کھڑک سنگھ کے علاوہ تمام لشکر نے زیدے کے مقام پر پڑاؤ ڈالا یہاں سے پنجتار چھ کوس ہے، غروب آفتاب کے وقت لشکر میں مشہور ہوگیا کہ آج رات غازی پنجتار کے لشکر پر شبخوں ماریں گے، اس اطلاع سے سارے لشکر میں ایک اضطراب اور انتشار پیدا ہوگیا کہ کوئی اپنے بستر پر آرام سے لیٹ نہ سکا سب اپنے گھوڑے کی لگام ہاتھ میں لئے کھڑے تھے، چونکہ انھوں نے زمین سے میخیں اکھاڑلی تھیں، تمام لشکر میں شور برپا ہوگیا، اور ہر شخص بھاگنے کے لئے تیار ہوگیا، ولایتی افسروں نے لشکر کا یہ رنگ دیکھ کر یوسف خاں اور دوسرے افسروں کو طلب کرکے کہا کہ آخر یہ کیا مصیبت ہے، اور لشکر پر ہراس کیوں طاری ہے! ہر شخص بھاگنے پر تیار ہے، ان کو تسلی دے کر ٹھیرانا چاہیئے، افسروں نے حسب الحکم لشکر کو سمجھایا تھوڑی رات باقی تھی کہ سارا لشکر دریا لنڈے کی طرف چل کھڑا ہوا، اس طرح پر کہ کسی نے کسی کو نہیں پوچھا پھر نہایت تیزی کے ساتھ پل کے ذریعہ دریا عبور کرکے پل کو توڑ دیا وہاں کچھ دیر ٹھیر کر ایک پہر دن باقی تھا اٹک کی طرف کوچ کر گئے۔

اندازہ ہے کہ یہ پورا واقعہ رنجیت سنگھ تک ضرور پہونچا ہوگا، اور اس کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اس کا واسطہ ایک ایسے شاہین اور شہباز سے ہے، جس کو غلہ کے چند دانوں اور دسترخوان کے بچے کھچے ٹکڑوں سے زیر دام لانا ممکن نہیں۔

ایک زبردستی کی جنگ جس میں مسلمان فتحیاب ہوئے

زیدہ کی جنگ میں قلت تعداد، بے سروسامانی اور غریب الوطنی کے باوجود مجاہدین کی فتح اور یار محمد خاں والی پشاور کی ہلاکت ایک ایسا واقعہ تھا جس کا اثر شاہی خاندان میں محسوس کیا جانا لازمی تھا، سلطان محمد خاں کی ماں بھی اسکو اپنے بھائی کے قتل کا عار برابر دلاتی تھی، اور انتقام لینے اور اس داغ کو دھونے پر آمادہ کرتی رہتی تھی، آخر کار اس نے انتقام کی ٹھان لی، اور اپنا لشکر لے کر مرکز مجاہدین کی طرف رخ کیا اس کا ارادہ تھا کہ اس شورش کا قصہ ختم کر دیا جائے، اور روز روز کی زحمت سے نجات حاصل کی جائے، جس نے اس کا امن وسکون غارت کر دیا تھا، جو امرار، سرداران قبائل، جاگیردار، اور اہل جاہ ومنصب سید صاحب کے مخالف تھے، اور حسد ورقابت کا شکار تھے، اور سید صاحب کی سیادت، دینی امامت وپیشوائی اور عروج واقبال میں اپنا ادبار وزوال سمجھتے تھے، وہ سب لوگ قدرتی طور پر اس کے ساتھ مل گئے۔

سردار سلطان محمد خاں نے دوسرے امرار وسرداران قبائل کو دھمکی بھی دی کہ وہ ان کو سخت سزا دیں گے اس لئے کہ یار محمد خاں کا قتل ان ہی کی عملداری میں اور ان کی آنکھوں کے سامنے ہوا، اور وہ کوئی مدد نہ کر سکے اس کے ساتھ اس کے دو بھائی سردار پیر محمد خاں اور سردار سید محمد خاں بھی اور اس کے بڑے بھائی محمد عظیم خاں والیِ کشمیر کے بھتیجے حبیب اللہ خاں بھی تھے،

آخر کار یہ رائے ٹھیری کہ اس خطرہ کا مقابلہ اور سد باب کیا جائے یا اس کو کسی طرح ٹالا جائے، سید صاحب امب کے قلعہ سے جہاں وہ مقیم تھے، اپنی قدیم لشکر گاہ پنجتار واپس آگئے، پشاور کے لشکر نے موضع ہوتی میں قیام کیا اور سید صاحب اس کے مقابل دوسرے موضع تورد میں فروکش ہوئے۔

سید صاحب کو اس جنگ سے جو دو مسلمانوں میں ہونے والی تھی، کوئی دلچسپی نہ تھی، آپ کو ان دو قوتوں کا ٹکراؤ سخت ناپسند تھا جن سے اسلام اور مسلمانوں کو بیحد فائدہ پہونچ سکتا تھا، اور وہ مشترک دشمن کے مقابلہ کے لئے کام آسکتی تھیں۔)

سلطان محمد خاں ان پہلے لوگوں میں تھے، جنھوں نے پہلے سید صاحب کی طرف مصالحت اور وفاداری کا ہاتھ بڑھایا، اور آپ سے اطاعت و فرماں برداری اور جہاد فی سبیل اللہ پر بیعت کی، سید صاحب نے بہت کوشش کی کہ ان کو اس معرکہ سے باز رکھیں جس کی کوئی ضرورت اور افادیت نہیں ہے، آپ نے ان کی دینی حس اور اسلامی جذبات کو بھی ابھارنا چاہا جس سے کسی مسلمان کا دل خالی نہیں، اس مقصد کے لئے آپ نے موضع تورد ہی کے ایک عالم ربانی مولوی عبدالرحمٰن صاحب کا انتخاب کیا، جو سید صاحب کے بڑے مخلصین میں سے تھے، آپ نے ان کو سلطان محمد خاں کے پاس سفارت پر بھیجا اور ان سے یہ کہلوایا کہ ہم یہاں صرف حاکم لاہور کے مقابلہ کے لئے آئے ہیں، ہم سمجھتے تھے کہ دین کی نصرت اور مظلوموں کی حمایت کے لئے اس جہاد میں آپ ہمارا ساتھ دیں گے، آپ ہی نے سب سے اول مجھ سے بیعت کی اور میری مدد کا وعدہ کیا، اب آپ کا دل اس پر کیسے راضی ہے کہ کفار سے مل کر مسلمانوں کے خلاف ہتھیار اٹھائیں، ان کے خلاف سازشیں کریں، اپنے دین اور دنیا دونوں کا نقصان کریں، اور بعد میں ندامت سے اپنی انگلیاں کاٹیں۔

اس موثر اور معقول پیام کا سلطان محمد خاں نے بہت سختی سے جواب دیا اور مصالحت کی

ساری امیدیں منقطع ہوگئیں، سید صاحب نے قاصد کو دوبارہ بھیجا اور ان کو سمجھانے بجھانے اور ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی اور کوشش کی آپ نے ان سے کہا کہ اگرچہ ان کے بھائی دوست محمد خاں نے ان کو ان سے ڈرنے اور باز رہنے کی ہدایت کی تھی، اور اس سے آگاہ کیا تھا کہ ان کے وعدہ پر بھروسہ نہ کرنا چاہئے، لیکن خود ان کی رائے یہ ہوئی کہ کسی فیصلہ میں عجلت سے کام نہ لیں، ان سے اور یار محمد خاں سے جو جو باتیں شیدو کے معرکہ میں ظاہر ہوئیں، انھوں نے ان سب کو معاف کر دیا ہے، بلکہ برائی کا بدلہ بھلائی سے دینے کی کوشش کی ہے، یہاں تک کہ یار محمد خاں نے ایک بڑا لشکر اور توپ خانہ لے کر مجاہدین کی طرف رخ کیا، اور اس ارادہ کے ساتھ کہ آج آخری طور پر ان کا خاتمہ کر دینا ہے، لیکن اللہ تعالےٰ نے حفاظت فرمائی مجاہدین کو فتح حاصل ہوئی اور یار محمد خاں اپنی ناعاقبت اندیشی اور مجاہدین سے دشمنی کا خود ہی شکار ہو گیا، اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے، اللہ تعالےٰ فرماتا ہے "کُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ" ہر آدمی اپنے کئے کا ذمہ دار ہے۔

سید صاحب اور سلطان محمد خاں کے درمیان قاصد کئی بار آیا گیا، بات طویل ہوتی گئی حاکم پشاور نے سخت لب ولہجہ میں بات کرنی شروع کی اور دھمکیاں دینا اور گرجنا برسنا شروع کیا، یہ دیکھ کر سید صاحب نے مولوی عبدالرحمٰن کو ہدایت کی کہ اب وہاں جانے اور اس موضوع پر بات کرنے کی ضرورت نہیں، اور اندازہ ہو گیا کہ اب جنگ سے ..... چارۂ کار نہیں، سید صاحب بادل ناخواستہ اس کے لئے آمادہ ہوئے اور تیاریاں شروع کیں، لوگوں کو ان کی جگہوں پر تعینات کیا، رات لشکر نے جاگ کر گزاری، سب تیاریوں میں لگے رہے، اور کسی کو سونے کا موقع نہ ملا، صبح کی نماز میں سید صاحب کے ساتھ مجاہدین کی بہت بڑی تعداد شریک تھی، ان کو خوب اندازہ تھا کہ ایک فیصلہ کن اور آخری جنگ ان کے سامنے ہے، نماز کے بعد سید صاحب نے بہت آہ وزاری اور عجز وانکساری کے ساتھ دیر تک دعا کی لوگوں کی آنکھیں اشکبار اور دل بے قرار تھے، آپ نے

اللہ تعالےٰ کے سامنے اپنے عجز و ناتوانی اور بے سرو سامانی کا دل کھول کر بیان کیا، اور اس کا اظہار کیا کہ وہ کسی قابل نہیں ہیں، صرف اللہ کا سہارا ان کی جائے پناہ ہے۔

دعا کر کے آپ نے اپنے چہرہ پر ہاتھ بھی نہ پھیرا تھا کہ ایک آدمی مورچہ کی طرف سے دوڑا ہوا آیا، اور اس نے اطلاع دی کہ طبل جنگ بج چکا ہے، سید صاحب نے بھی جنگ کا اعلان کر دیا، لوگوں نے اپنی کمر کس لی، اور مجاہدین اپنے سارے اسلحہ اور جنگی سامان کے ساتھ جہاد کے میدان میں اتر پڑے۔

سلطان محمد خاں اور ان کے دونوں بھائیوں نے دستور کے مطابق قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی تھی، کہ وہ جنگ سے منھ نہ پھیریں گے، فتحیاب ہوں گے، یا جان دے دیں گے انھوں نے نیزوں کی ایک محراب تیار کی اور اس کے وسط میں قرآن مجید کو آویزاں کیا اور سارا لشکر اس کے نیچے سے ہو کر میدان جنگ میں اترا، یہ گویا قرآن کی قسم کا عملی طریقہ تھا اور اس بات کا عہد اور اعلان کہ لشکر کو پیچھے کسی حالت میں نہیں لوٹنا ہے، اس طرح جنگ ایک مذہبی جنگ بن گئی، اور آخری سانس تک پوری پامردی سے لڑنے کا پختہ عہد کیا گیا۔

جنگ شروع ہوئی اور دونوں فریق ایک دوسرے سے برسرپیکار ہو گئے، پشاور کا لشکر آٹھ ہزار سوار اور چار ہزار پیادوں پر مشتمل تھا، مجاہدین کے لشکر میں تین ہزار پیادے اور پانچ ہزار سوار تھے، سید صاحب نے مکمل اطاعت و فرمانبرداری کا حکم دیا اور انتشار، عجلت اور خود رائی کے نقصانات سے آگاہ اور خبردار کیا، سید صاحب گھوڑے پر سوار ایک پیادہ دستہ کے وسط میں تھے، اور لشکر کو جہاد و ثابت قدمی اور خدا سے استعانت کی طرف متوجہ کر رہے تھے، لشکر کے بعض سمجھدار لوگوں نے آپ سے درخواست کی کہ آپ گھوڑے سے اتر آئیں، اس لئے کہ آپ نمایاں و بلند ہونے کی وجہ سے نشانہ کی زد پر ہیں، اور گولہ انداز آسانی

سے آپ کی طرف گولے پھینک سکتے ہیں، آپ نے ان کے مشورہ کو قبول کیا اور گھوڑے سے اتر آئے۔

میدان کارزار گرم ہوا گولے چلنے شروع ہوئے جو بارش کی طرح گر رہے تھے، اور تلواریں اور نیزے چمک رہے تھے، مجاہدین نے مولانا خرم علی بلہوری[1] کا قصیدہ جہادیہ بلند آواز سے پڑھنا شروع کیا اور ان کے اندر شوق و ذوق اور سرخوشی و سرمستی کی ایک عجیب کیفیت پیدا ہوگئی، سید صاحب کی شجاعت و سپہ گری کے جوہر اس موقع پر اچھی طرح ظاہر ہوئے آپ بلا تردد اپنے کو خطرہ میں ڈالتے تھے، آپ کے داہنے اور بائیں دو رفیق تھے، جو بندوق بھر بھر کر آپ کو دیتے جاتے تھے، اور آپ نہایت سرعت اور بہادری و بے خوفی کے ساتھ فائر کرتے۔

مجاہدین کی جوانمردی اور دنیا کی حقارت کے عجیب مناظر اس معرکہ میں سامنے آئے مولانا محمد اسماعیل اور حافظ ولی محمد نے آگے بڑھ کر دشمن کے توپ خانہ پر قبضہ کیا اور اس کا رخ دشمن کی طرف پھیر دیا، سید صاحب بنفس نفیس اس کی نگرانی کرتے اور اس سلسلہ کی بہترین ہدایات دیتے تھے، اس میں کچھ خرابی پیدا ہوگئی تھی جس کو آپ ہی نے درست کیا اس کے بعد وہ دشمن کے خلاف پہلے سے بہتر طریقہ سے کام کرنے لگا، اسی اثناء میں درانیوں کے پیر اکھڑ گئے اور انھوں نے فرار اختیار کرنے میں عافیت سمجھی اور مجاہدین کو مکمل فتح حاصل ہوئی، سورج ڈھلتے ہی مجاہدین مایار کے میدان میں مظفر و منصور واپس ہوئے، جو لوگ جنگ میں اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے تھے، اور مختلف جگہوں پر مشغول تھے، وہ سب یہاں آکر مل گئے، مولانا مظہر علی

---

[1] مولانا خرم علی بلہوری کانپوری سید صاحبؒ رفقاء میں تھے بعد میں باندہ چلے گئے جہاں نواب ذوالفقار علی خاں نے ترجمہ و تصنیف کی خدمت ان کے سپرد کی اور فقہ و حدیث کی متعدد کتابیں انھوں نے اردو میں ترجمہ کیں، انھوں نے تقویۃ الایمان کے طرز پر توحید و سنت کے موضوع پر ایک کتاب نصیحت المسلمین تصنیف کی ۱۲۷۱ھ میں وفات پائی

عظیم آبادی نے زخمیوں کی مرہم پٹی کی اور طبی امداد کا حکم دیا شہداء کی نماز جنازہ پڑھی گئی اور تدفین عمل میں آئی مولانا جعفر علی لکھتے ہیں کہ لوگ اگرچہ صبح سے بھوکے تھے، لیکن فتح کی خوشی سے کھانے سے بے پرواہ اور آسودہ تھے، دن بھر کے تھکے ماندے ہونے کی وجہ سے اکثر لوگ پڑ کر سو گئے، لیکن جراحوں کو زخموں کے سینے اور مرہم پٹی سے فرصت نہ تھی، عام طور پر مجاہدین پر نیند کا غلبہ تھا، "نُعَاسًا یَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْهُمْ" کا منظر تھا، آنکھ بے اختیار بند ہو ہو جاتی تھی، نصف شب کے بعد زخموں کے سینے اور مرہم پٹی سے فراغت ہوئی۔

اس معرکہ میں صدق و اخلاص، بے نظیر شجاعت، یقینِ محکم، جذبۂ شہادت، موت کے اشتیاق، اور جانِ مشتاق کے بہت سے عجیب و دلنواز نمونے دیکھنے میں آئے ان میں بعض واقعات مختصراً یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

اخلاص کا جہاد، اور شہادت کی موت

مایار کی جنگ شروع ہونے سے کچھ پہلے امیر المجاہدین سید احمد شہید کی خدمت میں ایک صحت مند و توانا نوجوان حاضر ہوئے، شرافت و عالی نسبی ان کے چہرہ سے عیاں تھی، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سید صاحب کے خاندان اور گھرانہ کے ایک عزیز فرد ہیں، وہ آگے بڑھے اور سید صاحب سے اس لہجہ میں ہم کلام ہوئے جس میں توقیر و احترام کے ساتھ اخوت و قرابت کا ناز و اعتماد بھی تھا، سپاہی کی شان بھی اور نوجوانی کی آن بان بھی۔

وہ سید صاحب سے کہہ رہے تھے کہ "میاں صاحب! جس روز سے میں آپ کے ساتھ

گھر سے نکلا ہوں آج تک میرا یہی خیال تھا کہ یہ میرے عزیز ہیں، اور میں بھی ان کے ساتھ رہوں جو ان کو اللہ تعالےٰ کہیں عروج دے گا، تو ان کی وجہ سے میری بھی ترقی ہوگی نہ میں آج تک خدا کے واسطہ رہا اور نہ کچھ ثواب جان کر، مگر اب میں نے اس خیال فاسد سے توبہ کی اور از سر نو آپ کے ہاتھ پر اللہ تعالےٰ کی رضامندی کے واسطے بعیت جہاد کرنے کو آیا ہوں آپ مجھ سے بعیت لیں اور میرے واسطے دعا کریں کہ اللہ تعالےٰ مجھ کو اس نیت اور ارادہ پر ثابت قدم رکھے آپ نے یہ سن کر ان سے بعیت لی اور ان کے واسطے دعا کی اس وقت تمام حاضرین پر رقت کی وجہ سے ایک عجیب حال طاری تھا، اور ہر ایک کی آنکھ سے آنسو جاری تھے۔

قاضی گل احمد صاحب بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک جگہ دیکھا کہ سید ابو محمد صاحب[۱]

---

[۱] سید ابو محمد صاحب بٹالین میں جمعدار تھے، بہت بانکے ترچھے وضعدار اور خوبصورت جوان تھے بڑے بڑے چابک سواران کی استادی کے قائل تھے، مزاج میں بڑی لطافت و نفاست تھی، کسی کے ہاتھ کا پکا کھانا ان کو پسند نہ آتا تھا، اپنے ہی ہاتھ سے دن رات ایک بار پکاتے تھے اکثر فنون میں مہارت رکھتے تھے، کپڑا ایسا قطع کرتے اور سیتے کہ بڑے بڑے استاد حیران رہ جاتے تھے پندرہ بیس وضع کی پگڑی باندھتے تھے ہاتھ سے گھوڑے کا سب ساز و یراق سی لیتے تھے، اور آپ ہی اپنا خط آئینہ سامنے رکھ کر بناتے تھے، غرارے دار پائجامہ چست انگرکھا پہنتے تھے، بانکپن کے باوجود نہ کبھی سر پر بال رکھے نہ حقہ پیا نہ نشہ کی کوئی چیز کھائی پی نہ کسی نامحرم عورت کی طرف بری نگاہ سے دیکھا تیمارداری خدمت گزاری میں بڑے چست تھے بیماروں کا بول و براز اٹھاتے تھے، جب سید صاحب نے ہجرت کی تیاری کی تو آپ نوکری چھوڑ کر رخصت کرنے آئے کوئی پوچھتا کہ سید ابو محمد صاحب کیا تم بھی ہجرت کر کے جہاد کو چلو گے تو کہتے میں نہیں جانتا کہ ہجرت اور جہاد کس کو کہتے ہیں، ہمارے بھائی میاں صاحب جاتے ہیں، ہم نے سوچا کہ ہم بھی دلمؤ تک پہنچا آئیں یہی کہتے کہتے دلمؤ باندہ، گوالیار، ٹونک، اجمیر یہاں تک کہ سرحد پہنچ گئے۔

زخمی پڑے ہیں، مگر ایسے کاری زخم لگے تھے، کہ قدرے جان تو ان میں باقی تھی، ہوش و حواس کچھ بجا نہ تھے، میں نے کئی بار ان کے کان میں پکار کر کہا کہ سید ابو محمد صاحب حضرت امیر المومنین کی فتح ہوئی انھوں نے کچھ خیال نہ کیا اور نہ کچھ جواب دیا مگر ان کا حال یہ تھا کہ ہونٹ اپنے چاٹتے تھے، اور الحمدللہ، الحمدللہ کہتے جاتے تھے، اور جو لوگ لاشیں اٹھا رہے تھے، میں نے ان کو آواز دی کہ اِدھر آؤ، سید ابو محمد صاحب اِدھر پڑے ہیں، اُدھر سے ایک آدمی آیا، میرے پاس ایک کمل تھا، میں نے اٹھا کر اس میں لٹایا ہم دونوں آدمی ان کو توروں میں لائے تب تک ان میں رمق باقی تھی، اسی طرح ہونٹ بھی چاٹتے تھے، اور لبوں سے کچھ اشارہ الحمدللہ کہنے کا معلوم ہوتا تھا، اسی حالت میں روح پرواز کر گئی۔

چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

ایک مضبوط و توانا جوان کالے خاں تھے، ان کے جسم کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ شاید لشکر مجاہدین میں شامل ہونے سے پہلے پہلوان رہے ہوں گے، کسرتی جسم، مضبوط پٹھے، لیکن ابھی ان کے اندر گذشتہ زندگی کے کچھ آثار باقی تھے، اور کبھی نوجوانی و شوخی کی رگ پھڑکنے لگتی تھی، داڑھی بھی منڈاتے تھے، سید صاحب باوجود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں اپنی شدت کے یہ سب دیکھتے حکمت کے پیش نظر ان کو کچھ نہ کہتے یہ نوجوان ان سب باتوں کے باوجود سید صاحب کے بہت مخلص اور جاں نثار تھے، ایک دن انھوں نے داڑھی منڈائی سید صاحب کا سامنا ہوا، تو سید صاحب نے ان کی ٹھوڑی پر اپنا ہاتھ پھیرا اور فرمایا کہ

خان بھائی تمہاری ٹھوڑی کیسی چکنی چکنی ہے، اس بات سے وہ شرما گئے اور کچھ نہ بولے مگر سید صاحب کا وہ کہنا ان کے دل میں اتر گیا، کئی دن کے بعد جب معمول کے موافق نائی آیا اور چاہا کہ ٹھوڑی بھگوئے، اور مونڈے تو انھوں نے کہا اس ٹھوڑی میں سید صاحب کا ہاتھ لگا ہے، اب اس پر تیرا استرہ نہیں چل سکتا، یوں ہی رہنے دے، پھر اس دن سے انھوں نے اپنی داڑھی نہ منڈائی اور بڑے صالح اور متقی ہو گئے۔

یہ مجاہد مایار کے معرکہ میں سید صاحب کے ساتھ سواروں کے دستہ میں تھے، اور لشکر کی صفوں میں گھوم گھوم کر اعلان کرتے تھے کہ بھائیو صفیں سیدھی رکھو، اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جاؤ، یہی کہہ رہے تھے، کہ ان کے بائیں پہلو میں گولہ لگا، وہ گھوڑے سے گر پڑے، اور صف آگے بڑھ گئی، ہدایت اللہ بالس بریلوی کہتے ہیں کہ لوگ ان کو مایار کی مسجد کے حجرہ میں اٹھا لائے اس وقت وہ جان کنی کی حالت میں تھے، ان کی زبان پر اللہ اللہ جاری تھا، کچھ دیر کے بعد انھوں نے پوچھا کہ بھائی لڑائی کا کیا حال ہے، اور کس کی فتح ہے، اس وقت تک درانیوں کا پہلا اور دوسرا غول آیا تھا، میں نے بتایا کہ ابھی معاملہ توگڈمڈ ہے، جب درانیوں کو شکست ہوئی اور سید صاحب کو فتح نصیب ہوئی تو انھوں نے ایک مرتبہ پھر پوچھا کہ اب لڑائی کا کیا طور ہے، کسی کی فتح ہوئی یا نہیں، میں نے کہا اللہ تعالیٰ نے ہمارے سید صاحب کو فتحیاب کیا، یہ خوشخبری سن کر انھوں نے الحمد للہ کہا، اسی دم ان کا دم نکل گیا۔

نوجوان زخمی

سید موسیٰ ۱۷۔۱۸ سال کے جوان تھے، ان کے والد سید احمد علی صاحب جس دن

پھولڑے کی جنگ میں شہید ہوئے اس دن سے سید موسیٰ کی طبیعت مغموم رہنے لگی، کبھی کبھی اپنے دوستوں سے کہتے کہ اگر کبھی مجھے کسی لڑائی میں جانے کا اتفاق ہوا تو انشاء اللہ بیچ کھیت میں مجھکو دیکھنا یعنی میں بھی لڑکر شہید ہو جاؤں گا' ان کے اس حال کی اطلاع سید صاحب کو بھی تھی، وہ رسالدار عبدالحمید خاں کے سواروں میں تھے، جب تورو سے مایار کی طرف لشکر چلا تو آپ نے ان سے کہا کہ تم اپنا گھوڑا کسی اور بھائی کو دے دو' اور تم ہمارے ساتھ پیادوں میں رہو' انھوں نے عرض کیا کہ آپ مجھ کو یوں ہی رہنے دیجئے، جب درانیوں کا حملہ آیا آپ گھوڑے کی باگ اٹھا کر اس میں گھس گئے اور خوب تلوار سے لوگوں کو مارا اور زخمی کیا اور آپ بھی زخمی ہوئے مگر لڑتے رہے، جب زخموں کے مارے دونوں ہاتھ بیکار ہو گئے اور کئی زخم سر میں لگے، اس وقت بیتاب ہو کر گھوڑے سے گرے۔

خاوی خاں کہتے ہیں کہ میں نے دور سے سنا کہ کوئی زخمی پڑا ہوا اللہ اللہ کہہ رہا ہے، میں نزدیک گیا تو پہچانا کہ یہ تو سید موسیٰ ہیں، سر کے زخموں سے جو خون بہ رہا تھا، اس سے ان کی آنکھیں بند تھیں میں نے کہا میاں موسیٰ میں آپ کو اٹھائے چلوں انھوں نے پوچھا کہ تم کون ہو اور فتح کس کی ہوئی میں نے کہا میں خاوی خاں ہوں اور فتح سید بادشاہ کی ہوئی، یہ سن کر انھوں نے کہا الحمدللہ اور قدرے چاق ہو گئے، اور مجھ سے کہا مجھکو لے چلو میں اپنی پشت پر سوار کر کے اٹھا لایا' سید صاحب نے ان کو بے چین دیکھ کر فرمایا کہ ان کو مایار کی مسجد کے حجرہ میں پہنچاؤ' آپ نے ان کے بعض رفیقوں کو ان کی خدمت کے لئے ساتھ کر دیا۔

مولوی سید جعفر علی لکھتے ہیں کہ سید صاحبؒ ان کو دیکھنے تشریف لائے آپ نے فرمایا کہ یہ بچہ بڑا مردانہ نکلا اور مالک حقیقی کا حق خوب ادا کیا، پھر ان سے خطاب کر کے فرمایا کہ الحمدللہ تمہارے ہاتھ پاؤں اللہ کے راستہ میں کام آئے اور تمہاری کوششیں مشکور ہوئیں اگر تم کسی کو دیکھو کہ

خوش رفتار گھوڑے پر سوار ہے، اور اس کو ایڑ لگاتا ہے، اور دوڑاتا ہے تو تم اس کی حسرت نہ کرنا کہ ہمارے ہاتھ پاؤں سلامت ہوتے تو ہم بھی اسی طرح شہسواری کرتے اس لئے کہ تمہارے ہاتھ پاؤں اللہ تعالےٰ کے یہاں قبول ہوگئے بڑے مبارک ہیں، وہ ہاتھ پاؤں جو رضائے مولیٰ کے راستہ میں کام آئیں، اور اس پر قربان ہو جائیں، اگر کسی شخص کو دیکھو کہ وہ پٹہ باز استادوں کی طرح تلوار سے کھیلتا ہے تو کبھی یہ غم نہ کرنا کہ ہم بھی تندرست ہوتے تو سپہ گری کا کمال دکھاتے اس لئے کہ تمہارے ان ہاتھ پاؤں کا بڑا مرتبہ ہے کہ اللہ کے راستہ میں انھوں نے زخم کھائے جو ہاتھ پاؤں صحیح وسالم ہیں، ان سے گناہ کا اندیشہ ہے، لیکن تمہارے ہاتھ پاؤں کا ثواب تو اللہ تعالےٰ کے یہاں جمع ہے، سیدنا علی مرتضیٰؓ کے بھائی حضرت جعفر طیارؓ کے دونوں بازو اللہ کے راستہ میں کٹ گئے، اللہ تعالےٰ نے جنت الفردوس میں ذوالجناحین کے لقب سے سرفراز فرمایا اور زمرد کے دو بازو ان کو عطا فرمائے۔

سید موسیٰ نے عرض کیا کہ میں ہزار زبان سے اللہ تعالےٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور اس حال پر راضی وشاکر ہوں میرے دل میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے قطعاً کوئی شکایت نہیں آتی، اس لئے کہ اسی کام کے لئے آپ کی ہمرکابی میں یہاں آیا تھا، الحمد للہ کہ اپنی ہستی کو اس افضل ترین عبادت میں مٹا دیا اللہ تعالےٰ قبول فرمائے لیکن میری اتنی تمنا ہے کہ حضرت مجھے روزانہ اپنی زیارت سے مشرف فرما دیا کریں، اس لئے کہ میں اپنی بے دست پائی سے خود حاضری سے معذور ہوں اس محرومی کے سوا مجھے کسی بات کا قلق نہیں۔

یہ سن کر سید صاحب نے دادا ابوالحسن سے فرمایا کہ میں تم کو اس کام کے لئے مقرر کرتا ہوں تم مجھ کو جس وقت فارغ دیکھو متوجہ کر دو تاکہ میں خود سید موسیٰ کے پاس آجاؤں پھر آپ نے سید موسیٰ کی بڑی تعریف کی اور ان کو شاباش دی اور تشریف لے گئے

(منظورۃ السعداء)

عقلِ ایمانی کی جھلکیاں

مایار کے میدانِ جنگ سے مسلمان مظفر و منصور واپس ہوئے، تمام لوگوں کے کپڑے اور چہرے ایسے گرد آلود تھے کہ بعض آدمی فوراً پہچانے نہیں جا سکتے تھے، ارباب بہرام خاں سید صاحب کے پاس آئے اور رومال لے کر چاہا کہ آپ کے چہرہ سے گرد جھاڑ دیں آپ نے فرمایا کہ خان بھائی! ابھی ٹھیر جاؤ یہ غبار بہت برکت والا ہے۔

حضرت سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس گرد کی بڑی فضیلت بیان کی ہے کہ جس کے پیروں پر یہ غبار پڑے وہ شخص عذابِ نار سے نجات پائے گا، یہ تمام تکلیف و مشقت اسی گرد کے لئے ہم نے اٹھائی ہے، یہ بات سن کر سب لوگ اسی طرح گرد آلود رہے اس جگہ کسی نے گرد نہ جھاڑی۔

ظہر کی نماز کے بعد ننگے سر ہو کر بہت دیر تک آپ نے دعا کی اس دعا میں اپنی دانست میں اللہ تعالے کی خداوندی اور پروردگاری، عظمت و جباری، اور رحمت و غفاری اور اپنی ناتوانی و خاکساری کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا آپ کے آنسو اس طرح جاری تھے کہ داڑھی تر ہو گئی تھی، اور یہی حال تقریباً تمام لوگوں کا تھا، دعا کے بعد چند گھڑی اور ٹھیرے پھر کوچ کیا اور موضع تورڈ میں آ کر عصر کی نماز پڑھی۔

میدان سے مظفر و منصور واپس آنے کے بعد سید صاحب نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالےٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے اپنے کرم عمیم سے ہم کو فتح نصیب فرمائی اور مسلمان بھی رکھا اور یہ بھی بڑا افضل فرمایا کہ باوجود قلت تعداد و سامان ہم میں سے کوئی یہ نہیں کہتا کہ ہم نے فتح حاصل کی یا ہم دشمن پر غالب آئے ہمارے سب غازیوں کا یہی کہنا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے محض اپنی قوت و قدرت سے ہم کو ایسے زور آور حریف پر جو سلطنت اور خزانوں کا مالک تھا اور جو مور و ملخ کی طرح ہم پر چڑھ کر آیا تھا، ہم کو فتحمند کیا"۔

اس کے بعد فرمایا کہ "یہ بھی اللہ تعالےٰ کا بڑا اکرم تھا کہ اس جنگ میں ہمارے دل میں عجیب قسم کا اطمینان اور سکینت نازل فرمائی کہ جنگ کا شور و ہنگامہ ہمارے دل پر اثر نہ کر سکا اس وقت ہم کو میدان جنگ میں جانا اور دشمن سے لڑنا ایسا معلوم ہوتا تھا' جیسے کوئی دعوت کو جاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ہم کہیں کھچڑی کھانے گئے تھے"۔

شہداء کو دفن کے لئے لایا گیا مولانا محمد اسماعیل نے فرمایا کہ ان کے چہرے ان کے عماموں سے چھپا دو اور ان کے کپڑے دیکھ لو جو کچھ پیسہ روپیہ وغیرہ بندھا ہو اس کو کھول لو کسی شخص نے قبر میں اتر کر ان کے چہرے ڈھک دیئے اور ٹکے وغیرہ ٹٹول لئے پھر کئی آدمی ایک بڑی سی چادر قبر کے منہ پر تان کر کھڑے ہو گئے اور سب مٹی دینے لگے تختے بنگے کچھ نہیں رکھے گئے اسی طرح مٹی سے توپ دیا اس کے بعد مولانا صاحب اور سب نے مل کر بہت دیر تک ان سب کے لئے دعائے مغفرت کی، جو لوگ شریک دفن تھے، محبت سے روتے جاتے تھے، اور کہتے تھے کہ یہ لوگ تو جس مراد کو آئے تھے، اس مراد کو پہنچے ہم لوگوں کو بھی اللہ تعالےٰ ایسی شہادت نصیب کرے۔

تھوڑی دیر کے بعد مغرب کی اذان ہوئی سب نے سید صاحب کے پیچھے نماز پڑھی نماز کے بعد آپ نے بہت دیر تک سر برہنہ ہو کر ان شہیدوں کی مغفرت کے واسطے دعا کی کہ "پروردگار تو خوب جانتا ہے کہ یہ تمام لوگ محض تیری خوشنودی اور رضا کے لئے اپنا گھر بار اور مال و متاع چھوڑ کر یہاں آئے تھے، اور صرف تیری ہی راہ میں انھوں نے اپنی جانیں صرف کیں ان کے گناہوں کو اپنے دامن رحمت میں چھپالے اور فردوس بریں میں ان کو جگہ دے اور ان سے راضی ہو! اور جو ہم چند ضعفاء اور غربا تیرے عاجز بندے باقی ہیں، ان کو بھی اپنی رضا مندی اور خوشنودی کی راہ میں جان و مال کے ساتھ قبول فرما، خطرات و وساوس دور کر اور دلوں کو اپنے اخلاص و محبت سے معمور کر اور اپنے دین محمدی کو قوت اور ترقی عطا کر اور جو لوگ اس دین متین کے دشمن و بدخواہ ہوں ان کو ذلیل و رسوا کر اور جو مسلمان فریب نفس و شیطان سے شریعت کی راہ سے بہک کر بادیۂ ضلالت میں پڑے ہیں، ان کو ہدایت کر کہ پکے مسلمان ہو کر تیرے اس کار خیر میں جان و مال اور اہل و عیال کے ساتھ شریک ہوں"!

دعا کے بعد کسی نے کہا کہ حضرت آج کی لڑائی میں چالیس غازیوں کے قریب شہید ہوئے، اور زخمی بھی بہت ہوئے اور اچھے اچھے لوگ کام آئے مگر شہیدوں اور زخمیوں میں جو خیال کیا تو پھلت والے بھائیوں میں سے سوائے شیخ عبدالحکیم صاحب کے کوئی شہید نہیں ہوا، یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ "ہمارے پھلت والے بھائیوں کو نظر نہ لگاؤ انشاء اللہ تعالیٰ ان کا گنج شہیداں کہیں اکٹھا ہوگا"[1]

---

[1] جنگ بالاکوٹ میں ایسا ہی ہوا کہ سوائے شیخ ولی محمد اور شیخ وزیر صاحب کے سب شہید ہوگئے۔

پشاور کی فتح

مایار کی جنگ سے فراغت کے بعد سید صاحب نے پشاور کا ارادہ ظاہر فرمایا جو کابل اور لاہور کے درمیان سب سے بڑا شہر تھا، سلطان محمد خاں کے حق میں، جو مجاہدین کے مقابلہ پر لشکر جرار لے کر آیا تھا، اور پوری طاقت کے ساتھ ان سے جنگ کر چکا تھا، اور ان کے ساتھ کسی قسم کی نرمی اور رعایت روا نہ رکھی تھی، اور کسی کی ناموس کا پاس نہ کیا تھا اب حجت تمام ہو چکی تھی، اور اس نے پشاور کی فتح کے لئے راستہ کھول دیا تھا۔

آپ نے موضع تورد سے موضع مردان کی طرف لشکر کے ساتھ کوچ کیا، آپ گھوڑے پر سوار پیادوں کی جماعت میں تھے، سواروں کا لشکر آگے پیچھے تھا، دو جھنڈے پیادوں میں تھے، اور ایک سواروں میں، اور تینوں کے جھنڈے فضا میں لہرا رہے تھے، مولوی محسن علی، مولوی خرم علی صاحب کا لکھا ہوا رسالہ نظم جہادیہ باآواز بلند خوش الحانی کے ساتھ پڑھتے جاتے تھے، جس کی وجہ سے لوگوں پر ایک خاص کیف طاری تھا۔

سید صاحب نے مردان میں دو راتیں گزاریں پھر پشاور کی طرف روانہ ہوئے راستہ کے بعض دیہاتوں میں لوگوں نے درانیوں کے ظلم و ستم کی آپ سے شکایت کی، وہاں سے پشاور پندرہ سولہ میل تھا، لیکن دریا پر کوئی کشتی نہ مل سکی درانیوں نے دریا عبور کر کے کشتیوں کو ڈبو دیا تاکہ غازیوں کے ہاتھ نہ لگیں، بہر حال دریائے سوات کو جو ایک طرف سے پایاب تھا عبور کیا، اور متھ میں قیام ہوا، وہاں کے لوگ لشکر کی آمد سے بہت خوش ہوئے

اور کہتے تھے، سبحان اللہ یہ عجیب لشکر ہے کہ باوجود اس کے کہ چھ سات ہزار پیادہ وسوار سے پڑاؤ ڈالا ہے لیکن کسی پر کوئی ظلم وتعدی نہیں ہے، اس کے برخلاف درانیوں کے دو پیادے آجاتے تھے، تو ہم لوگ گھر چھوڑ کر پہاڑوں میں پناہ لیتے تھے، غرض لشکر اسلام جس موضع سے گزرتا لوگ اس کو دل سے خوش آمدید کہتے، عورت مرد... اکثر راستہ کے دونوں طرف کھڑے ہو کر سید صاحب کو سلام کرتے اور برکت حاصل کرتے۔

دو تین روز اس نواح میں قیام ہوا، اس علاقہ کے ارباب حل وعقد آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور پشاور کا انتظام سنبھال لینے کی درخواست کی آپ نے اُن سے پوچھا کہ تمہارے یہاں کس طرح انتظام ہوتا ہے، انھوں نے کہا کہ سرداران پشاور کی طرف سے خراج محاصل کا یہ اُصول ہے کہ رعایا کی کھیتی کا غلہ نصف وصول کر لیتے ہیں، اور منشی اور غلہ تولنے والوں کا بھی رعایا کے ذمہ ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رعایا کے حصہ میں پیداوار کا صرف تہائی حصہ آتا ہے، آپ نے فرمایا کہ رعایا پیداوار کا تہائی حصہ نقد کی صورت میں ہم کو ادا کر دے باقی سارے انتظامات کا خرچ امام کے ذمہ ہے نہ کہ رعایا کے، آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر ہمارے انتظام میں کسی سے مزدوری یا نوکری پر کام لیا جائے گا تو اس کی اجرت دی جائے گی البتہ اگر کوئی سوار یا پیادہ تحصیل وصول کے لئے دیہات کے خوانین کے پاس جائے تو ان کو چاہیئے کہ اس کو اپنا بھائی سمجھ کر اس کی دعوت کریں، اور اس کو چاہیئے کہ وہ کسی چیز کی فرمائش نہ کرے اگر خوانین سے وہ کسی چیز کی فرمائش کرے تو ہمارے یہاں اس کی باز پرس ہوگی۔

جب لشکر پشاور کے قریب ہوا تو سید صاحب کو اطلاع ملی کہ سلطان محمد خاں نے اپنے متعلقین کو کوہاٹ بھیج دیا ہے، اور خود اپنے لشکر کے ساتھ کسی دیہات میں پڑے

ہوئے ہیں، فیض اللہ خاں سلطان محمد خاں کی طرف سے وکیل ہو کر آئے اور سلطان محمد خاں کی طرف سے عرض کیا کہ ہم سے بڑا قصور ہوا کہ ہم نے آپ کا مقابلہ کیا، ہم اپنے قصور سے توبہ کرتے ہیں، آپ ہمارا قصور معاف فرمائیں، اور یہاں سے پلٹ جائیں، وہ بھی کہتے ہیں کہ اگر کوئی کافر بھی آپ کی خدمت میں آکر ایمان لائے آپ اس کو ضرور مسلمان بنائیں گے میں تو مسلمان اور مسلمان زادہ ہوں اپنی غلطی کا اقرار کرتا ہوں اب کبھی مجھ سے ایسی تقصیر نہ ہوگی، مدت العمر آپ کا تابع رہوں گا۔

سید صاحب نے یہ سن کر فرمایا کہ "خان بھائی ہم کو تمہاری خاطر منظور ہے مگر یہاں سے پلٹ جانے میں یہ بات ہے کہ تمہارے سردار اس کا احسان نہ مانیں گے، یہاں سے انشاء اللہ کل پشاور کو چلیں گے، اگر وہ اپنے عہد و پیمان پر سچے دل سے قائم ہیں، تو ہم ان کو اپنی طرف سے پشاور میں بٹھا کر چلے آئیں گے، اس لئے کہ ہم اس ملک میں صرف اس واسطے آئے ہیں کہ یہاں کے سب بھائی مسلمانوں کو متفق کر کے کافروں پر جہاد کریں کہ اسلام کی ترقی اور کفار مغلوب ہوں"، سید صاحب نے سردار فتح خاں اور ارباب بہرام خاں کو بلا کر فرمایا کہ تم اپنے لوگوں کو یہ خبر پہونچا دو کہ آج پشاور کو چلنا ہوگا خبردار کوئی بھائی رعایا پر دست اندازی نہ کرے اس لئے کہ سلطان محمد خاں کی طرف سے صلح کا پیغام ہے، پھر آپ نے ارباب بہرام خاں سے فرمایا کہ تم اپنے کسی معتبر آدمی کو پشاور بھیج دو کہ جا کر بازار میں پکار دے کہ آج سید صاحب کا لشکر یہاں آئے گا سب دکاندار اپنی اپنی دکان کے دروازے بند کرلیں کہ کسی کا کچھ مال و اسباب جاتا نہ رہے۔

اس کے بعد آپ نے لشکر کی روانگی کا اعلان کیا، مجاہدین نے اپنی تیاریاں مکمل کرلیں، کچھ دیر میں عصر کی اذان ہوئی وہیں سب نے نماز پڑھی، سید صاحب نے ننگے سر ہو کر

دعا کی اور وہاں سے لشکر کے ساتھ روانہ ہوئے، سواروں کا دستہ آپ کے پیچھے تھا، اور پیادوں کی صف آگے تھی، مغرب کی جانب کابلی دروازہ سے بازار میں ہو کر شہر میں داخل ہوئے بازار کی دکانیں تو بند تھیں، مگر جا بجا سبیلیں پانی شربت کی رکھی تھیں، جا بجا چراغ دکانوں کے چبوتروں اور دکانوں کی چھتوں پر روشن تھے اور تمام لوگ سید صاحب اور غازیوں کے لئے دعائے خیر کر رہے تھے، سید صاحب کا گول گٹھڑی میں جو ایک وسیع پختہ سرائے تھی، قیام ہوا، لشکر سرائے کے باہر ٹھیرا، پہرہ کا انتظام کیا گیا اور لشکر چاق و چوبند اور ہر خطرہ کے مقابلہ کے لئے تیار ہو گیا، راستوں اور محلوں اور گزرگاہوں پر بھی نگراں و محافظ تعینات کر دیئے گئے۔

صبح سید صاحب نے حویلی میں نماز پڑھی اور دعا کی، دعا کے بعد آپ نے ارباب بہرام خاں سے کہلا بھیجا کہ بازار کے دکانداروں کو حکم بھجوادیں کہ سب دکاندار اطمینان سے دکانیں کھولیں کوئی کسی پر ظلم نہ کرے گا، چنانچہ دکانداروں نے دکانیں کھول لیں، زنانِ بازاری جن کی پشاور میں بڑی تعداد تھی، روپوش ہو گئیں اگر کسی مرد نے ان کے یہاں جانا چاہا تو انھوں نے پکار کر کہا خبردار یہاں نہ آنا ورنہ نہ تمہاری خیر ہو گی نہ ہماری، اسی طرح سے بھنگ اور شراب کی دکانیں بند ہو گئیں اور پینے والے غائب ہو گئے، سید صاحب نے اس بات کی سخت ہدایت کی کہ لشکر کا کوئی آدمی پشاور کے باغات کا ایک پھل بھی نہ توڑے۔

دو روز متواتر اہل لشکر بھوکے رہے، اور بلا کچھ کھائے پیئے رات گزاری، شہر میں اناج کے ذخیرے اور دکانیں تھیں، لیکن کسی لشکری نے ان پر دست درازی کی کوشش نہ کی، آخر میں ارباب بہرام خاں نے شہر کے مہاجنوں سے قرض لے کر ان

دکانوں سے آٹا خریدا تنور والوں کے یہاں روٹیاں پکوا کران کو اجرت دی اور تیسرے روز لشکر والوں کو کھانا ملا، راستہ میں اہل لشکر ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ آج پشاور چل کر انگور، انار، سیب، ناشپاتی وغیرہ خوب کھائیں گے، اور بارے کے چاول اور دنبوں کا گوشت پکائیں گے، جس وقت لوگ روٹی کھا رہے تھے، آپس میں کہہ رہے تھے کہ یہ جو تیسرے روز روٹی ملی یہ ہماری اسی خام خیالی کی سزا ہے۔

درانی لشکر کا ایک حصہ مجاہدین کے داخلۂ پشاور سے پہلے اس تاک میں تھا کہ پشاور کے راستہ میں کہیں حملہ کرے، لیکن اس کو موقع نہیں مل سکا، اور لشکر بخیر و عافیت پشاور میں داخل ہو گیا، اس سے سلطان محمد خاں کے لشکر والوں کے دل ٹوٹ گئے، اور اِدھر اُدھر جتنے سوار و پیادے تھے، وہ حیلے بہانے کر کے اپنی اپنی بستی کو چلنے لگے، اب اس کو جنگ کی کوئی صورت نظر نہ آئی اور اس نے بدحواس ہو کر ارباب فیض اللہ خاں کے ذریعہ سید صاحب کو یہ پیغام بھجوایا کہ آپ ہمارے دین و دنیا کے مقتدا اور امام ہیں، اور ہم آپ کے ہر طرح مطیع و فرماں بردار ہیں۔

ہم سے بڑا قصور ہوا کہ اپنی شامت اعمال سے ہم نے آپ کے اوپر لشکر کشی کی، ہم اپنی سزا کو پہنچے، اب ہم آپ کے اخلاق کریمانہ سے امیدوار ہیں کہ آپ ہمارا قصور معاف کر دیں، اب ہم تمام شرارتوں سے توبہ کرتے ہیں، انشاء اللہ پھر ہم سے کبھی ایسی حرکت نہ ہوگی۔

ان کی یہ تمام تقریر سن کر سید صاحب نے فرمایا کہ "خان بھائی تم ان کے بیچ میں نہ پڑو وہ بڑے لسّان اور اپنی غرض کے یار ہیں، ان کے عہد و پیمان کا کچھ ٹھکانا نہیں، اپنے مطلب کے لئے ایسے لوگ ہر طرح تابعدار بن جاتے ہیں، اور جب مطلب نکل جاتا ہے

تو یہ لوگ کسی کے آشنا نہیں ہوتے، نہ دنیا کی شرم رکھتے ہیں، نہ خدا اور رسولؐ کا خوف، ہم نے ان کو اس لڑائی سے پہلے بھی جب وہ یہاں سے لشکر لے کر گئے تھے، کئی بار آدمی بھیج کر سمجھانے کا حق ادا کر دیا، مگر انھوں نے ایک نہ سنی اور ناحق ہمارا مقابلہ کیا اور ہمارے بہت سے غازیوں کو شہید کیا، مگر اللہ تعالےٰ نے ہم غربا و ضعفا کو ان پر فتحیاب کیا اور وہ شکست کھا کر بھاگے، ہم نے یہاں تک ان کا پیچھا کیا، اب انھوں نے خیال کیا کہ اب ہمارا ٹھکانا نہیں ہے، تب تم کو درمیان میں ڈال کر یہ چال چلی۔

اس سے پیشتر شیدو کی لڑائی میں ہم سے بدھ سنگھ کا مقابلہ تھا، وہاں یہ چاروں بھائی اپنی اپنی جماعت کے ساتھ ہماری کمک کو آئے تھے، انھوں نے اپنی دغا بازی سے ہماری لڑائی بگاڑ دی۔ ہم لوگوں کو سکھوں سے بھڑا کر آپ بھاگ کھڑے ہوئے اور صدہا مسلمان شہید کروائے، تب بھی انھوں نے ہمارے ساتھ عہد و پیمان کیا تھا کہ ہم جان و مال سے تمہارے شریک ہیں، پھر اس عہد کو کیسے وفا کیا، تم سب جانتے ہو، اب از سر نو عہد کرنے کو کہتے ہیں، تو اپنے دل میں ایسا ہی سمجھ لیا ہوگا کہ اپنی غرض نکل جائے پھر جیسا ہوگا دیکھا جائے گا، خان بھائی ہم نے تم سے جو جو باتیں بیان کی ہیں، اچھی طرح سے بے کم و کاست ان کے آگے کہنا' اور خان بھائی تم خوب جانتے ہو کہ ہم لوگ ہندوستان سے اس ملک میں آئے ہیں، تو صرف اس نیت سے کہ مسلمان غالب ہوں اور اسلام کی ترقی ہو، نہ ہم کو پشاور لینے سے غرض ہے نہ کابل لینے سے، اگر ان کے عہد و پیمان کی صداقت ہم پر ثابت ہو جائے، اور منہیات شرعی اور شرکت کفار سے وہ سچی توبہ کریں اور ہم مسلمانوں کے اتفاق میں شامل ہوں تو ہم اب بھی موجود ہیں۔

ارباب فیض اللہ خاں نے عرض کیا کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں، حق اور بجا ہے،

اس میں چون وچرا کی گنجائش نہیں، جو کچھ خطا ہے، انھیں کی ہے انشاء اللہ تعالےٰ میں لفظ بہ لفظ آپ کا فرمانا ان سے عرض کروں گا، میں صاف دل مسلمان ہوں، منافقانہ گفتگو مجھ کو نہیں آتی ان کا تو میں نمک خوار ہوں، اور آپ کا خادم فرمانبردار، دونوں کی خیر خواہی مجھ کو منظور ہے۔

تیسرے چوتھے روز وہ پھر آئے، اور کہا کہ میں نے آپ کی اس روز کی تقریر لفظ بہ لفظ سلطان محمد خاں سے نقل کی وہ سن کر بہت نادم وپشیمان ہوئے، اور کہا کہ سید بادشاہ نے جو کچھ فرمایا اس میں سرِ مو تفاوت نہیں، مگر اب ہم خالص دل سے عہد وپیمان کرتے ہیں کہ انشاء اللہ ہم سے بغاوت ونافرمانی کا کوئی کام ظہور میں نہ آئیگا، باغیوں اور کافروں کی رفاقت اور شرکت سے ہم نے توبہ کی خدا اور رسولؐ کا جو حکم ہے، وہ ہمارے سر آنکھوں پر، اس وقت جس جگہ جہاد فی سبیل اللہ کے واسطے سید بادشاہ ہم کو یاد کریں گے، اسی وقت اور اسی جگہ ہم بلا عذر اپنی جان ومال اور فوج لشکر سے حاضر ہوں گے، اب ہم یہ چاہتے ہیں کہ سید بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت امامت کی تجدید کریں، اور تمام منہیات شرعیہ سے بالمشافہ تائب ہوں اور جو کچھ سید بادشاہ کا ملک سمہ سے یہاں تک تشریف لانے میں خرچ ہوا ہے، وہ تو ہم کو معلوم نہیں کس قدر ہوگا، مگر چالیس ہزار روپیہ ہم نذر کریں گے بیسؔ ہزار تو اس وقت جب سید بادشاہ اپنے ہاتھ سے ہم کو بٹھا کر کوچ کریں گے، اور دسؔ ہزار روپے جب سید بادشاہ ہشت نگر پہونچیں گے، وہیں بالاحصار سے ملیں گے، اور دسؔ ہزار روپے جب پنجتار پہنچیں گے، آپ نے فرمایا کہ خان بھائی ہم تو یہی چاہتے ہیں کہ وہ مسلمان کے اتفاق میں شریک ہوں اور کفار کا مقابلہ کریں ہم نہ کسی کی ریاست چھیننے کو آئے ہیں

نہ کسی کا ملک لینے کو، یہ تو اس دنیا دار شخص کا کام ہے، جو ملک گیری کا ارادہ رکھتا ہو، ہم صرف جہاد فی سبیل اللہ کی نیت رکھتے ہیں کہ کفار کو زیر کریں کہ اسلام کی ترقی ہو اگر وہ سچے دل سے اس اقرار پر مستعد ہیں تو ہم بھی اس بات سے انشاء اللہ تعالیٰ باہر نہ ہوں گے۔

رفتہ رفتہ یہ خبر تمام پشاور میں پھیلی جو ہندو اور مسلمان وہاں کے تھے، سب کو تشویش ہوئی اور ان میں کچھ سربر آوردہ آدمی مولانا اسماعیل صاحب کے پاس آئے، اور کہا کہ ہمارے شہر میں عام طور سے مشہور ہے کہ سید بادشاہ نے پشاور دُرانیوں کے سپرد کرنے کا ارادہ فرمایا ہے، ہم کو بڑی خوشی تھی کہ سید بادشاہ یہاں کے حاکم ہوئے اللہ تعالیٰ نے ہم کو ان ظالموں کے ہاتھ سے نجات دی، اب چین سے رہیں گے، لیکن اس خبر سے نیا کھٹکا پیدا ہوا کہ پھر ہم لوگ انھیں کے چنگل میں گرفتار ہوں گے، اور اب پہلے کی بہ نسبت ہم لوگوں کو زیادہ ستائیں گے، ہم لوگ ان سے خوب واقف ہیں، ان کی اطاعت و فرمانبرداری میں ایک عمر بسر ہوئی اس ملاپ کے پردہ میں محض فریب ہے، ہمارا مدعا یہ ہے کہ آپ ہم لوگوں کو سید بادشاہ کے پاس لے چلیں۔

ان کی یہ تقریر سن کر مولانا نے فرمایا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ وہ ایسے ہی ہیں، مگر اس امر میں ہم سید صاحب سے کچھ عرض نہیں کر سکتے، تم کو جو کچھ کہنا ہو ارباب بہرام خاں سے جا کر کہو، وہ تم کو سید صاحب کے پاس لے جائیں گے، اور تمہاری طرف سے گفتگو بھی خاطر خواہ کریں گے، اس لئے کہ وہ بھی تمہارے ملک کے ہیں، اور تمہارے اور درانیوں کے حالات سے خوب واقف ہیں۔

انھوں نے یہ تجویز پسند کی اور ارباب بہرام خاں کے پاس گئے خان موصوف

نے ان کی تسلی تشفی کی اور کہا تم جا کر اپنا کاروبار کرو شام کو ہمارے پاس آنا اس وقت تم کو حضرت کے پاس لے چلیں گے، اور تمہاری طرف سے وکالت کریں گے۔

کچھ دیر کے بعد لشکر کے خاص قندھاری اور سمہ کے بڑے بڑے خوانین ارباب بہرام خاں کے پاس آئے اور اپنی تشویش اور خطرہ کا اظہار کیا، اور درانیوں کے ظلم اور ان کی زیادتیاں بیان کیں، اور خواہش کی کہ یہ ساری گفتگو سید صاحب کے گوش گزار کر دی جائے، ارباب بہرام خاں نے ان کو اطمینان دلایا کہ وہ سید صاحب کی خدمت میں ان کی پوری ترجمانی اور نمائندگی کریں گے۔

عشا کی نماز کے بعد ارباب بہرام خاں اپنے بھائی ارباب جمعہ خاں کے ساتھ سید صاحب کی خدمت میں گئے، اور کہا کہ حضرت کچھ بات آپ سے تنہائی میں عرض کرنی ہے، یہ سن کر وہ آدمی جو وہاں تھے، اٹھ کر چلے گئے، ارباب بہرام خاں نے اہل شہر کے نمائندوں کی گفتگو نقل کی اور ان کی تشویش کا اظہار کیا اور کہا اہل شہر کہتے ہیں کہ جب درانی از سر نو اس شہر پر قابض اور متصرف ہوں گے تو ہم پر اور بھی ہاتھ صاف کریں گے، اس واسطے کہ سید بادشاہ کے یہاں تشریف لانے پر جو ہم لوگوں نے خوشیاں منائی تھیں، ان کو اس کی ذرا ذرا خبر پہنچی وہ آپ کے چلے جانے کے بعد ہم پر غصہ اتاریں گے اور ہماری تباہی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھیں گے شہر والے کوئی اس بات پر راضی نہیں ہیں کہ سید بادشاہ پشاور ان کے حوالہ کر کے یہاں سے تشریف لے جائیں، اگر سید بادشاہ کو اپنے لشکر کے خرچ اور یہاں کے بندوبست کے لئے دو چار لاکھ روپے کی بھی ضرورت ہو تو ہم اس کی بھی سبیل کر دیں گے اور اس کے سوا جو کچھ بھی وہ فرمائیں گے، ہم کو عذر نہ ہوگا۔

اہلِ شہر کے علاوہ فتح خاں پنجتاری اور اسمٰعیل خاں کو چھوڑ کر سمہ کے سب خوانین اور لشکر کے فلاں فلاں قندھاری بھی میرے پاس آئے اور انھوں نے درانیوں کی بیوفائی اور بدعہدی اور اپنی تباہی، خانہ ویرانی، اور بے عزتی کا حال بیان کیا اور کہا کہ ہم ہرگز اس بات پر راضی نہیں ہیں، کہ سید بادشاہ ان سے مصالحت کریں اور پشاور ان کو دیں، ان سب نے مجھ سے کہا کہ تم ہماری طرف سے وکالتاً تمام باتیں سید بادشاہ کے گوش گزار کر دو میں نے ان سے اقرار کیا کہ میں تمہاری طرف سے عرض کر دوں گا۔

ان سب کا خیال کر کے میری ناقص رائے میں یوں آتا ہے، کہ اگر آپ کو پشاور دینا ہی منظور ہے، تو آپ مجھی کو سرفراز فرما دیں میں بھی آپ کا ایک ادنیٰ خادم ہوں اور یہیں کا باشندہ ہوں، اور یہاں کے راہ و رسم سے خوب واقف ہوں تمام رعایا مجھ سے راضی بھی ہے، اگر آپ یہ ریاست مجھے سپرد کر کے یہاں سے تشریف لے جائیں گے، تو میں درانیوں سے سمجھ لوں گا، اب جو کچھ آپ ارشاد کریں میں ان کو وہی جواب دوں۔

ارباب بہرام خاں کی پوری گفتگو سُن کر سید صاحب نے سکوت کے بعد فرمایا، جزاک اللہ، خان بھائی تم نے خوب کیا کہ جو سب لوگوں کے حال کی مجھ کو اطلاع کی، اور جو ہمارے لشکر کے بھائی اور شہر کے لوگ درّانیوں کی غدّاری اور حیلہ سازی بیان کرتے ہیں، وہ سچ ہے، بلکہ میرے پروردگار نے مجھ پر جو ان کا حال منکشف کیا ہے، اگر وہ بھائی لوگ جان لیں تو خدا جانے کیا کریں، مگر تم سب خوب جانتے ہو کہ ہم لوگ ہندوستان سے گھر بار چھوڑ کر اور عزیزوں آشناؤں سے منھ موڑ کر صرف اس لئے آئے ہیں کہ وہ

کام کریں جس میں پروردگار کی رضامندی وخوشنودی ہو مخلوق کی خوشی وناخوشی سے ہم کو کچھ غرض نہیں، خوش ہوں گے تو کیا بنائیں گے اور ناخوش ہوں گے تو کیا بگاڑیں گے؟ نادان سمجھتے ہیں کہ یہ ملک گیری اور دنیا طلبی کے لئے آئے ہیں، یہ ان کا خیال خام ہے، ابھی وہ دین اسلام سے واقف نہیں ہیں۔

اور جو سمہ کے خوانین بھائی ان کے ظلم وتعدی کا شکوہ اور اپنی بے عزتی اور خانہ ویرانی کا قصہ بیان کرتے ہیں، یہ سب سچ ہے، اس بات کو یوں سمجھیں کہ ہمیشہ سے کافر وباغی اور منافق مسلمانوں پر طرح طرح کی تعدی اور مکاری کرتے رہے ہیں مگر جس وقت اللہ کی رضامندی کا کام، مقابلہ میں آجاتا ہے، اس وقت سب بغض وعداوت کو اپنے دل سے دُور کرتے ہیں، اور زبان پر نہیں لاتے اور ان کے ساتھ وہی معاملہ کرتے ہیں جس میں پروردگار کی رضامندی اور اس کے فرمان کی تعمیل ہو، اگرچہ نفس اور ابنائے زمانہ کے مخالف ہو، مسلمانی اور دینداری وخداپرستی اسی کا نام ہے، نہیں تو نفس پروری اور دنیا داری ہے۔

اور جو اپنے قندھاری بھائی شکایت کرتے ہیں کہ ہمارے اتنے بھائی انھوں نے شہید کئے تو یہ بات شکر کے لائق ہے، نہ کہ شکایت کے۔ اس لئے کہ وہ سب بھائی اپنی دلی مراد کو پہنچے وہ اسی مطلب کے حصول کے لئے یہ تمام تکالیف ومصائب اٹھا کر اتنی دُور دراز کی مسافت سے جہاد فی سبیل اللہ کو آئے تھے کہ اپنے پروردگار کی رضامندی کی راہ میں اپنی جانیں صرف کریں، سو وہی انھوں نے کیا اور یہ جہاد کا کاروبار صرف پروردگار کی رضامندی کا ہے، نفسانیت اور جنبہ داری کا نہیں ہے، جیسے دنیا دار اور جاہ طلب لوگ کرتے ہیں۔

اور جو شہر والے اس بات کا خوف کرتے ہیں کہ ہم نے جو سید صاحب کے آنے سے

خوشیاں کی ہیں، اس لئے وہ ہم کو تباہ کردیں گے یہ ان کی نافہمی اور نادانی ہے، یہ نہیں جانتے کہ اگر وہ رعایا کو تباہ وخراب کریں گے تو حاکم رئیس کس کے کہلائیں گے، رعایا تو بے بس اور عاجز ہوتی ہے، جو کوئی اس پر غالب آجاتا ہے، اس کی وہ تابع اور فرماں بردار ہوجاتی ہے، اور جو تابعدار نہ ہو تو کہاں رہے، رعایا کو کوئی خراب نہیں کرتا، اس کا حاکم نہ کوئی غنیم، بلکہ دونوں اس سبب سے آرام پاتے ہیں، اور سردار کہلاتے ہیں، رعایا میوہ دار باغ کی طرح ہے کہ مالک اور غیر مالک سب اس کے میوے سے فائدہ حاصل کرتے ہیں، کوئی میوہ دار درخت کو تباہ نہیں کرتا، اور جو باغ ہی کاٹ ڈالے گا تو باغ والا کیوں کر کہلائے گا اور فائدہ کیا پائے گا، سو خان بھائی تم ان کی تسلی کرکے سمجھا دینا کہ انشاء اللہ تعالے تم کو کوئی تباہ وخراب نہ کرے گا۔

اور جو یہ کہتے ہیں کہ اگر ضرورت ہو تو شہر کے انتظام اور لشکر کے خرچ کے لئے ہم دو چار لاکھ روپے کا بندوبست کردیں، مگر یہاں کی حکومت درّانیوں کو نہ دیں، سو یہ بات ہم کو منظور نہیں، اس لئے کہ ہم کو اپنے پروردگار کی رضامندی چاہیئے، جس میں وہ راضی ہوگا وہ ہم کریں گے، اس میں چاہے تمام جہان ناخوش ہو کچھ پروا نہیں، اگر ایک جگہ ہفت اقلیم کی دولت اور سلطنت پروردگار کی رضامندی کے خلاف ملتی ہو تو اس دولت اور سلطنت کی کچھ حقیقت نہیں، اور ایک جگہ پروردگار کی رضامندی کے موافق ہفت اقلیم کی دولت اور سلطنت جاتی ہو تو اس کی رضامندی سب کچھ ہے۔

خلاصہ اس گفتگو کا یہ ہے کہ سلطان محمد خاں اپنی خطا وقصور سے نادم وتائب ہوا ہے، اور شریعت کے تمام احکام کو اس نے قبول کیا ہے، اور کہتا ہے کہ اب دوبارہ بغاوت وشرارت اور خدا اور رسولؐ کی مرضی کے خلاف کوئی فعل نہیں کروں گا، میری خطا

للہ معاف کرو، اگر یہ کلام نفاق اور دغا بازی سے کرتا ہے، تو وہ جانے اس کا خدا جانے، شریعت کا حکم تو اقرار ظاہری پر ہے، کسی کے دل کے حال پر نہیں، دل کا حال خدا کو معلوم ہے ہم تو اس کے ساتھ وہی معاملہ کریں گے، جو ظاہر شریعت کا حکم ہے چاہے کوئی راضی ہو، چاہے ناراض ہو، اب جو ہم اس کا عذر نہ مانیں تو اس پر ہمارے پاس کوئی دلیل اور حجت ہے؟ اگر کوئی عالم دیندار خدا پرست کسی دلیل شرعی سے ہم کو سمجھا دے کہ تم خطا پر ہو تو ہم منظور کر لیں گے، اس کے بغیر ہرگز نہ مانیں گے، کیونکہ ہم تو خدا اور رسول کے تابع ہیں، اور کسی کے تابع نہیں ہیں۔

جس وقت سید صاحب یہ تقریر فرما رہے تھے، اس وقت رحمت الٰہی کا عجیب نزول ہو رہا تھا، روتے روتے ارباب بہرام خاں اور ارباب جمعہ خاں کے ہچکیاں لگ گئی تھیں، اور وہ عالم سکوت میں بیہوش اور خود فراموش تھے، جب آپ خاموش ہوئے، تب ارباب بہرام خاں نے عرض کی جو کچھ آپ نے فرمایا، حق اور بجا ہے، خدا اور رسول کی رضامندی کے کاموں سے آپ ہی واقف ہیں، ہم دنیا داروں اور نفس پرستوں کو کیا خبر ہے؟ ہم نے اس وقت جانا کہ دین اسلام اس کو کہتے ہیں، اور خدا اور رسول کی اطاعت اس کا نام ہے، اور جو خیال اس کے خلاف میرے دل میں تھا، اب میں اس سے آپ کے سامنے توبہ کرتا ہوں اور از سر نو آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں، آپ میرے لئے دعا کریں۔

صبح ارباب بہرام خاں نے سمہ کے سرداروں اور قندھاریوں کے سامنے سید صاحب کی رات کی تقریر دہرائی، وہ بھی سب مطمئن اور خاموش ہو گئے، لیکن شہر والوں کو اطمینان نہیں ہوا اور انھوں نے کہا کہ سید بادشاہ تو ولی شخص اور اللہ والے لوگ ہیں، انھوں نے جو کچھ فرمایا بجا فرمایا ہماری تو صرف یہ غرض تھی کہ اگر سید بادشاہ یہاں کے حاکم ہوتے تو ہم رعایا لوگ آرام اور چین سے گزران کرتے اور درانیوں کے جور و جفا سے نجات پاتے، مگر

سید بادشاہ اپنے کاروبار کے مختار ہیں، جو کچھ اپنے نزدیک بہتر جانیں وہ کریں اس میں ہم ناچار ہیں۔

شہر کے سیٹھوں نے جو دیکھا کہ ارباب بہرام خاں کے ذریعہ مطلب برآری نہیں ہوئی تو انھوں نے آپس میں صلاح و مشورہ کر کے ایک سیٹھ کو سید صاحب کے پاس بھیجا جس کا نام بدھ رام تھا، اس نے کچھ میوہ کئی ٹوکروں میں اور زرِ نقد نذر کیا اور عرض کی کچھ تنہائی میں آپ سے عرض کرنا ہے۔ اس وقت جو لوگ وہاں حاضر تھے، پہرہ والوں کے سوا آپ نے سب کو رخصت کر دیا اور سیٹھ صاحب سے پوچھا کیا کہتے ہو؟

اس نے عرض کی کہ شہر میں مشہور ہے کہ سید بادشاہ سلطان محمد خاں کو یہاں کی ریاست و حکومت پھر دیتے ہیں، یہ خبر سن کر یہاں کے سیٹھوں کو بڑا تردد اور اندیشہ ہوا کہ ہم تو یہاں سید بادشاہ کے تشریف لانے سے بہت خوش ہوئے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے منصف، خدا ترس اور غریب پرور حاکم کو یہاں بھیجا، اب ہم لوگ آرام چین سے گزران کریں گے، لیکن اب یہ مشہور ہو رہا ہے کہ آپ حکومت پھر انھیں کے حوالہ کر رہے ہیں، اس وجہ سے سب سیٹھوں نے اپنی طرف سے مجھے مختار کر کے بھیجا ہے کہ جس صورت سے سید بادشاہ راضی ہوں اس صورت سے راضی کرو اور یہاں سے جانے نہ دو۔

سو خدمت شریف میں میری عرض یہ ہے کہ آپ کس لئے یہ ملک سلطان محمد خاں کو دیتے ہیں، اگر یہ سبب ہے کہ آپ کے پاس فوج و لشکر کم ہے، اور اس کے لئے لشکر بہت چاہیئے، اور اس کے انتظام کو خزانہ بھی بہت چاہیئے تو آپ اس کا اندیشہ نہ کریں آپ کے فرمانے کی دیر ہے میں آپ ہی کے پاس حاضر ہوں جس قدر روپیہ آپ فرماویں دو گھڑی کے عرصہ میں اسی جگہ روپوں کا ڈھیر لگا دوں اور ادھر آپ نوکر رکھنا شروع کر دیں جس قدر ضرورت ہو نوکر رکھ لیں اور اس کے سوا اور سبب ہو تو اس بات کو آپ جانیں۔

سید صاحب نے اس کی باتیں سن کر اس کو بہت شاباش دی اور فرمایا کہ تم بڑے لائق اور خیر خواہ شخص ہو جو کام تمہارے لائق تھا، اس میں تم نے کچھ کوتاہی نہیں کی ہم اس امر میں تم سے بہت خوش ہیں.... اور فرمایا سیٹھ جی تم یہ بات بہت اچھی کہتے ہو جو حاکم ملک گیری کا ارادہ رکھتے ہیں ان کے کام کی ہے، لیکن ہم ان حاکموں میں نہیں ہیں ہم اپنے مالک کے فرمانبردار ہیں، جو کچھ کام ہم لوگ کرتے ہیں، اسی کی مرضی کے موافق کرتے ہیں، لوگوں کے روبرو اس میں کچھ نقصان نظر آتا ہو یا فائدہ اس سے کچھ غرض نہیں، ہمارے مالک کا حکم ہے کہ کوئی کیسا ہی قصوروار ہو، جب وہ اپنے قصور سے توبہ کرے اور اپنی خطا کا عذر کرے تو اس کی خطا معاف کرنی چاہیے اور اس کا عذر قبول کرنا لازم ہے، اگر اس نے توبہ دغابازی سے کی ہو تو اس بات سے ہم کو کچھ کام نہیں وہ جانے اس کا خدا جانے اس کا مال و ملک زبردستی لینا درست نہیں، ہمارے اور سلطان محمد خاں کے درمیان اسی طور کا معاملہ ہے، اور تم جو لشکر اور خزانہ کا ذکر کرتے ہو تو ہمیں اس کا کچھ اندیشہ نہیں، چاہے ہو یا نہ ہو، کیونکہ ہمارے مالک کے یہاں سب کچھ ہے، کسی چیز کی کمی نہیں، اگر وہ اپنا کام ہم سے لے گا تو بہتر سے بہتر فوج و لشکر اور مال و خزانہ بغیر مانگے عنایت کرے گا۔

اور جو تم لوگوں کو یہ خوف ہے کہ وہ ہم کو تباہ و برباد کردیں گے تو یہ تمہارا وہم ہے، اس بات کا تم کچھ اندیشہ نہ کرو، کسی ریاست میں حاکموں کا یہ دستور نہیں کہ سیٹھوں، ساہوکاروں کو تباہ کریں کیونکہ ان کے سبب سے ان کے ملک و شہر کی آبادی ہوتی ہے، اور ان کے بڑے بڑے کام سیٹھوں ساہوکاروں سے نکلتے ہیں، اگر وہ سیٹھوں ساہوکاروں کو تباہ و برباد کردیں تو انھیں کا نقصان ہوگا، اور کوئی سیٹھ ساہوکار ان کی ریاست میں بود و باش اختیار نہ کریگا۔"

سید صاحب کا یہ جواب سن کر بدھ رام خاموش ہوگیا، اور کہنے لگا آپ سچے اللہ والے

لوگ ہیں، آپ کی باتوں کا کون جواب دے سکتا ہے؟ جو کچھ آپ فرماتے ہیں، سب بجا ہے، اس کے بعد وہ آپ سے رخصت ہو کر اپنے مکان کو چلا گیا۔[1]

---

[1] پشاور سے دستبرداری اور اس کو سلطان محمد خاں جیسے مخالف اور دشمن کے حوالہ کر دینے کا مسئلہ ایک ایسی گتھی ہے جس کے حل کرنے میں اس تحریک جہاد کے تاریخ نویسوں اور اس کے حامیوں اور وکیلوں کو اکثر دشواری پیش آئی ہے، بعض لوگوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ یہ فیصلہ شاید عجلت میں کیا گیا اور اس میں شرافت و مروت کا زیادہ لحاظ رکھا گیا، جو سید صاحب کے خمیر میں داخل تھی، اور اس معاملہ میں وہ اپنے مورث اعلیٰ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے "طریقہ کار" اور نقشِ قدم پر نظر آتے ہیں، جن کی سیاست کی بنیاد اصول و اخلاق پر تھی، مناسب یہ تھا کہ وہ ایسے مسئلہ میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیاست کی پیروی کرتے جس کی بنیاد اصولِ حکومت پر تھی۔

لیکن جن لوگوں کی اس زمانہ کے حالات پر زیادہ گہری نظر ہے، ان کی رائے میں سید صاحب نے جس بہترین اور عملی سیاست کا مظاہرہ کیا اس پر حرف گیری آسان نہیں، اس فیصلہ میں وہ تخیل پرست سے زیادہ عملی اور حقیقت پسند انسان نظر آتے ہیں، اگر وہ مخالف صورت اختیار کرتے یعنی پشاور کو اپنے تسلط میں رکھتے یا اپنے کسی مقرب کو اس کا حاکم بنا دیتے، تب بھی نتیجہ کچھ زیادہ مختلف نہ ہوتا، اور یہی بات بالآخر سامنے آتی مجھ سے بعض ثقہ راویوں نے جو افغانیوں کی قبائلی خصوصیات کا گہرا علم رکھتے تھے، اور اس عہد کے تغیرات و واقعات سے بخوبی آگاہ تھے، اور جنھوں نے ایک طویل زمانہ افغانستان میں گزارا تھا ـــــ بیان کیا کہ سید صاحب کا یہ منصوبہ یا فیصلہ درحقیقت بہت دور اندیشی اور دقیقہ رسی پر مبنی تھا، اس لئے کہ پائندہ خاں کا خاندان جو افغانستان اور سرحد پر قابض تھا، اور جس میں سخت قبائلی عصبیت پائی جاتی ہے، وہ کسی حال میں سلطان محمد خاں کے سوا (جو حکمراں خاندان میں سب سے بڑے بھائی، رہنما اور طویل عرصہ سے پشاور کے حاکم تھے) کسی اور شخص پر راضی نہ ہوتا، سید صاحب نے اس حقیقت کو تسلیم کیا، اور اخلاص و بے نفسی اور جاہ و اقتدار سے بے رغبتی کے ساتھ عملی سیاست اور اس پیچیدہ اور نازک صورت حال میں وہ بہتر سے بہتر راستہ اختیار کیا جو ممکن ہو سکتا ہے

(باقی صفحہ ٢٠٤ پر)

پشاور کی سپردگی

سلطان محمد خاں نے سید صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو لشکر کے اہل الرائے نے یہ رائے دی کہ پہلے مولانا محمد اسماعیل صاحب سردار سے ملاقات کریں دو تین ملاقاتوں میں ان کا رویہ معلوم ہو جائے گا اس کے بعد سید صاحب ملاقات کریں تو مضائقہ نہیں، چنانچہ پہلی بار ہزار خانی کے مقام میں (جو ارباب فیض اللہ خاں کا گاؤں ہے، اور پشاور سے جانب جنوب ایک میل یا اس سے کچھ زاید فاصلہ پر واقع ہے) مولانا محمد اسماعیل صاحب چالیس پچاس آدمیوں کے ساتھ ہزار خانی تشریف لائے اور اتنے ہی آدمیوں کی جمعیت کے ساتھ

(باقی ص ۲۰۳ کا) ــ یوں غیب کا علم صرف اللہ کو ہے اور ایک مجتہد کی رائے میں صحیح اور غلط دونوں کا احتمال پایا جاتا ہے، میرے نزدیک مشہور مصری مصنف اور محقق عباس محمود العقاد نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے موقف پر روشنی ڈالتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے، وہ اس صورت حال پر بھی صادق آتا ہے۔

"اپنے ذہن میں صورت حال کے تمام پہلو اور گوشے سامنے رکھ کر اور مختلف انجام اور نتائج فرض کرنے کے بعد جو بات سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ اس رائے کے علاوہ جو حضرت علی کو اختیار کرنی پڑی کوئی راستہ مامون و محفوظ نہ تھا، بلکہ شاید اس کی کامیابی کی امید بہت کم اور خطرات کہیں زیادہ تھے"۔

دوسری جگہ کہتے ہیں "کیا ان کے زمانہ کے یا ان کے بعد کے ناقدین کے دل میں کبھی یہ خیال گزرا کہ وہ اپنے دل سے یہ پوچھتے کہ حضرت علیؓ نے اس وقت جو کچھ کیا اس کے علاوہ بھی ان کیلئے کچھ کرنا ممکن تھا؟" (عبقریۃ علی بن ابی طالب)

سرداران پشاور آئے دونوں فریق محتاط تھے، سلطان محمد خاں کے متعلق یہ افواہ تھی کہ اس کی نیت خراب ہے، اور وہ دھوکہ کرنا چاہتا ہے، اس نے اس ملاقات میں مولانا اسماعیل صاحب کے سامنے توبہ کی اور مولانا نے سید صاحب کے نائب کی حیثیت سے اس سے بیعت لی، دوسری بار بھی اسی جگہ ملاقات ہوئی اور سلطان محمد خاں نے سید صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی جس کو سید صاحب نے منظور کر لیا۔

پشاور میں سید صاحب اور مجاہدین کو تین جمعے پڑھنے کا اتفاق ہوا، مولوی مظہر علی عظیم آبادی نے جہاد کے موضوع پر وعظ کہا وہ لوگوں کو فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں سمجھاتے تھے، ان کے وعظ میں ایسی رقت تھی کہ اکثر آدمی زار زار روتے تھے۔

حافظ عبداللطیف صاحب نے عرض کیا کہ اللہ تعالٰی نے حضرت کو اس ملک میں فتحیاب کیا ہے، شہر اور جوار شہر کے لئے دینی احتساب اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ضروری ہے فرمایا کہ آپ اور خضر خاں قندھاری اپنے ہمراہیوں کے ساتھ شہر کی تمام مساجد کا دورہ کریں اور نماز کی تاکید کریں جس کو تارک الصلاۃ پائیں، اس کی تادیب اور گوشمالی کی اجازت ہے، اہل فسق و معاصی آپ کے ڈر سے اور احتساب کے خوف سے روپوش ہو جائیں گے۔

حافظ صاحب نے خضر خاں اور دوسرے ساتھیوں کے ساتھ شہر کا گشت کیا اور نماز اور جماعت کے التزام کی تاکید کی، اور اس کا بہت اچھا اثر پڑا۔[۱]

ارباب فیض اللہ خاں سلطان محمد خاں کا پیغام پھر لائے کہ ملاقات کے لئے دن مقرر کر دیا جائے آپ نے اپنے مشیروں کو جمع کر کے فرمایا کہ سردار صاحب نے ملاقات کا دن دریافت کیا ہے، سو کس قدر آدمیوں کے ساتھ اور کس مقام پر اور کب بلائیں؟ ان اہل شوریٰ نے لشکر کے

---

[۱] منظورہ ص ۹۱۷، ۹۱۸

سب افسروں اور سمہ کے سب خوانین کو جمع کر کے مشورہ کیا، آخر میں مولانا محمد اسماعیل صاحب کی تجویز پر سب کا اتفاق ہوا کہ ان کو کہلا بھیجا جائے کہ تمام سواروں و پیادوں کے ساتھ تم آؤ اور یوں ہی ادھر سے ہم اپنے تمام لشکر کے ساتھ آتے ہیں، پھر دونوں کو اختیار ہے جتنی جمعیت کے ساتھ چاہیں، وہ آئیں، اور جتنی جمعیت کے ساتھ یہ چاہیں جائیں، اس میں نہ ان کو ہماری طرف سے شبہ ہوگا نہ ہماری طرف سے ان کو، اس سے ہر کوئی جانے گا کہ جو کچھ معاملہ ہوگا ہمارے سامنے ہوگا۔

ملاقات کے لئے ہزار خانی کا میدان سلطان محمد خاں کی طرف سے تجویز ہوا، ایک دن پہلے مولانا محمد اسماعیل صاحب ارباب بہرام خاں دو ڈھائی سو آدمیوں کے ساتھ میدان کو دیکھنے تشریف لے گئے، اور اچھی طرح گشت کر کے اس کا نشیب و فراز دیکھا، اگلے روز سید صاحب نے تمام لشکر میں کہلا بھیجا کہ سب بھائی اپنے ساز و سامان سے تیار رہیں، کل سویرے ہمارے ساتھ سلطان محمد خاں کی ملاقات کو چلنا ہوگا خوانین سمہ کو بھی اطلاع کر دی گئی، ارباب جمعہ خاں کو آپ نے بلا کر بتاکید فرمایا کہ کل سویرے ہم تو سلطان محمد خاں کی ملاقات کو جائیں گے، تم بدستور سابق اپنے لوگوں کے ساتھ خوب ہوشیاری اور خبرداری سے شہر کا بندوبست رکھنا۔

دوسرے روز لشکر کے غازی لوگ کمر باندھ ہتھیار لگا میدان میں جمع ہو کر آپ کا انتظار کرنے لگے کچھ دیر میں آپ وضو کر کے پوشاک پہن کر اور ہتھیار لگا کر حویلی سے باہر نکلے، سرائے کی مسجد میں دو رکعت نفل نماز پڑھی آپ کو دیکھ کر اور بھی بہت صاحبوں نے نفل کا دوگانہ پڑھا، پھر سر برہنہ کھڑے ہو کر بڑے الحاح وزاری کے ساتھ دعا کی تمام حاضرین پر ایک وجد کی سی حالت طاری تھی۔

دعا کے بعد آپ گھوڑے پر سوار ہو کر تشریف لے چلے پشاور کے باہر گورستان کے پاس (جہاں اخوند درویزہ بابا کا مزار ہے) کچھ دور آگے بڑھ کر گورستان کو پشت دے کر

کھڑے ہوئے وہیں تمام لشکر صف آرا ہوا، پشاور کے ہزاروں وضیع وشریف تماشا دیکھنے کو آئے تھے، آدمیوں کی کثرت سے میدان میں آدمیوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا، آپ نے ظہر کی نماز وہیں پڑھی، سلطان محمد خاں اپنی تمام جمعیت کے ساتھ آیا اور موضع ہزار خانی کی طرف پشت کر کے کھڑا ہوا۔

کچھ دیر کے بعد سردار ممدوح پندرہ بیس آدمیوں کو ہمراہ لے کر اس طرف سے چلا اور اسی قدر غازیوں کے ساتھ سید صاحب آگے بڑھے سردار موصوف نے پہلے ہی اس جگہ میدان میں زین پوش بچھا رکھا تھا جب اس کے اور سید صاحب کے درمیان سو سوا سو قدم کا فاصلہ باقی رہا تب آپ نے سب ساتھیوں کو وہیں ٹھہرا دیا، وہ سب وہیں کھڑے رہے، آپ گھوڑے سے اتر کر پیادہ پا صرف مولانا محمد اسماعیل اور ارباب بہرام خاں کو ہمراہ لے کر آگے چلے اس وقت مولانا ممدوح کمر میں فقط تلوار لگائے ہوئے تھے، اور ارباب بہرام خاں کی کمر میں تلوار اور ہاتھ ... میں شیر پنجہ تھا، آپ کو دیکھ کر سردار ممدوح نے بھی اپنے ساتھیوں کو روک دیا وہ بھی وہیں کھڑے رہے، فقط ارباب فیض اللہ خاں اور ایک شخص مراد علی کو اپنے ساتھ لے کر چلا اور سید صاحب سے السلام علیکم کر کے ملا اور مصافحہ کیا، پھر مولانا صاحب اور ارباب بہرام خاں سے مصافحہ کیا سید صاحب اور مولانا اسمٰعیل صاحب زین پوش پر بیٹھے اور ارباب بہرام خاں سید صاحب کی پشت پر کھڑے ہوئے اور اُدھر ارباب فیض اللہ خاں اور مراد علی سلطان محمد خاں کے پیچھے کھڑے ہوئے۔

مولانا محمد اسماعیل صاحب نے پہلے رجب خاں ٹپیٹ اور سلو خاں پھکیت کو جو قوی ہیکل اور چست و چالاک آدمی تھے، کہا کہ ملاقات کے وقت تم دونوں صاحب سید صاحب کے پاس پہنچ جانا اگر سید صاحب منع بھی کریں، تب بھی تم نہ ماننا وہ دونوں باوجود سید صاحب

کے ہاتھ سے منع کرنے کے بیس پچیس قدم کے فاصلہ پر کھڑے ہوگئے جس میدان میں آپ بیٹھے ہوئے گفتگو کر رہے تھے وہاں سے جنوب کی طرف ایک جوار کا کھیت تھا، اس میں سلطان محمد خاں نے پہلے سے چالیس پچاس سپاہی مسلح بٹھا رکھے تھے، مجاہدین کو یہ حال معلوم نہ تھا، اتفاقاً ان کی ایک جماعت کھیت کے قریب گئی تو دیکھا کہ کچھ لوگ کھیت میں چھپے بیٹھے ہیں، یہ غازی ان کی پشت پر کھڑے ہوگئے کہ مبادا کچھ دغا فریب ہو تو پہلے ہم ان کو سمجھ لیں مگر خدا کے فضل وکرم سے کوئی بات نہیں ہونے پائی.

سید صاحب نے کابل سے مایار کی جنگ تک جنگ کی ساری سرگزشت سلطان محمد خاں اور ان کے بھائیوں کے بیعت کرنے اور جہاد ورفاقت کے عہد وپیمان، پھر بار بار عہد شکنی اور چڑھائی کرنے اور کفار کا ساتھ دینے کا سب حال بیان کیا اور فرمایا کہ اب تک تمہارے بھائی اور تمہاری بغاوت کا سبب معلوم نہ ہوا کہ کیا ہے؟

سلطان محمد خاں نے بہت کچھ معذرت کی اور اپنی خطاؤں کا اقرار کیا اور کہا کہ ہماری نافرمانی اور بغاوت کا سبب یہ ہے یہ کہہ کر ایک لپٹا ہوا کاغذ اپنے خریطے سے نکال کر آپ کے سامنے رکھ دیا، آپ نے اس کو کھول کر دیکھا تو وہ ایک بڑا سا محضر تھا، جس پر ہندوستان کے بہت سے علماء اور پیرزادوں کی مہریں لگی ہوئی تھیں، خلاصہ مضمون یہ تھا کہ تم سرداروں اور خوانین کو لکھا جاتا ہے کہ سید احمد نامی ایک آدمی چند علمائے ہند کو متفق کر کے اس قدر جمعیت کے ساتھ تمہارے ملک میں گئے ہیں، وہ بظاہر جہاد فی سبیل اللہ کا دعویٰ کرتے ہیں، یہ صرف ان کا مکر وفریب ہے، وہ ہمارے اور تمہارے دین ومذہب کے مخالف ہیں، انھوں نے ایک نیا دین ومذہب نکالا ہے، وہ کسی ولی بزرگ کو نہیں مانتے سب کو برا کہتے ہیں، وہ انگریزوں کے بھیجے ہوئے تمہارے ملک کا حال معلوم کرنے گئے ہیں،

تم کسی طرح ان کے وعظ و نصیحت کے دام میں نہ آنا، عجب نہیں تمہارا ملک چھنوا دیں جس طرح تم سے ہو سکے ان کو تباہ کرو، اور اپنے ملک میں جگہ نہ دو اگر اس معاملہ میں سستی اور غفلت سے کام لوگے تو پچھتانا پڑے گا، اور ندامت کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

سید صاحب یہ مضمون پڑھ کر عالم حیرت میں رہ گئے آپ نے سردار موصوف سے فرمایا کہ ہندوستان میں دنیا دار علماء اور مشائخ پیر پرستی میں گرفتار ہیں اسی کو اپنا دین و آئین جانتے ہیں، حلال و حرام میں امتیاز نہیں رکھتے اور یہی ان کا ذریعہ معاش ہے ہمارے وعظ و نصائح سے اللہ تعالےٰ نے وہاں لاکھوں آدمیوں کو ہدایت نصیب کی وہ پکے موحد اور متبع سنت ہو گئے اس کی وجہ سے ان دنیا دار عالموں پیروں کے شرک کا بازار سرد ہو گیا اور اہل حق کی نگاہوں سے وہ گر گئے، اور جب ان سے کچھ نہ ہو سکا تب انھوں نے ہم پر بہتان و افترا کیا اور آپ کے پاس بھیجا مگر آپ سے بڑی غلطی ہوئی جواب تک اس امر کی اطلاع ہم کو نہ کی اور اپنا دین و دنیا کا نقصان کیا ورنہ یہ شک و شبہ ہم آپ کے دل سے پہلے ہی دور کر دیتے اس میں بھی خدا کی مصلحت ہوگی۔

آپ نے وہ محضر لپیٹ کر مولانا محمد اسماعیل صاحب کے حوالہ کیا اور فرمایا کہ اس کو بڑی حفاظت سے رکھئے گا، ہر کسی کو نہ دکھلائیے گا اور نہ بیان کیجئے گا، اس لئے کہ لشکر میں ہمارے غازیوں کا ایسا حال ہے کہ یہ بہتان و افترا سن کر اگر ان بدخواہوں کے حق میں بددعا کر دیں تو عجب نہیں کہ فوراً ان لوگوں کو نقصان پہنچ جائے، ہمارے دل میں یہ ہے کہ اگر کبھی اللہ تعالےٰ ہم کو ان سے ملائے تو ہم ان کے ساتھ نیکی اور احسان کے سوا کچھ نہ کریں۔

پھر آپ نے سردار موصوف سے فرمایا کہ خان بھائی تم نے جو ارباب فیض اللہ خاں کی زبانی چالیس ہزار روپے خرچ کے واسطے دینے کا وعدہ کیا تھا، تو اب اس کی فکر نہ کیجئے گا،

ہم نے آپ کو معاف کیے کیونکہ ہمارے پروردگار کے یہاں کسی بات کی کمی نہیں ہے۔ آپ ہمارے بھائی ہیں، آپ سے کسی طرح کا جرمانہ یا تاوان لینا ہم کو منظور نہیں ہے یہ بات کہہ کر آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور سردار موصوف بھی اپنے لشکر کو گئے اور دونوں لشکر اپنی اپنی جگہ آ گئے۔

سلطان محمد خاں نے ..... درخواست کی کہ سید صاحب اپنا ایک قاضی پشاور میں مقرر کر دیں جو شرع شریف کے موافق لوگوں کا فیصلہ کرے اور جمعہ کو وعظ بھی کہے ہم لوگ ان کی فرمانبرداری کریں گے اور ان کے وعظ و نصیحت سے لوگوں کو ہدایت ہو گی۔ آپ نے مولوی مظہر علی صاحب عظیم آبادی کو تجویز کیا دس بارہ غازی آپ نے ان کے ہمراہ کیے اور ان کا ہاتھ ارباب فیض اللہ خاں کے ہاتھ میں دے کر فرمایا کہ تمہارے سردار کی خواہش کے مطابق ہم ان کو قاضی چھوڑے جاتے ہیں، اس کے بعد آپ پنجتار کی طرف روانہ ہو گئے۔

پنجتار کے قریب آپ کی آمد کی خوشی میں سیکڑوں آدمی مرد و عورت آپ کی تعریف میں چاربیت کہتے تنبل[1] بجاتے اور خوشی کرتے ہوئے اپنے اپنے غول بنا کر آئے اور آپ سے انعام طلب کیا آپ نے ہر ایک کو انعام دلوایا اور ہر ایک کو خوش کیا، آپ کی آمد کی خوشی میں پنجتار کے مجاہدین نے گیارہ فیر توپ کے سر کیے۔

آپ سواری سے اتر کر مسجد میں تشریف لے گئے، اور دو رکعت نفل پڑھی اور اکثر مجاہدین نے دو دو نفلی رکعتیں پڑھیں پھر آپ نے سر برہنہ ہو کر بہت دیر تک باواز بلند دعا کی اور سب نے آمین کی، دعا کے بعد آپ نے سب کو اجازت دی کہ اپنے اپنے ڈیرے پر جا کر اتریں آپ نے بھی اپنے ڈیرے پر قیام فرمایا۔

جمعہ کے دن مولوی احمد اللہ صاحب میرٹھی نے خطبہ پڑھا اور سید صاحب نے نماز پڑھائی

---

[1] پشتو میں طبل کو تنبل کہتے ہیں۔

نماز کے بعد آپ نے وعظ کہا آپ نے فرمایا" بھائیو اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل و کرم سے تم تھوڑے لوگوں کو بڑے بڑے لشکروں پر غالب اور فتحیاب کیا، اور تمہارے دل بڑھ گئے کہ ہم نے لڑائی جیتی اس خیال پر مغرور نہ ہونا اللہ سے ڈرو اور توبہ و استغفار کرو، بڑائی اور کبریائی اسی قادر مطلق اور خداوند برحق کو سزاوار ہے"

الٰہی قانون اور خود ساختہ رسم و رواج

اس زمانہ میں مسلمانوں کے معاشرہ کو (بالخصوص عجمی ممالک میں جو مرکزِ اسلام سے زیادہ دور واقع ہوئے تھے) بہت سی جاہلی عادتوں مقامی رسم و رواج اور خود ساختہ قوانین نے جکڑ لیا تھا، اور مسلمان زمانۂ دراز سے اس پر اس طرح کاربند تھے جس طرح ایک مومن شریعت الٰہی منصوصات دین اور واجبات و فرائض شرعیہ پر کاربند اور عامل ہوتا ہے، یہ جاہلی عادات اور رسم و رواج ایک نسل سے دوسری نسل تک بہت احتیاط و حفاظت کے ساتھ منتقل کئے جاتے تھے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ برادریوں اور قبائل کی زندگی کا جز بن گئے تھے، اور ان کے گوشت پوست اور خون میں سرایت کر چکے تھے، اور ان کو اس سے دستبردار ہونے پر آمادہ کرنا ایسا تھا، جیسے کسی نومولود بچہ کا دودھ چھڑانا یا کسی متدین آدمی کو دین اور شعائر دین کو ترک کرنے کی دعوت دینا۔

ان قبائلی عادات و رسوم کو ان کے یہاں وہی دینی تقدس، عظمت، محبت، عصبیت اور مذہبی جوش حاصل تھا، جو مذہب اور شریعت آسمانی کا حصہ ہے، وہ اس پر جان دینے پر

آمادہ تھے، اور اس میں کوتاہی اور سستی یا اس کے انکار و تردید کو باعث ننگ و عار اور اسکی پابندی و اہتمام کو اپنے لئے فخر کی بات سمجھتے تھے۔

اسی طرح شریعت کے مقابلہ میں ایک اور شریعت اور فقہ کے متوازی ایک نئی فقہ اور نیا انسانی قانون وجود میں آچکا تھا، یہ "خود ساختہ شریعت" لازوال شریعت الٰہی سے پوری قوت و طاقت اور دلیل و حجت کے ساتھ متصادم تھی، اور لوگوں کے دلوں میں اس کی مخصوص جگہ اور زندگی میں اس کے دائرہ اثر پر قابض ہونا چاہتی تھی، اور ان ہی اصطلاحوں کا سہارا لیتی تھی، جو علماءِ دین کے یہاں رائج تھیں، اس میں بھی کچھ فرائض و واجبات تھے، اور کچھ سنن و مستحبات، جو اس سے سرمو انحراف کرتا تھا، وہ دائرہ اسلام سے خارج اور بدعتی سمجھا جاتا تھا، جو اس پر کاربند رہتا اور اس کے احکام بجالاتا، وہ سچا اور صاحب استقامت مسلمان اور سچا دیندار قرار دیا جاتا، اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے۔

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ۔ (الشوریٰ-۲۱)	کیا ان کے کچھ شریک ہیں جنھوں نے ان کے لئے ایسا دین مقرر کر دیا ہے جس کی خدا نے اجازت نہیں دی۔

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ط (النجم-۲۳)	یہ نرے نام ہی ہیں جن کو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے ٹھیرا لیا ہے، خدا تعالےٰ نے تو ان کی کوئی دلیل بھیجی نہیں۔

چونکہ یہ دستور و قانون لوگوں کی خواہشات اور امراء اور دولتمندوں کا پیدا کردہ تھا، اور لوگوں کے تجربات اور عقلا اور اہل الرائے کے قیاس کا نتیجہ تھا، اور اس کا بڑا حصہ عقلی خام خیالیوں اور ناپختہ خیالات و افکار پر مشتمل تھا، اور اس کا سرچشمہ حکیم و علیم خدا کا

بنایا ہوا قانون نہ تھا اس لئے اس میں جاہلیت کے باقی ماندہ اثرات، نفسانی خواہشات کوتاہ بینی، تشدد و غلو، افراط و تفریط اور اسراف و تبذیر کی عجیب وغریب آمیزش تھی، اور اس نے بہت سے خاندانوں کی حق تلفی کی تھی، اور معاشرہ کے لئے ایک مسلسل مصیبت بلائے عظیم اور حرماں نصیبی کا سرچشمہ تھا، اس کی وجہ سے دین نے اپنی سادگی اور سہولت کا بڑا حصہ کھو دیا تھا، زندگی آزادی کی نعمت اور سرورِ نفس کی دولت سے محروم ہو گئی تھی، اور اس سوسائٹی کے لئے جس نے ان خود ساختہ قوانین اور رسوم و رواج کی پابندی اختیار کر لی تھی، یہ زندگی کا ایک بوجھ یا پیر کی بیڑیاں، اور گلے کا طوق بن گئی تھی، معاشرہ ایک تنگ و تاریک قیدخانہ میں زندگی گزار رہا تھا، اور خود اپنی لائی ہوئی مصیبت میں گرفتار تھا، اللہ نے جس چیز کو حرام کیا تھا اس کو انھوں نے حلال کر لیا تھا، اور اللہ نے جس کو حلال کیا تھا، اس کو حرام بنایا تھا، اللہ نے جس میں کشادگی پیدا کی تھی، اس میں انھوں نے تنگی پیدا کر لی تھی، اور اللہ تعالےٰ کا یہ فرمان ان پر صادق تھا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ۔	کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھوں نے بجائے نعمت الٰہی کے کفر کیا اور جنھوں نے اپنی
(ابراہیم - ۲۸)	قوم کو ہلاکت کے گھر یعنی جہنم میں پہنچایا۔

اس معاملہ میں خود افغانی قبائل جن میں دین خالص اور سنت صحیحہ کی دعوت مختلف تاریخی اسباب کی بنا پر ہمیشہ کمزور رہی بہت آگے تھے، اور اس کے اکثر علماء نے عہد آخر میں صرف کتب فقہ اور علوم آلیہ و عقلیہ پر اکتفا کر لی تھی یہ افغانی قبائل بہت قدیم زمانہ سے ان عادات، رسم و رواج اور آباء و اجداد کے طور طریق پر شدت سے کاربند تھے، اور اس سے سرمو انحراف بے دینی اور بدعت کے مرادف سمجھتے تھے[1]

---

[1] یہ قبائل نماز میں تشہد کے وقت انگلی اٹھانے کو سخت بدعت اور ناقابل معافی گناہ (باقی صفحہ ۲۱۴ پر)

اس میں مرورِ زمانہ کے ساتھ نیز علماء و مشائخ کی مداہنت و چشم پوشی کے نتیجہ میں بہت سی جاہلی عادتیں راسخ ہو گئی تھیں اور ان میں کوئی عیب باقی نہ رہا تھا، ان عادتوں میں ایک بُری عادت یہ تھی کہ اپنی حیثیت کے مطابق لڑکے والوں سے زرِ نقد لئے بغیر کوئی اپنی بیٹی کا نکاح کسی کے بیٹے کے ساتھ نہیں کرتا تھا کوئی لڑکے والے سے سو روپیہ کوئی چار پانچ سو کوئی ہزار لیتا، لڑکے والے غریب روپے کی تلاش میں حیران و سرگرداں رہتے اور ان کی بیٹیاں بیچاری بیٹھی رہتیں، اور ان کی عمر اسی انتظار میں گذر جاتی بعض لڑکیاں اس وجہ سے معصیت اور دوسری قبیح چیزوں میں گرفتار ہو جاتیں ان کی صحت بھی خراب رہتی، اور ایک تکلیف دہ زندگی گزارتیں۔

اس طرح کی خواتین اور بستی کی عورتوں نے ایک موقع پر آپ سے داد خواہی اور انصاف طلبی کی، اور آپ کے ایک افغانی مرید احمد خاں کاکا کے ذریعہ یہ پیغام کہلوایا کہ سید بادشاہ کو اللہ تعالیٰ نے ہمارا امام بنایا ہے، وہ خدا کے لئے ہماری بیٹیوں کا انتظام کریں اور ہم کو اس عذاب سے نجات دیں۔

سید صاحب نے فرمایا کہ تم صاحبوں نے میرے ہاتھ پر بیعت ہدایت اور بیعت امامت کی ہے، اور شریعت کے تمام احکام قبول کئے ہیں، اور ہر ایک گناہ سے اور بُرے کام سے توبہ کی ہے، تو خدا اور رسول کا حکم جان کر اس گناہ سے بھی توبہ کرو اور دستورِ شریعت کے موافق برضا و رغبت اپنی بیٹیوں کا اپنی برادری میں نکاح کردو، اور یہ خدا اور رسول کے حکم کے خلاف روپیہ لینے کا

(باقی ص۲۱۳ کا) سمجھتے تھے حتیٰ کہ بعض پرجوش اور مغلوب الغضب لوگ نمازی کی انگلی توڑ ڈالنے میں بھی کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے، اور یہ سب اس بنیاد پر کہ بعض فقہ کی کتابوں مثلاً خلاصۃ الکیدانی میں تشہد کے وقت انگلی اٹھانا حرام قرار دیا گیا ہے۔

دستور ترک کرو اگر تم نہ کرو گے تو اپنے حق میں بہت برا کرو گے۔

آپ کی یہ تقریر سن کر سب نے جاہلیت کی رسم سے طوعاً و کرہاً توبہ کی اور اپنی بیٹیوں کے نکاح کر دینے کا اقرار کیا۔

حکومت شرعیہ کے عمال اور غازیوں کا قتل عام

پشاور کی سپردگی کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ پشاور اور سمہ کے پورے علاقہ میں حکومت شرعیہ کے ان عمال، محصلین، قضاۃ، محتسبین، اور ان غازیوں کو جو پنجتار کے علاوہ پورے علاقہ میں جابجا متعین اور مقرر تھے، بیک دفعہ قتل کر دینے کا منصوبہ بنایا گیا اور خفیہ طور پر یہ طے کرایا گیا کہ اس کشمکش سے جو چند سال سے جاری ہے، ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کر لی جائے، یہ کشمکش کیوں تھی، اور اس فیصلہ کن و نامبارک اقدام کے اصلی اور اندرونی محرکات اور اسباب کیا تھے؟ ان کو اس اندوہناک واقعہ کی تفصیلات پڑھنے سے پہلے معلوم کر لینا ضروری ہے۔

اس کشمکش کا سب سے بڑا سبب اور محرک سرداروں خوانین اور ملاؤں کے ذاتی اغراض و مصالح ہیں، سید صاحب اور مجاہدین کی آمد سے پہلے یہ تمام گروہ اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل اور اپنے منافع اور فوائد کے حصول میں بالکل آزاد تھے، وہ سب اس علاقہ میں من مانی کارروائی کرتے تھے، اس علاقہ میں جو کچھ پیدا ہوتا تھا، اس سے یہ سب گروہ اپنے اپنے حصے اور ملک کے رواج کے مطابق فائدہ اٹھاتے تھے، اوپر گزر چکا ہے کہ سرداران پشاور رعایا کی

کھیتی کا نصف غلہ وصول کرتے تھے، اور مختلف انتظامات کا خرچ بھی رعایا کے ذمہ تھا، اس طرح پیداوار کا دو تہائی حصہ ان کے پاس چلا جاتا تھا، سید صاحب کی آمد آپ کی بیعت و امامت اور نظام شرعی کے نفاذ و اجرا سے ان کے ان تمام حقوق و فوائد پر زد پڑی اور ان کو صاف نظر آنے لگا کہ اگر یہ صورت حال باقی رہی اور نظام شرعی کی جڑیں اور مستحکم ہو گئیں تو ان کا یہ اقتدار اور انتفاع ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا، اور وہ اپنے حقوق سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جائیں گے سرحد کا سارا ملک انہی دنیاوی حاکموں اور دینی پیشواؤں کی عملداری میں بٹا ہوا تھا، جن دلوں میں ایمان کی حلاوت خوف خدا اور فکر آخرت اچھی طرح پیوست نہ ہوئے ہوں، اور ان کے بجائے مال کی محبت، جاہ و منصب کا شوق، اور تن آسانی اور تن پروری کی عادت راسخ ہو چکی ہو وہ کسی دینی منفعت اجتماعی مصلحت اور اخروی سرفرازی و کامیابی کے لئے اپنے ذاتی منافع و مصالح سے دست بردار نہیں ہو سکتے، وہ تو اپنے اغراض و مقاصد کی حفاظت اور کاربرآری کے لئے دین کو بڑے سے بڑا نقصان پہنچا سکتے ہیں، اور اجتماعی مصلحت کو آسانی کے ساتھ قربان کر سکتے ہیں، اور سنگین سے سنگین جرم کا ارتکاب کر سکتے ہیں، مسلمانوں کی تاریخ اغراض پرستی کے ان افسوسناک واقعات سے داغدار ہے، جن میں بارہا اجتماعی مصلحتوں کا خون ہوا اور مستحکم سلطنتیں چند اشخاص یا کسی خاص گروہ کی ذاتی اغراض اور حقیر فوائد کی نذر ہو گئیں۔

اس کا دوسرا سبب یہ ہے کہ صوبۂ سرحد اور افغانستان میں شریعت اسلامی کے بالکل متوازی ایک دوسرا آئین و قانون صدیوں سے جاری تھا، اس پر اہل سرحد آسمانی شریعت کی طرح عامل و راسخ تھے، اور کسی حال میں اس کو ترک کرنے کے لئے تیار نہیں تھے، اس "آئینِ افغانی" میں ان کے اغراض و مصالح بھی محفوظ تھے، اور باپ دادا کی رسم اور صدیوں

کے ملکی رواج پر بھی عمل ہوتا تھا، عنایت اللہ خاں سواتی اور اس کے ساتھیوں کا یہ صاف صاف اقرار و اعلان (جو اس نے مولانا اسماعیل صاحب شہید کے جواب میں کہا) اس بات کا واضح ثبوت ہے۔

"تم کتاب و سنت سے بال برابر بھی زائد عمل نہیں کرتے قرآن و سنت اور علمار سب تمہاری طرف ہیں، لیکن وہی احکام جو کتاب و سنت سے ثابت ہیں، ہمارے اوپر شاق اور بار ہیں، اس لئے ہم تمہیں یا جوڑ جانے سے مانع ہیں، اور ہم کسی طرح تم کو جانے نہیں دیں گے، اس سلسلہ میں ہم جنگ کے لئے تیار ہیں، پھر جو فیصلہ ہو، اگر ہم غالب آئے تو ہم اپنے رسوم افغانی پر قائم رہیں گے، اگر تم غالب آئے اور تمہارا عمل دخل اس ملک میں ہوا تو ہم اس ملک کو چھوڑ کر کسی کافر کی عملداری میں چلے جائیں گے تاکہ وہاں اطمینان سے اپنے باپ دادا کے طریقہ پر عمل کر سکیں۔"

عنایت اللہ خاں اور اس کے ساتھیوں نے اپنے اس اعلان و اقرار میں نہ صرف سوات بلکہ حقیقتاً اس پورے علاقہ کی اکثریت کی اصلی ذہنیت اور خیالات کی ترجمانی کی ہے، جو اس زمانہ میں وہاں عام تھی۔

یہ وہ بنیادی اسباب ہیں جنھوں نے نہ صرف غریب الوطن مجاہدین کے خلاف اس خطرناک اقدام پر آمادہ کیا بلکہ پورے شرعی نظام اور مستقبل کے دینی توقعات و امکانات کو درہم برہم کر دینے پر ابھارا جو اس ملک میں صدیوں کے بعد پیدا ہوئے تھے، اور ان اہل علاقہ سے جن کو انصار کی جانشینی کرنی چاہیئے تھی، ایسی قساوت اور سنگ دلی کا ظہور ہوا جس نے میدان کربلا اور واقعہ حرہ کی یاد تازہ کر دی، شاید ان کو آسانی سے اپنے سنگدلانہ فعل کی ہمت نہ ہوتی، اس لئے کہ جن کے ساتھ وحشت و بربریت کا یہ سلوک کیا گیا وہ مسلمان تھے،

اور دینی اعمال و شعائر کی پابندی میں نیز اپنے عبادت و تقویٰ میں کھلے طریقہ پر اپنے گرد و پیش میں ممتاز و نمایاں تھے، لیکن سرداران پشاور اور ان کے درباری علمار نے نیز پیشہ ور اور رسم پرست ملاؤں نے اس جماعت اور اس کے امیر کے متعلق فساد عقیدہ اور مسلمانوں کے جان و مال پر تعدی وغیرہ کی جو افواہیں پھیلا رکھی تھیں، اور انھوں نے ان پر مختلف قسم کے جو الزمات لگائے تھے، اور ان کی تشہیر کی تھی، ان سب نے مل کر اس فعل کے لئے اخلاقی اور مذہبی جواز مہیا کر دیا تھا، اور اگرچہ سب کار فرمائی ذاتی اغراض و نفسانیت کی تھی، لیکن اس کو تھوڑا سا سہارا اس الزام تراشی سے بھی مل گیا تھا جس کو پشاور کی فتح اور حوالگی کے بعد سے خاص طور پر ہوا دی گئی۔

مولانا خیر الدین صاحب شیر کوٹی نے جو لشکر اسلام کے ایک بڑے ذہین، ذکی اور مبصر عالم تھے، اس قتل عام کا بڑی حقیقت پسندی سے جائزہ لیا، اور اس کے اسباب و محرکات کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے، وہ اپنی ایک تحریر میں جس کا خلاصہ مولوی سید جعفر علی صاحب نے "منظورۃ السعداء" میں نقل کیا ہے، فرماتے ہیں۔

"تقدیر الٰہی اور شہدا کی خوش قسمتی کے علاوہ اس واقعہ کے چھ ظاہری سبب معلوم ہوتے ہیں، ایک تو یہ کہ اس علاقہ کے لوگ زمانۂ قدیم سے اطاعت و فرماں برداری کے عادی نہیں ہیں، جب ان کو اس بات کا تنبہ ہوا کہ امام و امیر کی اطاعت ضروریات دین میں سے ہے، تو انھوں نے اس کو قبول تو کر لیا، لیکن اطاعت کو نماز روزے اور عُشر کے اندر منحصر سمجھتے تھے، اور ان کے نزدیک اتنی ہی بات میں اطاعت ضروری تھی، اور وہ بھی مرضی کے مطابق، جتنا دل چاہتا عُشر وغیرہ دے دیتے کم یا زیادہ، جب ان سے پورے پورے عُشر کا مطالبہ ہوا اور جنگ میں شرکت نہ کرنے کا تاوان طلب کیا گیا نیز لڑکیوں کی شادی اور

داماد سے کچھ لئے بغیر ان کو رخصت کر دینے کی تاکید بھی کی گئی تو ان کی طبیعت پر یہ بہت شاق ہوا، اور ان کو یہ معاملات ناقابل برداشت اور تکلیف مالایطاق معلوم ہونے لگے۔

اسی کے ساتھ وہ محضر جو ہندوستان اور سرحد کے علماء نے تیار کیا تھا، اس کا اثر سرداران پشاور کی کوشش سے جا بجا پھیل گیا، اور یہ مشہور ہو گیا کہ یہ گروہ جو جہاد کے نام سے یہاں آیا ہے، وہ دین کا مخالف ہے اور وہابی فرقہ سے تعلق رکھتا ہے، اس سے ان لوگوں کے دل میں بدعقیدگی پیدا ہوئی، انھوں نے مجبوراً ان کی اطاعت تسلیم کی چونکہ مجاہدین کی قوت و شوکت روز افزوں تھی، ان کا کوئی قابو نہیں چلا اور حضرت امیر المومنین کی تاکید لڑکیوں کے نکاح کی بابت خود لڑکیوں کی فریاد اور درخواست پر تھی، انھوں نے آپ کے پاس پیغام بھیجا کہ ہمارے ساتھ انصاف فرمایا جائے اس پر یہ حکم صادر ہوا کہ جس منکوحہ کا شوہر موجود ہے، تین دن کے اندر اس کی رخصتی کر دی جائے اور جو لڑکیاں بالغ ہو چکی ہیں، اور ان کے شوہر غیر موجود ہیں، ایک مہینہ کے اندر ان کا نکاح اور رخصتی کر دی جائے جن لڑکیوں کی نسبت ہو چکی تھی، انھوں نے ان لوگوں سے جو اس کام کے لئے مقرر ہوئے تھے، اپنی رخصتی کی درخواست کی چونکہ اہلِ علاقہ احکام شرعی قبول کر چکے تھے اس لئے ان کا حیل و حجت کرنا معقول نہ تھا، اپنے مروجہ رسوم و عادات کا جو خلاف شرع تھے، ترک کرنا مناسب تھا (یہ سب ناراضگی اور شکایت مقامی خوانین تک محدود تھی) باقی ہندو بنیئے اور اہل حرفہ ہندوستانیوں کی حکومت سے بہت خوش تھے، خوانین کی حکومت میں بڑا ظلم تھا، اور اپنی لڑکیوں کی شادی میں رعیت سے بڑی گراں قدر رقمیں وصول کرتے تھے، یہ سب احکام شرعی کے اجراء کی وجہ سے موقوف ہو گیا اس لئے یہ سب حضرت امیر المومنین اور ہندوستانیوں کو بڑی دعائیں دیتے تھے کہ ان کی وجہ سے وہ اس ظلم و تعدی سے محفوظ ہو گئے۔[۱]

۱؎ منظورۃ السعداء ص ۱۰۳۹ - ۱۰۴۰۔

مذکورہ بالا اسباب میں اتنا اور اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ سمہ کے علاقہ میں جو غازی متعین یا مقیم تھے یا کبھی کبھی کسی ضرورت سے دورہ کرتے تھے، ان میں جن کو زیادہ صحبت و تربیت میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، یا مزاجاً درشت اور لاابالی واقع ہوئے تھے، ان سے کہیں کہیں بے عنوانیوں اور تعدی کے واقعات بھی پیش آئے، انسانی فطرت ناقابل تبدیل ہے، اتنی بڑی جماعت کا ایک اخلاقی اور دینی معیار پر ہونا، اور شریعت و اخلاق کے سانچہ میں سر سے پاؤں تک ڈھل جانا بعید از قیاس ہے، جو لوگ نو وارد تھے یا پست معاشرہ اور خاندانی ماحول سے تعلق رکھتے تھے، ان سے شاذ و نادر ایسے واقعات بھی ظاہر ہوئے جو اہل علاقہ کے لئے آزردگی کا سبب بنے، سید صاحب کو جب ان کا علم ہوا تو سختی کے ساتھ ان کی سرزنش فرمائی۔ اور فوراً ان کے تدارک کا انتظام فرمایا۔

سید صاحب اور آپ کی جماعت کے اکثر علماء حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی طرح مسائل میں تحقیقی مسلک رکھتے تھے، اور فقہ و حدیث کی تطبیق کی کوشش کرتے تھے، لیکن تیرھویں صدی میں تمام عالم اسلامی میں بالعموم، ہندوستان میں بالخصوص اور سرحد افغانستان میں بالاخص جو دینی اور علمی جمود طاری تھا، اس کے سامنے مروجہ عادات اور عوام کے مسلک سے سر مو انحراف اور ہر ایسی تحقیق جو علماء کے لئے نامانوس اور نئی تھی، الحاد و زندقہ اور مذہب سے آزادی کے مرادف تھی، چنانچہ علماء نے مشہور کیا کہ یہ ہندوستانی علماء اور ان کا امیر لامذہب لوگ ہیں، خواہش نفسانی کے پیرو اور آزاد خیال ہیں، اس پروپیگنڈے کا اثر ہوا ہوگا، اس کا اندازہ آج بھی کیا جا سکتا ہے۔

سید صاحب کی دعوت ایمانی اور تحریک جہاد کا حقیقی مقصد اور آپ کا ہر قول و فعل آپ کا لینا دینا، اٹھنا بیٹھنا ہر چیز کے پیچھے ایک ہی جذبہ کارفرما تھا، اعلاء کلمۃ اللہ،

دین کا غلبہ، سنت وشریعت کا احیاء اور حدود شرعیہ کا اجراء آپ چاہتے تھے کہ مسلمان ایک ایسی اسلامی زندگی گزاریں جس میں جاہلیت، خواہشات نفسانی، عادات اور قدیم رسم ورواج کا کوئی شائبہ نہ ہو، وہ غیر اللہ کی حکومت سے اللہ کی حکومت میں جنگ سے امن میں نفس کی بندگی سے خدا کی بندگی میں داخل ہوں یہی چیز تھی جس نے ان کو ہجرت و جہاد اور اپنے اہل وعیال کے فراق پر اور خطرات ومصائب کا خندہ پیشانی کے ساتھ مردانہ وار مقابلہ کرنے پر آمادہ کیا تھا، اور اسی ایک چیز کے لئے آپ نے اپنی ساری زندگی وقف کر دی تھی، ان کے نزدیک اگر یہ مقصد پورا نہ ہوتا ہو تو نہ ہجرت وجہاد کی کوئی قیمت ہے، نہ اسلامی حکومت کی، وہ سلیمان شاہ والی چترال کے نام اپنے مکتوب میں بہت صراحت کے ساتھ کہتے ہیں۔

"اس فقیر کو مال و دولت اور حصول سلطنت وحکومت سے کچھ غرض نہیں، دینی بھائیوں میں سے جو شخص بھی کفار کے ہاتھوں سے ملک کو آزاد کرنے، رب العالمین کے احکام کو رواج دینے اور سید المرسلین صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت کو پھیلانے کی کوشش کرے گا، اور ریاست وعدالت میں قوانین شریعت کی رعایت و پابندی کرے گا، فقیر کا مقصود حاصل ہو جائے گا اور میری کوشش کامیاب ہو جائے گی۔"

یہ وہ مخفی عوامل تھے، جو ان افغانی قبائل کی ناراضی کا اصل سبب تھے، جنھوں نے دین وشریعت کے بالمقابل اپنی نئی شریعت قائم کر رکھی تھی، اس ناراضگی و بے اطمینانی نے قبائل کے سرداروں اور خوانین وامراء کو اور مشتعل کر دیا، اور انھوں نے چاہا کہ اس کے ذریعہ وہ اس نظام کو ختم کر دیں جو ان کی من مانی زندگی اور خود ساختہ قبائلی نظام کی راہ میں حائل ہے، پشاور سے واپسی پر سید صاحب نے قاضیوں، محتسبوں اور عاملوں کے

تقریر پر خاص توجہ دی، جاہلی عادات کی مذمت و تردید کے لئے جگہ جگہ واعظ و مبلغ بھیجے، اور لوگوں نے دیکھا کہ وہ بہت سنجیدگی کے ساتھ اس کام کا بیڑا اٹھا رہے ہیں، اور نہایت درجہ سرگرمی کے ساتھ اس میں مشغول ہیں، اور اس آیت کی تفسیر یا خواب کی تعبیر ظاہر ہونے کے قریب ہے۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ	یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت
اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ	دیدیں تو یہ لوگ نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ
وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا	دیں اور (دوسروں کو بھی) نیک کام کرنے
عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔	کو کہیں اور برے کاموں سے منع کریں اور
(الحج - ۴۱)	سب کاموں کا انجام تو خدا ہی کے ہاتھوں میں ہے

اس کا ردّ عمل ان قبائل میں ایک بھیانک قتل عام اور قیامت صغریٰ کی شکل میں ظاہر ہوا، جس کی کچھ تفصیل ٹوٹے ہوئے دل اور رکتے ہوئے قلم سے آگے بیان کی جائے گی۔

یہ کس جرم کی سزا ہے؟

آخر ایک دن درانیوں اور سرداران قبائل کا جن کی آزادی اور مطلق العنانی ختم ہوتی نظر آرہی تھی، پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا، اور انھوں نے محسوس کیا کہ اگر اس نظام شرعی کو کچھ دن اور مہلت مل گئی، اور لوگ اس کے عادی ہوگئے تو ان کی آزاد و بے قید زندگی کی دوبارہ واپسی آسان نہ ہوگی انھوں نے دیکھا کہ زمین آہستہ آہستہ ان کے چاروں طرف تنگ ہوتی

جا رہی ہے، اور اگر اس صورت حال سے جلد چھٹکارا حاصل نہ کیا گیا تو یہ نیا نظام اور نئی امامت وقیادت طاقت اختیار کرے گی، اور ان کا محاذ پہلے سے زیادہ کمزور ہو جائے گا۔

سلطان محمد خاں کے دل سے (باوجود امتداد زمانہ کے اور سید صاحب کے احسانات اور اس کو دوبارہ اقتدار سلطنت حوالہ کرنے اور بہترین صلہ دینے کے) یار محمد خاں کا زخم مندمل نہ ہوا تھا، وہ جس طرح زخمی ذلیل وخوار اور بے یار ومددگار ہو کر اس دنیا سے گیا، اس کی کسک اس کے دل میں ابھی موجود تھی، اس کی صلح سید صاحب سے اوپری دل سے تھی، اور مجبوری اور ایک حقیقت کے سامنے شکست کے مرادف تھی، طیب خاطر اور انشراح کے ساتھ نہ تھی، اس لئے وہ اس کابوس سے جلد سے جلد چھٹکارا حاصل کرنے کی تدبیر کرتا رہا، اور موقع کی تاک میں رہا، پشاور میں اس وقت مولانا مظہر علی عظیم آبادی سید صاحب کے نائب اور قاضی تھے، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، فصل خصومات اور احکام شرعیہ کا اجرا ان کی ذمہ داری تھی، اور سمہ بھی ان کے دائرۂ اثر میں تھا، جس پر قبضہ کرنے کی تمنا سلطان محمد خاں اور اس کے بھائی عرصہ سے کر رہے تھے، بلکہ اس کے قبضہ کی ناکام کوشش بھی کر چکے تھے، ان کا خیال تھا کہ اگر اس قوت کو اس وقت کمزور نہ کیا گیا تو یہ نہ صرف پشاور کو فتح کر سکتی ہے، بلکہ حکومت لاہور کے لئے بھی خطرہ بن سکتی ہے، اس لئے اس کے ساتھ نباہ اور بقاء باہم یا اس کو ابھرنے کا موقع دینا خطرناک ہوگا، وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ وہ اور اس کا خاندان جس نے افغانستان اور سرحد پر ہمیشہ حکومت کی اس علاقہ کے واحد حقدار ہیں، اور اس میں شرکت کا کسی اور کو حق نہیں۔

تقریباً ہر گاؤں اور پشاور اور مردان کے درمیان واقع میدانی علاقہ میں ایک ایک قاضی محتسب اور عشر وصدقات کے عامل ومحصل موجود تھے، جو ان سرداران قبائل کی

اجارہ داری اور اقتدار کو کمزور و محدود کر رہے تھے، اور بعض اوقات ان کے معاملات و متعلقہ امور میں بھی مداخلت کرتے تھے، اور احکام شریعت سے ان کو آگاہ کرتے تھے، ان سب باتوں سے وہ چیں بجبیں ہوتے اور بہت تلخی و ناگواری کے ساتھ اس کو برداشت کرتے۔

ان مختلف النوع عناصر میں قدر مشترک صرف ایک چیز تھی، اور وہ تھی اس طرز زندگی اور نظام سے بے چینی و بے اطمینانی جس کا پہلے ان کو کوئی تجربہ نہ تھا، اور جو ان کے لئے بالکل نیا اور نامانوس تھا، ان کے اندر ایمان و عقیدہ کی وہ طاقت یا وہ بصیرت اور اپنی گردن پر لٹکتی ہوئی تلوار کا صحیح شعور و احساس نہ تھا، جو ان جاہلی رجحانات، ذاتی اغراض اور انانیت کو مغلوب کر سکتا۔ افسوس یہ ہے اس علاقہ کے اصل باشندے اپنے ان بھائیوں کے ساتھ گھل مل نہ سکے جو تلاش معاش میں اور اپنی سپہ گری اور فوجی اسپرٹ کو باقی رکھنے کے لئے تھوڑی مدت ہوئی، ہندوستان آگئے تھے، اور ان میں افغانوں کی بہت سی خصوصیات اور قبائلی صفات باقی تھیں، اس کی بڑی وجہ ان کے اخلاق و کردار اور ان کی دینی تربیت تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ شخصی مصالح اور مالی منافع کے سامنے کوئی اور منطق نہیں چلتی، اور اس کا نغمۂ شیریں عقل و شعور دونوں کو مفلوج، کمزور، اور بے حس بنا دیتا ہے۔

بہر حال قبائل میں بغاوت کی آگ سلگتی رہی، اور سازش کا خاکہ پشاور میں تیار کر لیا گیا قبائلی سردار، سلطان محمد خاں سے برابر ملتے رہتے اور اس سے خفیہ احکام... حاصل کر کے اپنے اپنے مقامات پر واپس آتے، اس درمیان میں مہاجرین اپنے اپنے کاموں میں مشغول اور حکومت لاہور کے مقابلہ کی تیاری میں مصروف تھے، اور نظام شرعی کا دائرہ آہستہ آہستہ ان قبائلی علاقوں تک وسیع کرنا چاہتے تھے، جہاں ابھی تک اس کی رسائی نہ ہوئی تھی، ان کے دل میں کبھی اس کا خیال بھی نہ آتا تھا کہ جن لوگوں نے امیر کی سمع و طاعت کی بیعت کی ہے، اور ان کی

وفاداری کا عہد کیا ہے، وہ اس طرح پھر جائیں گے، دوسری دشوار بات یہ تھی کہ وہ ان کی قومی زبان سے ناآشنا تھے، اس لئے جو کچھ ہو رہا تھا، اس کا اندازہ پورے طور پر کرنا ان کے لئے دشوار تھا، اور خفیہ پیغام رسانی کو (جو مقامی زبان میں ہو رہی تھی) سمجھنا ان کے لئے ناممکن تھا۔

مولانا سید مظہر علی صاحب سے سلطان محمد خاں نے اپنے بھائی یار محمد خاں کے قتل کے بارہ میں جس انداز سے گفتگو کی اس سے ان کو شبہہ ہو گیا کہ اس کا رنگ بدلا ہوا ہے، انھوں نے اپنے دلائل سے پشاور کے علماء کو جو اس گفتگو میں شریک تھے، چپ تو کر دیا، لیکن صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بادل ناخواستہ اس وقت خاموش ہیں، سلطان محمد خاں کا غیظ و غضب خاص طور پر نمایاں تھا، اس کے بعد مولانا مظہر علی صاحب نے مولانا محمد اسماعیل صاحب سے خط و کتابت کی اور اس زمانہ میں نفاق اور منافقین کے وجود پر روشنی ڈالنے کی درخواست کی، اس لئے کہ بعض علماء کہتے تھے کہ نفاق اور منافقین کا وجود صرف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا، اور اس کے .... بعد ان کا وجود ختم ہو گیا، آپ نے تحریر فرمایا، اس قول کا مطلب یہ ہے کہ منافقین کا قطعی علم جیسا زمانۂ رسالت میں (وحی کی وجہ سے) ہو سکتا تھا، بعد کے زمانہ میں نہیں ہو سکتا، اس لئے قرون متاخرہ میں منافقین کی قطعی تعیین ممکن نہیں، اس لئے جب تک کوئی شخص اپنے ایمان کا اظہار کرے گا، اور کلمہ گو ہو گا، مسلمان اس کو مسلمان سمجھتے رہیں گے، لیکن جس وقت وہ اپنے خبث باطن اور کفر کا اظہار کرے گا، تو وہ کافروں میں شمار کیا جائے گا اگر ایسا نہ ہو تو جن حدیثوں میں منافقین کی علامات بیان کی گئی ہیں، اور یہاں تک کہا گیا ہے کہ وان صلّی وصام وظنّ أنہ مسلم (چاہے وہ نماز روزہ کرتا ہو اور اپنے کو

مسلمان ہی سمجھتا ہو) ان احادیث کا مصداق کیا ہوگا؟[1]

انھوں نے سید صاحب سے یہ مشورہ بھی چاہا کہ آیا وہ یہاں مقیم رہیں، یا ان کے پاس چلے آئیں، مولانا محمد اسماعیل نے ان کو یہ اشارہ دیا کہ وہ سلطان محمد خاں سے اجازت لے لیں اور مرکز مجاہدین آجائیں۔

بعض مجاہدین نے مقامی باشندوں کو ایسی باتیں کرتے سنا اور ان کے بعض مخلصین نے ان کو آگاہ بھی کیا کہ اس معاملہ کی کچھ اصل ضرور ہے، اس لئے اس کو محض افواہ پر محمول کرنا صحیح نہ ہوگا، سلطان محمد خاں اور سرداران قبائل نے اس کے لئے ایک خاص دن مقرر کیا ہے، جس میں وہ اپنے منصوبہ پر یکجا اور بیک وقت عمل کریں گے، اور تمام عمال اور غازیوں کو ایک ہی وقت میں شہید کریں گے، اس کے لئے انھوں نے ایک مخصوص اصطلاح بھی وضع کی ہے، جب یہ لفظ بولا جائے گا تو قتل عام کا آغاز ہو جائے گا۔

جب سید صاحب کو یہ اطلاع پہنچی تو آپ نے اپنے عمال اور متفرق مہاجرین کو جو مختلف جگہوں میں تھے، یہ حکم بھیجا کہ وہ ان مقامات کو چھوڑ کر ان سے مل جائیں، جب سازشیوں کو یہ خبر لگی کہ آپ کو اس کی اطلاع ہو گئی ہے، تو انھوں نے اس منصوبہ کو وقت سے پہلے شروع کر دیا اور قتل عام کی ایک لہر نے پورے علاقہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، اور ظلم و سفاکی کا ایسا منظر سامنے آیا جو تاریخ اسلام نے بہت زمانہ سے نہیں دیکھا تھا۔

---

[1] محققین کا مسلک یہی ہے کہ نفاق فطرت انسانی کی ایک کمزوری اور نفسانی مرض ہے، جو کسی زمانہ اور مقام سے مخصوص نہیں ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اپنی جلیل القدر تصنیف "الفوز الکبیر" میں اس پر مختصر لیکن بڑی عالمانہ بحث کی ہے، حضرت حسن بصریؒ اور جمہور محققین کا یہی مسلک ہے اور اب اس بارہ میں کوئی اختلاف نہیں رہا، تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو تاریخ دعوت و عزیمت "حصہ اول از مصنف" تذکرہ حضرت خواجہ حسن بصری۔

سب سے پہلا نشانہ سید مظہر علی صاحب کو اور ارباب فیض اللہ خاں (جو سلطان محمد خاں اور سید صاحب کے درمیان اکثر قاصد کا کام کر چکے تھے، اور جن کی کوشش سے سلطان محمد خاں کو پشاور کا اقتدار ملا تھا) کو بنایا گیا۔ ان کو سلطان محمد خاں نے بلوایا، اور حکم دیا کہ ان کے سر تن سے جدا کر دیئے جائیں۔

عشا کے بعد بستی والوں نے سب کو گھیر لیا، اور غازیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا، کوئی نماز پڑھنے میں شہید ہوا، اور کوئی وضو اور استنجا کرنے میں، یہی حال ہر بستی میں ہوا، کچھ لوگ بھاگ کر یا کسی گھر میں چھپ کر بچے اور جان سلامت لے کر پنجتار میں سید صاحب کے پاس آئے باقی سب شہید ہو گئے۔

کچھ لوگ ایک مسجد میں محصور ہو گئے، اور وہاں سے مقابلہ کرتے .... رہے، بلوائیوں نے ہر طرف سے ایسا سخت گھیرا کہ نکلنے اور بچنے کا کوئی راستہ نہ رہا۔ بستی والوں نے سب آدمی بھی روک لئے کوٹھوں کی چھتوں پر بھی لوگ بندوقیں لئے بیٹھے تھے، غازیوں کی مار ان پر نہیں پڑتی تھی، اور یہ ان کا نشانہ بنے ہوئے تھے، جب غازیوں کے پاس گولی بارود ختم ہو گئی، تب یہ مجبور ہو کر اپنے غازیوں کے ساتھ مسجد میں گھس گئے، اور اندر سے کواڑ بند کر کے زنجیر لگائی، اس وقت بندوقیں چلنی موقوف ہوئیں، اور سب بلوائیوں نے ہر طرف سے آکر مسجد کا محاصرہ کر لیا، اور اس فکر میں ہوئے کہ اب ان کو کس ترکیب سے ماریں، بعضوں نے کہا دیواریں نقب کر کے ماریں اور بعضوں نے کہا مسجد میں آگ لگا دیں، اس سے آپ ہی جل کر مر جائیں گے، اور جو کوئی باہر نکلیں ہم ان کو ماریں گے، شاہ ولی خاں نے جن کی یہ مسجد تھی کہا، میں نہ اپنی مسجد کھودنے دوں گا، نہ جلانے دوں گا۔

اس گفتگو میں اس بستی کے علماء اور سادات کلام اللہ شریف لے کر آئے اور

بڑی خوشامد کے ساتھ خدا اور رسول کا واسطہ دے کر کہنے لگے کہ ان مسلمان مظلوموں کو ناحق ظلم سے قتل نہ کرو، خدا کے غضب سے ڈرو، یہ حاجی، غازی، اور مہاجرین ہیں، اور انھوں نے تمہارا کوئی نقصان بھی نہیں کیا، اسی طرح بستی کی تمام عورتیں کوئی اپنے خاوند سے کوئی اپنے بیٹے سے کوئی اپنے بھائی بھتیجے وغیرہ سے لپٹتی تھی، اور کہتی تھی کہ ان مظلوموں بے گناہوں کو مارتے ہو، اور کافر ہوتے ہو، غضب الٰہی سے ڈرو اور خون ناحق نہ کرو، مگر وہ کسی کا کہنا خیال میں نہیں لاتے تھے۔

سب کے بعد وہاں کے بنئے جمع ہو کر آئے، اور کہنے لگے کہ ہم ہندو لوگ ہیں، کوئی جانور نہ مارتے ہیں، نہ امکان بھر غیر کو مارنے دیتے ہیں، اور تم ان آدمیوں کے مارنے پر آمادہ ہو، جو تم چاہو ہم سے لے لو اور ان کو ہمیں دے دو، ہم تم سے اقرار کرتے ہیں کہ ان کو پنجتار میں سید بادشاہ کے پاس نہیں بھیجیں گے، دریائے سندھ کے پار سکھوں کی عملداری میں اتار دیں گے وہاں سے جدھر چاہیں چلے جائیں گے مگر انھوں نے یہ بھی نہ مانا۔

غازی یہ تمام باتیں مسجد کے اندر سے سن رہے تھے، آخر سب اس امر پر متفق ہوئے کہ مسجد میں آگ لگا دو جب غازیوں کو یقین ہوا کہ اب یہ مسجد میں ضرور آگ لگا دیں گے، تب وہ مسجد کے کواڑ کھول کر ننگی تلواریں لے کر باہر نکلے، مسجد کے صحن میں پیر خاں کا پاؤں پھسلا اور زمین پر گرے، لیکن جلد ہی ایک جوان نے ان کو اٹھا لیا، اور باہر مشرق کی طرف لے چلا، کسی بلوائی نے جان کے خوف سے اس وقت ان غازیوں کا تعاقب نہ کیا سب لوگ مسجد کے اندر ان کا مال واسباب لوٹنے میں لگ گئے تب یہ لوگ بستی کے باہر نالے پر جا پہنچے اور پانی پینے پر جھکے اور جانا کہ ہم سب سلامت بچ گئے، اس عرصہ میں بلوائی مال واسباب کے لوٹنے سے فارغ ہو کر ان کے تعاقب میں دوڑے اور نالے کے اندر چاروں طرف سے

گھیر لیا، اور پتھروں اور نیزوں سے مارنا شروع کیا، اور سب کو وہیں قتل کر ڈالا، ان میں سے ایک کو زندہ نہ چھوڑا اور ان کے کپڑے لتے ہتھیار وغیرہ لے کر بستی کو چلے آئے۔[1]

غرض قتل عام میں کسی کی قید نہ تھی، جو چند مہاجر اور مجاہد اپنے حزم و تدبر اور حاضر دماغی کی وجہ سے نکل بچنے میں کامیاب ہو گئے، ان میں مولانا خیر الدین شیر کوٹی بھی تھے، وہ اپنے بہت سے رفقاء کے ساتھ اس محاصرہ سے نکل آئے اور سید صاحب کے پاس بحفاظت پہنچ گئے، سید صاحب ان کی سلامتی پر خدا کا شکر بجا لائے، اور ان کی آمد کی خوشی میں توپیں داغی گئیں تاکہ دشمنوں کے دل میں اس کی ہیبت بیٹھ جائے، آپ نے ایک ایک رات لوگوں کو ان کی میزبانی کا حکم دیا اور ان کے لئے نئی پوشاک اور نئے جوتے کا انتظام کیا۔

اس ظلم و بربریت کا شکار وہ لوگ بنے جو مہاجرین و مجاہدین کا عطر اور خلاصہ کہے جا سکتے ہیں، یہ لوگ اپنے زہد اور شوق آخرت میں، اور امانت و دیانت میں بے نظیر تھے، شب زندہ دار عبادت گزار جن کا دن گھوڑوں کی پشت پر اور دین کی نصرت میں گزرتا تھا، اور رات مناجات الٰہی اور اس کے حضور گریہ وزاری اور بے چینی و بے قراری میں۔

تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ	ان کے پہلو خوابگاہوں سے علیحدہ ہوتے ہیں،
يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا۔	اس طور پر کہ وہ لوگ اپنے رب کو امید سے
(السجدہ - ۱۶)	اور خوف سے پکارتے ہیں۔

غرض اس طرح یہ جماعت جو خود ان کی نصرت کے لئے اور ان کی عزت و ناموس کی حفاظت کے لئے اور ظالموں و مفسدوں سے ان کی گلو خلاصی کے لئے چلی تھی، خود ان کے ظلم و بربریت کا شکار ہو گئی۔

---

[1] سیرت سید احمد شہید۔ ص ۳۴۰۔

غیب سے یہ صدا آج بھی کانوں میں گونج رہی ہے۔

بِاَیِّ ذَنۡۢبٍ قُتِلَتۡ (سورہ تکویر - ۹) آخر اس کو کس جرم میں قتل کیا گیا۔

بہ لوحِ تربت من یافتند از غیب تحریرے

کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

نئی ہجرت، نیا جہاد!

اس حادثۂ فاجعہ کا سید صاحب کے دل پر بہت گہرا اثر پڑا آپ کو اللہ تعالےٰ کی طرف سے کریم النفسی، عالی حوصلگی، کشادہ دلی، قوت برداشت، اور اپنے دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک اور احسان کا جو حصۂ وافر ملا تھا، اس کو دیکھ کر عقل حیرت زدہ رہ جاتی ہے، اس باب میں آپ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے متبع تھے، جو قطع تعلق کرے اس کے ساتھ صلہ رحمی، جو اپنا ہاتھ کھینچے اس کے لئے بذل وعطا، اور جو ظلم وزیادتی کرے اس کے ساتھ احسان آپ کا شیوہ تھا، اپنے لئے غصہ کرنا، اور کسی انسان کی طرف سے اپنے دل میں کینہ و بغض رکھنا آپ کی عادت نہ تھی، چنانچہ جن لوگوں نے آپ کو زہر دے کر شہید کرنے کی کوشش کی تھی، ان کو نہ صرف آپ نے معاف کر دیا، بلکہ ان کے ساتھ احسان بھی کیا، اور یہ کوشش کی کہ ان کو کوئی گزند نہ پہنچے، کسی برائی کرنے والے کے ساتھ آپ کا سلوک کوئی دیکھتا تو سمجھتا کہ اس نے شاید آپ کے ساتھ کوئی احسان کیا ہے، اور انعام وشکر کا مستحق ہے۔

لیکن اس سانحہ کی نوعیت مختلف تھی، یہ ایک عقلی وفکری صدمہ اور اجتماعی مسئلہ تھا،

جوان کی ذات سے کوئی تعلق نہ رکھتا تھا، اور اس کے لئے کسی عالی ظرفی اور فراخ حوصلگی کی ضرورت نہ تھی، اس طرح کے حوادث و آلام کے لئے آپ کے فراخ سینہ میں کافی گنجائش تھی، لیکن یہ سانحہ اس بات کا مقتضی تھا کہ سارے مسئلہ کا ازسرنو جائزہ لیا جائے اور نفع نقصان کا دوبارہ موازنہ کیا جائے۔

اس المیہ کی مثال ایک ایسے کسان سے دی جاسکتی ہے، جو اپنی زمین میں اعلیٰ سے اعلیٰ بیج ڈالے، بلکہ اپنا تخم دل اس کے حوالہ کردے، اور اپنے خون اور پسینے سے اس کی آبیاری کرے، اچھی سے اچھی کھاد کا استعمال کرے، اور اس کی پرورش اور نگہداشت میں دن رات ایک کردے، اور جب اس کا سرسبز و شاداب چمن تیار ہو جائے تو کوئی کسان اور اس کا کوئی ساتھی اور پڑوسی اس کو آگ لگا کر اچانک تباہ و برباد کردے، یہ المناک سانحہ یہاں ایک بار نہیں بار بار پیش آیا، اگر ایک ہاتھ تعمیر کرتا تو ہزار ہاتھ اس کو ڈھانے اور گرانے کے لئے موجود ہوتے، اب کیا اس زمین میں دوبارہ یہاں بیج ڈالنے اور ازسرنو اس کی آبیاری و نگرانی و محنت و جانفشانی اور پھر اس کے نامعلوم نتیجہ کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جانا چاہئے؟ وہ سرزمین جس نے سید صاحب کی ناقدری و محسن کشی میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا یا خدا کی وسیع سرزمین میں کسی نئے اور پاک و صاف خطہ کو اپنی جدوجہد کا مرکز بنانا چاہئے، اور ان بیجوں کی جو باقی رہ گئے ہیں، حفاظت کرنی چاہئے؟ آپ جانتے تھے کہ ایک کتا بھی جب کسی در پر بار بار آتا ہے، تو لوگ اس کا حق مانتے ہیں، اور روٹی کا ایک ٹکڑہ اس کے سامنے ضرور پھینک دیتے ہیں، وہ بھی گھر والوں سے مانوس ہو جاتا ہے، اور ان کو چھوڑنا یا ان کے ساتھ بے وفائی کرنا نہیں جانتا تو کیا وہ اور ان کے رفقاء ان پالتو جانوروں سے بھی گئے گذرے ہیں؟ اور کیا وہ اب تک صرف صحرا میں صدا لگا رہے تھے؟ اور ہوا میں

محل بنا رہے تھے؟ اور اپنی ساری قوت وطاقت غلط جگہ پر ضائع کر رہے تھے؟

جس چیز نے ان کے زخم کو اور گہرا کر دیا تھا، اور ان کو روحانی اذیت پہنچائی تھی، وہ یہ بات تھی کہ فتح خاں پنجتاری نے (جنھوں نے آپ کو اپنے علاقہ میں آنے کی دعوت دی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ وہ اور ان کی قوم آپ کے ساتھ وہ سلوک کرے گی جو انصار نے مہاجرین کے ساتھ کیا تھا) اس موقع پر کھل کر سازشیوں اور مفسدین کا ساتھ دیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کسی شخص پر اعتماد کرنا مشکل ہو گیا، اور کسی کی وفاداری پر بھروسہ خام خیالی نظر آنے لگی، سید صاحب نے فتح خاں سے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ "ہم کو تو اب ضروری ہو گیا ہے کہ ہم اپنے دل کا علاج کریں کہ کلمہ گویوں کی طرف سے ہمارا شک زائل ہو۔"

لیکن سید صاحب نے اپنے فیصلہ میں کسی جلد بازی سے کام نہیں لیا، بلکہ آپ نے ان اسباب و محرکات کو معلوم کرنے کی کوشش کی جو اس بہیمانہ قتل و غارت گری کی پشت پر کارفرما تھے، اس کے لئے آپ نے اس علاقہ کے علماء، سادات و خوانین اور بعض سرداران قبائل کو خطوط ارسال کئے اور فتح خاں سے بھی اس معاملہ میں مدد چاہی اور ان کو پنجتار آنے کی دعوت دی تاکہ اس اہم مسئلہ پر تبادلۂ خیال کیا جا سکے۔

اپنے رفقاء کو آپ نے ان کی ضیافت و مہمان نوازی کی خوب تاکید کی اور یہ ہدایت کی کہ اگر کوئی ایسا شخص ان کو نظر آئے، جس کا اس قتل میں حصہ ہو تو ہرگز شکوہ شکایت نہ کریں، نہ ترشروئی سے پیش آئیں بلکہ اس کی اور زیادہ خاطر مدارات کریں۔

جو لوگ اس موقع پر جمع ہوئے ان میں بے گناہ بھی تھے، اور وہ بھی جن کے ہاتھ شہداء کے خون سے رنگین تھے، مہاجرین نے ان دونوں میں واقعی کوئی فرق محسوس نہ ہونے دیا،

اور دونوں کے ساتھ ضیافت و پذیرائی کا یکساں معاملہ کیا، سید صاحب اور ان شرکا کے درمیان دیر تک گفتگو ہوئی، آپ نے ان سے دریافت فرمایا کہ وہ کیا اسباب تھے جنھوں نے ان کو قتل و خون پر آمادہ کیا، انھوں نے ان اسباب کا ذکر کیا جس پر بار بار بحث کی جا چکی تھی نیز ان افواہوں کا تذکرہ کیا جو اس جماعت کے متعلق وہاں پھیل گئی تھیں، اور بعض عمال و محصلین کے اس رویہ کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرائی جس سے مقامی باشندوں کو شکایت تھی۔

سید صاحب نے ان سب باتوں کا شافی و وافی جواب ارشاد فرمایا، اس موقع پر مقامی اور غیر ملکی علما میں سے بعض حضرات نے بھی تقریریں کیں، اور یہ اچھی طرح ثابت ہو گیا کہ ان کے دلائل میں کوئی وزن نہیں ہے، اور ان کے پاس کوئی ایسی بات نہیں ہے جو اتنے بڑے قتل عام (جس میں مہاجرین و مجاہدین کا بہترین نچوڑ تہ تیغ کر دیا گیا تھا) کا جواز پیدا کر سکے۔

بالآخر سید صاحب نے اس علاقہ کو (جس نے آپ کی ساری مساعی کو خاک میں ملا دیا اور احسان کا بدلہ ظلم سے اور وفا کا غداری و بے وفائی سے دیا اور مستقبل کی ساری توقعات پر پانی پھیر دیا) خیر باد کہنے کا فیصلہ کیا۔

اس موقع پر آپ کے بعض رفقا نے یہ کوشش کی کہ آپ اپنے اس فیصلہ پر نظر ثانی کریں، خاص طور پر مولانا خیر الدین شیر کوٹی نے آپ سے اس مسئلہ پر گفتگو کی اور کہا کہ آپ جو یہاں سے ہجرت کی تیاری فرما رہے ہیں تو میری ناقص رائے، یہ ہے کہ یہاں سے منتقل ہونا مناسب نہیں ہے، اگر آپ دوسرے ملک میں جائیں گے تو پھر ایک مدت مدید چاہیے کہ وہاں کے لوگوں کو وعظ و نصائح کریں اور ان کی عادات و خصلتوں سے واقف ہوں

پھر دیکھنا چاہیئے کہ وہ لوگ کس قسم کے ہوں، آپ کے وہاں ٹھیرنے سے راضی ہوں یا نہ ہوں، اس سے تو یہیں ٹھیرنا مناسب ہے، کیونکہ یہاں کے آدمی برتے ہوئے ہیں، مخلص و منافق اور مطیع و باغی ایک دوسرے سے ممتاز ہو گئے ہیں، جہاد کا جو معاملہ یہاں آسانی سے بنے گا اس کو دوسری جگہ ایک مدت دراز چاہیئے۔

آپ نے فرمایا بات تم سچ کہتے ہو مگر یہاں قیام کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی کیونکہ مخلص لوگ تو تھوڑے ہیں، اور مفسد بہت، اب ان سے ہدایت و صلاحیت کی امید نہیں رہی، ایک بار ان سے دھوکا کھا کر پھر ان میں رہنا دینداری اور ہوشیاری سے بھی بعید ہے، حضرت رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "لا یلدغ المومن من جحر مرتین"[۱] سوات کا ملک جو اس علاقہ کی پشت پر ہے، وہ بھی مخالف ہے۔

اس کے علاوہ فتح خاں جس کے یہاں ہم مقیم ہیں، اس کی طرف سے بھی ہم کو اعتماد جاتا رہا اگر تمام لوگ مخالف ہوتے تو کچھ بھی پروا نہ تھی، فقط یہ ہمارے قیام سے راضی ہوتا تو بھی یہاں رہنے کی ایک صورت تھی، اب یہاں کے لوگوں سے مجھ کو ایسی نفرت معلوم ہوتی ہے، جیسی آدمی کو اپنی قے سے اب یہاں سے ہجرت ہی کرنی بہتر ہے۔

مولوی خیر الدین صاحب نے کہا کہ ہم فرمانبردار ہیں، آپ جس طرف کو چلیں گے ہم لوگ بلا عذر آپ کے ہمرکاب ہوں گے۔

ارباب بہرام خاں نے کہا کہ آپ اجازت دیں تو میں لشکر کا ایک حصہ اور توپ لے کر دیہاتوں کا دورہ کروں اور انشاء اللہ جنگ کی نوبت بھی نہیں آئے گی اور سب تابع ہو جائیں گے۔

سید صاحب نے فرمایا کہ بھائی اول اول جب ہم اس ملک میں پہنچے تو نہ ہم اس قوم کے

---

[۱] مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا یعنی ایک جگہ سے کئی کئی بار دھوکہ نہیں کھاتا۔

حالات سے واقف تھے، نہ وہ ہمارے حالات سے ہم نے کئی سال وعظ و نصیحت کے ساتھ ان کی دلجوئی کی جب اس کا کوئی اثر نہیں ہوا تو ہم نے حاکمانہ معاملہ کیا اور فہمائش اور دلائل کے ساتھ اپنے احکام کی حقیقت ثابت کرنے سے دریغ نہیں کیا، اور ہمارا مقصود اس تمام جدوجہد سے محض دین حق کا اجرا تھا، اس پر بھی کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ ان کی سرکشی اور تمرد میں اتنی ترقی ہوئی کہ اتنے مسلمانوں کو جو اپنے ملک کا خلاصہ اور لب لباب تھے، شہید کر دیا ہماری نیت اس پورے طرز عمل سے ملک گیری یا جاہ طلبی کی نہ تھی، ہمارا مقصود محض اصلاح و تربیت تھا، اب ہم اس ملک کے لوگوں کو منتقم حقیقی کے انصاف پر چھوڑتے ہیں، اور اپنے باقی ماندہ رفیقوں کو لے کر کسی دوسرے ملک کی طرف رخ کرتے ہیں، اس لئے کہ جب ہم نے اپنے ملک سے ہجرت اختیار کی تو جہاں کہیں راست باز اور صادق القول لوگ ملیں گے، وہیں ہم قیام اختیار کرلیں گے کچھ اسی ملک پر انحصار نہیں ہے[1]۔

جب آپ کی ہجرت کی خبر مشہور ہوئی تو جو حقانی عالم و مخلص سادات اور معتقد خوانین پنجتار میں حاضر تھے، سب کو اس خبر سے بڑا رنج ہوا، یہ خبر سن کر اطراف و نواح کے مخلصین و معتقدین بھی آنے لگے اور کہنے لگے کہ کسی طرح آپ یہاں سے نہ جائیں، ایک روز سردار فتح محمد خاں کی قوم کے لوگ جو اطراف کی بستیوں میں رہتے تھے، جمع ہو کر پنجتار آئے اور فتح خاں کو ساتھ لے کر آپ کے پاس حاضر ہوئے اس وقت عصر و مغرب کا درمیان تھا، اور آپ مسجد میں بیٹھے تھے، فتح خاں نے عرض کی میری قوم کے لوگ آئے ہیں، اور آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں، آپ نے فرمایا اچھا بیان کرو یہ بھائی کیا کہتے ہیں، فتح خاں نے کہا یہ سب صاحب عرض کرتے ہیں کہ آپ یہاں سے کہیں تشریف نہ لے جائیں، ہم سب آپ کے فرماں بردار اور جاں نثار ہیں، ہم سے

---

[1] منظورۃ السعداء ص ۱۰۰۳۔

آج تک آپ کی خدمت میں کوئی گستاخی و بے ادبی نہیں ہوئی۔

آپ نے فرمایا یہ بھائی سچ کہتے ہیں، آج تک ان سے کوئی قصور صادر نہیں ہوا ہم ان سے راضی ہیں ان پر بغاوت کا حکم نہیں لگاتے اور جو یہ کہتے ہیں کہ سید بادشاہ یہاں سے نہ جائیں، اللہ تعالےٰ ان کو جزائے خیر دے ! بات یہ ہے کہ اگر یہ لوگ ملک سمہ وسوات، بنیر وغیرہ کے تمام لوگ یہ کہیں کہ تم یہاں سے نہ جاؤ اور اکیلے تم کہو کہ جاؤ تو میں چلا جاؤں گا اور تمام لوگ کہیں کہ تم یہاں سے چلے جاؤ اور تم اکیلے کہو کہ نہ جاؤ تو میں ہرگز نہ جاؤں گا، اگر اس بات کے کہنے سے تم کو کچھ لحاظ معلوم ہوتا ہو تو اپنے دل کی بات چپکے سے میرے کان میں کہہ دو۔

یہ فرما کر آپ نے فتح خاں کو اپنے پاس بٹھا کر اپنا کان فتح خاں کے منہ کے پاس کر دیا، بہت دیر تک فتح خاں کچھ باتیں کرتا رہا، آپ بھی اس کے کان میں کچھ باتیں کرتے رہے تمام لوگ دور سے دیکھتے رہے، مگر کسی کو معلوم نہ ہوا کہ وہ باتیں کیا تھیں۔!

جب سید صاحب فتح خاں سے باتیں کر چکے تو آپ اس کی قوم کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا کہ "بھائیو ہم تم سے راضی ہیں، تم پر بغاوت کا حکم نہیں لگاتے ہم جو یہاں سے جاتے ہیں تو کسی مصلحت سے جاتے ہیں، اور ہم تمہارے فتح خاں کو خلیفہ بنا کر جائیں گے جو کچھ عُشر کا غلہ تم سب ہم کو دیتے تھے، اب ان کو دیا کرنا، اور شریعت کے جو احکام فتح خاں تم کو تعلیم کریں ان کو قبول کرنا اور ان سے کسی امر میں بغاوت نہ کرنا، اور ہندوستان کے جو لوگ اس طرف ہو کر کبھی آئیں تو ان کی خاطر داری کرنا ان کو کسی طرح کی تکلیف نہ دینا"

اسی طرح ان کو اچھی طرح سمجھا بجھا کر رخصت کیا۔

ایک روز آپ عصر کی نماز پڑھ کر مسجد میں بیٹھے سردار فتح خاں بھی اس وقت موجود تھا۔ آپ نے اپنا کرتا اپنے ہاتھ سے خان ممدوح کو پہنایا اور اپنا عمامہ اس کے سر پر باندھا،

اور خلافت نامہ لکھوا کر دیا۔

روانگی سے پیشتر آپ نے اپنے ساتھیوں اور مقامی مسلمانوں کو جمع کر کے فرمایا کہ بھائیو اللہ تعالیٰ نے تم کو اس عبادت (جہاد) میں شریک کیا، اور تم نے محض لوجہ اللہ اس راستہ کے گرم و سرد کو برداشت کیا، تم نے نصرت و رفاقت کا حق ادا کیا اب ہم اس ملک سے دور دراز ملک کا قصد رکھتے ہیں ہم کو خود معلوم نہیں کہ کہاں جائیں گے سفر کو "قطعۃ من العذاب" کہا گیا ہے خصوصیت کے ساتھ یہ سفر کوہستان کا ہے، اس میں کھانے پینے کی تکلیف ضرور ہو گی اور مالوفات و عادات کو ترک کرنا ہو گا، اس لئے وہ شخص ہمارے ساتھ چلے جو صبر و استقامت کے لئے تیار ہو اور مالک کی شکایت زبان پر کبھی نہ لائے، ہم ابھی سے خبردار کر دیتے ہیں کہ تکلیف کے پیش آنے کے وقت کوئی یوں نہ کہے کہ سید نے ہم کو دھوکا دیا یا یہ کہ ہم کو معلوم نہ تھا کہ اتنی تکلیفیں پیش آئیں گی پس جو شخص اپنے اندر صبر و استقامت کی طاقت پائے وہ ہمارا شریک ہو۔

پنجتار سے بالاکوٹ تک

ماہ رجب ۱۲۴۶ھ میں سید صاحب نے روانگی کا اعلان کیا، راستہ میں جان طلب نواسہ سید موسیٰ بن سید احمد علی شہید سے ملاقات ہوئی، وہ سید صاحب کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے، سید صاحب نے ان کے پاس خاطر کے لئے ایک روز وہاں قیام بھی فرمایا، دوسرے روز راستہ ہی میں آپ کو ان کے انتقال کی اطلاع ملی۔

اس درمیان میں آپ کو کئی بار ہجرت کے ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش کی گئی لیکن آپ نے خوش اسلوبی اور نرمی کے ساتھ معذرت کر دی، بلکہ ان باغیوں اور غداروں کو مختلف تحائف اور ہدیے دے کر اعزاز و اکرام کے ساتھ رخصت کیا۔

راستہ میں سید صاحب مختلف موقعوں پر وعظ و نصیحت بھی کرتے جاتے تھے، اور جہاد اور ہجرت کی فضیلت اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس خوشنودی اور انعام و اکرام کا وعدہ ہے، اس کی تفصیل بیان کرتے تھے جس سے ان مہاجرین و مجاہدین کے دلوں میں ایک نیا حوصلہ و ولولہ پیدا ہوتا۔

بزڈھیری سے روانگی سے ایک روز پہلے آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ بھائیو کل سویرے کوچ ہوگا، ہوشیار رہو، اور جن صاحبوں کو کچھ کارِ ضروری ہو اس سے فراغت کر لیں، اسی کے بعد اسی مجلس میں آپ نے بہت دیر تک ہجرت و جہاد کے فضائل اور مجاہدین و شہداء کے بلند مراتب کا بیان کیا یہاں تک کہ حاضرین کے قلوب از سرِ نو تازہ ہو گئے اور وہ سفر کی تکلیفوں کو بھول گئے جیسے مرجھائی ہوئی کھیتی پانی دینے سے لہلہا اٹھے۔

ہجرت کا یہ راستہ بھی اپنی دشوار گزاری اور سختی میں اس راستہ سے کم نہ تھا جس سے مہاجرین پہلے یہاں آئے تھے، اُن کے راستہ میں ایک بار پھر بلند پہاڑ تھے، جن پر چڑھائی آسان نہ تھی، بعض مقامات پر دن کو کڑاکے کی سردی سے واسطہ پڑا اور محنت و مشقت کے ساتھ فقر و فاقہ کی نوبت بھی آئی، لیکن سید صاحب ہمراہیوں کو برابر اجر و ثواب کی امید دلاتے، ان کا حوصلہ بڑھاتے، اور راہِ جہاد میں ہر قسم کی تکلیفوں کو برداشت کرنے پر آمادہ کرتے اور خود بھی راحت و تکلیف میں ان کے ساتھ شریک رہتے ان دنوں میں آپ کا چہرہ فرطِ مسرت سے دمکتا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے آپ انتہائی عیش و آرام میں ہیں،

اور نہایت شوق و ذوق کے ساتھ اپنے اصل آشیانہ یا نشیمن کی طرف مائل پرواز ہیں، اپنے اخلاق و شفقت اور اپنی باتوں سے آپ لوگوں کو اپنے سے قریب اور مانوس رکھتے اور ان کی ملاطفت و دلداری کرتے رہتے، مختلف دیہاتوں اور قصبوں میں کئی کئی روز قیام فرماتے اور وہاں کے مقامی نزاعات اور قبائلی اختلافات کو ختم فرماتے، اور لوگوں کو جہاد فی سبیل اللہ کی دعوت دیتے، اللہ تعالےٰ غیب سے رزق مہیا فرماتا، جگہ جگہ ان کی ضیافت ہوتی اور عزت و محبت کے ساتھ ان کو مہمان بنایا جاتا، اسلامی زندگی، مساوات، ایثار و ہمدردی اور تعاون "علی البر والتقویٰ" پوری شان کے ساتھ یہاں جلوہ ریز تھا۔

راستہ ہی میں آپ کو خبر مل گئی تھی کہ جس وقت انھوں نے پنجتار کو چھوڑا اس کے بعد ہی ہری سنگھ حاکم ہزارہ ایک لشکر جرار لے کر جو پچیس ہزار پیادوں پر مشتمل ہے، روانہ ہوا، اور اس نے دریائے سندھ کو پار کر کے وہاں کے گاؤں والوں کو اپنے قتل و غارتگری اور لوٹ مار کا نشانہ بنایا، اور اس کے لشکریوں نے بڑی تعداد میں مسلمان لڑکیوں کو اور مسلمانوں کی بیویوں کو اغوا کر لیا ہے۔

سید صاحب اس گھاٹی میں تشریف لائے جو کشمیر کے راستہ میں پڑتی ہے، آپ نے وہاں اس کے پہرہ و استحکام کا انتظام کیا۔

موضع راج دواری میں اکثر غازیوں نے آپ کے ہاتھ پر اصحاب صفہ کی بیعت کی اس بیعت میں عہد و پیمان یہ تھا کہ وہ اپنی چھوٹی بڑی سب حاجتوں کو سوائے خدا کے کسی سے طلب نہ کریں گے، اور جو بات اپنے حق میں معیوب و مکروہ جانیں گے وہ اور کسی مسلمان بھائی کو نہ کہیں گے، اور اپنی ضرورت پر مسلمان بھائی کی ضرورت مقدم رکھیں گے، اور جو چیز اپنے نفس کے لئے پسند کریں گے، وہی اور مسلمانوں کے واسطے بھی پسند کریں گے۔

اس پہاڑی علاقہ میں سکھوں کے تاخت و تاراج کی وجہ سے بڑی بے اطمینانی کیفیت پائی جاتی تھی، سکھ اِن امرار اور سرداران قبائل کو ایک دوسرے سے لڑاتے رہتے تھے، بعض سرداروں کو ان کے ملک سے نکال دیا گیا تھا، چنانچہ یہ لوگ سب سید صاحب سے آکر مل گئے۔

کشمیر پر قبضہ کے لئے اور اس کو دعوت و جہاد کا مرکز بنانے کے لئے اِن عناصر کا اتحاد ضروری تھا، بالاکوٹ جو وادی کاغان کے قریب واقع تھا، اور تین طرف سے پہاڑوں سے گھرا ہوا تھا، اس نقل و حرکت کا بہترین مرکز بن سکتا تھا، اور قدرت نے اس کو ایک مستحکم قلعہ کی شکل دے دی تھی، چنانچہ یہ رائے طے پائی کہ اسی جگہ کو مجاہدین کا مرکز بنایا جائے۔

سید صاحب نے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو وہاں روانگی کا حکم دیا، مولانا اپنے ہمراہیوں کے ساتھ دوپہر کے قریب بھوگڑمنگ سے بالاکوٹ کی طرف روانہ ہوئے، چلتے چلتے پہاڑ کی چڑھائی آئی وہاں کئی چشمے جاری تھے ظہر کا وقت ہوا سب نے وضو کرکے وہیں نماز پڑھی پھر قطار باندھ کر پہاڑ پر چڑھنے لگے، تمام پہاڑ برف کی وجہ سے سفید بلور سے نظر آرہے تھے، گوجر پیال کی چپل پاؤں میں پہنے برف پر چلتے تھے، ان کے چلنے سے برف پر نشان سا بنتا جاتا تھا، اسی نشان پر سب آگے پیچھے چل رہے تھے، اس عرصہ میں ابر آگیا، اور برف برسنے لگی عصر اخیر کو برف برسنی موقوف ہوئی اور آفتاب نظر آیا اسی وقت لوگوں نے جلد جلد اسی برف سے وضو کرکے جس نے جہاں موقع پایا وہاں نماز پڑھی کسی نے اکیلے، کسی نے جماعت سے، کسی نے پہاڑ کی چوٹی پر مغرب کی نماز پڑھی، کسی نے دَرّے میں، اسی وقت لوگوں نے رمضان المبارک کا چاند دیکھا۔

وہاں سے پہاڑ کا اتار شروع ہوا برف کی کثرت سے پہاڑ کا نشیب و فراز برابر ہوگیا تھا، راستہ کا پتہ نشان نہیں معلوم ہوتا تھا، سب لوگ اٹکل سے چل رہے تھے، اور جا بجا ایک دوسرے پر پھسل پھسل کر گرتے تھے، اس وقت تکلیف کے مارے لوگ اپنی زندگی سے تنگ تھے، جو دو چار بار پھسل کر گرا اس میں چلنے کی طاقت نہ رہی، باربرداری کے جو چند خچر گولہ بارود وغیرہ سے لدے ہوئے تھے، وہ بھی لوگوں سے چھوٹ گئے، اسی اثنا میں کئی آدمیوں نے پکار کر آواز دی کہ مولانا محمد اسماعیل صاحب گر گئے یہ سن کر تمام لوگ غم کے مارے رونے لگے دامن کوہ میں جا بجا چند گھر گوجروں کے تھے، ناصر خاں کے ساتھی گوجروں نے اپنی بولی میں گوجروں کو پکارا کہ جلد دوڑو غازی لوگ برف میں گر گئے، ان کو اٹھاؤ۔

بالاکوٹ میں

۵ر ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ کو سید صاحب مع اپنے لشکر کے بالاکوٹ روانہ ہوئے۔

ادھر بالاکوٹ سے فجر کی نماز پڑھ کر مولانا محمد اسماعیل صاحب سب لوگوں کو لے کر آپ کے استقبال کو آئے، جب آپ پہاڑ سے اتر کر موضع ستبنی کے نالے پر پہنچے تو وہاں مولانا صاحب اور سب لوگوں سے ملاقات ہوئی، سب کے ساتھ آپ بالاکوٹ میں داخل ہوئے، بستی کے خان واصل خاں نے آپ کے لئے اپنی حویلی خالی کر دی، اس میں آپ ٹھہرے باقی لوگ بستی کے دوسرے گھروں میں۔

بالاکوٹ وادی کاغان کے جنوبی دہانے پر واقع ہے، یہاں پہنچ کر وادی... کو

پہاڑی دیوار نے بند کردیا ہے، دریائے کنھار کے منفذ کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے، پہاڑ کی دو دیواریں، متوازی چلی گئی ہیں بیچ میں خلا ہے، جس کا عرض آدھ میل سے زیادہ نہیں اسی خلا میں دریائے کنھار گزرا ہے۔

بالاکوٹ کے مشرق میں کالوخاں کا بلند ٹیلہ واقع ہے، جس کی چوٹی پر کالوخاں نام کا گاؤں ہے، مغرب میں مٹی کوٹ کا ٹیلہ ہے، جو بہت بلند ہے، ٹیلے کے شمالی حصہ میں چوٹی پر مٹی کوٹ گاؤں ہے جس کے بارے میں مثل مشہور تھی کہ جس کا مٹی کوٹ اس کا بالاکوٹ، ایک پرانی پگڈنڈی جنوبی و مغربی سمت کے پہاڑوں میں سے مٹی کوٹ کے ٹیلے پر پہنچتی تھی، مولوی سید جعفر علی صاحب لکھتے ہیں کہ ایک راستہ جو ہندوستان کے سلاطین قدیم کا تراشا ہوا تھا، اس چوٹی تک جاتا تھا، مرور زمانہ سے وہاں بڑے بڑے درخت کھڑے ہو گئے تھے، اور جنگل ہو گیا تھا، پہاڑوں سے لڑھک کر گرنے والے پتھروں نے بھی اس راستہ کو خراب کر دیا تھا، لیکن مقامی لوگوں کو اس راستہ کی شناخت تھی

بالاکوٹ کے شمالی جانب تین ٹیلے ہیں جنھوں نے مل کر ایک دیوار بنا دی ہے، وہ دیوار بالاکوٹ کے شمالی اور مغربی گوشے سے شروع ہو کر شمالی اور مشرقی گوشہ تک چلی گئی ہے، مغرب کی سمت میں ست بنے کا ٹیلہ ہے، جس پر اسی نام کا گاؤں آباد ہے۔

جنوب کی سمت میں کنھار کی وادی ہے جس نے کاغان سے باہر نکلتے ہی بالاکوٹ کے پاس جنوبی و مغربی رخ اختیار کر لیا ہے۔

حلقہ کے عین بیچ میں ایک ٹیلہ یا قدرتی پشتہ ہے جس پر بالاکوٹ کا قصبہ آباد ہے، پشتہ کے شمالی و مغربی سمت میں زمین کی سطح تک مکان چلے گئے ہیں، اور عام پہاڑی آبادیوں کی طرح درجہ بدرجہ ہیں، یعنی نیچے کے مکان کی چھت اوپر کے مکان کا صحن ہے۔[۱]

۱۔ اختصار از سید احمد شہید ص ۳۶۸-۳۶۹

شیر سنگھ دریائے کنہار کے مشرقی کنارے بالاکوٹ سے دو ڈھائی کوس پر اپنے لشکر کے ساتھ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا، "وقائع" میں ہے کہ لوگ بالاکوٹ سے اس کے خیمے ڈیرے دیکھتے تھے، اس کے لئے بالاکوٹ پر حملہ کی دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں، یا وہ پہاڑ پر اُس پرانی پگڈنڈی سے چڑھتا جو جنوبی و مغربی سمت کے پہاڑوں میں سے مٹی کوٹ کے ٹیلہ پر پہنچتی ہے، اور مٹی کوٹ کے ٹیلہ پر پہنچ کر نیچے اترتا، یہ راستہ کسی مقامی واقف حال آدمی کی رہبری کے بغیر طے نہیں ہو سکتا تھا، اس راستہ سے بھاری سامان اور توپیں بھی لے جانا ممکن نہ تھا۔

دوسری صورت یہ تھی کہ وہ دریائے کنہار کے مشرقی کنارے کے ساتھ ساتھ بالاکوٹ کے سامنے پہنچتا، یہ صورت نسبتاً آسان تھی، ان دونوں راستوں کی حفاظت اور ناکہ بندی ضروری تھی، اور سید صاحب نے بالاکوٹ پہنچتے ہی اس کا بندوبست فرمایا۔

"وقائع احمدی" میں ہے، ایک ملکی نے آکر خبر دی کہ آج سکھ لوگ اس پار اترنے کو دریا پر لکڑی کا پل بنا رہے ہیں، یہ خبر سن کر آپ نے حبیب اللہ خاں سے کہا کہ اس دریا کی گھڑی پر تو ہمارے امان اللہ خاں متعین ہیں، اس کے علاوہ کوئی اور بھی آنے کا راستہ ہے؟ انھوں نے عرض کیا کہ ہاں ایک اور پگڈنڈی ہے، جہاں مرزا احمد بیگ کا پہرہ ہے، آپ نے پوچھا وہ راستہ سکھوں کو معلوم ہے؟ خان موصوف نے عرض کیا کہ سکھوں کو تو معلوم نہیں مگر اسی ملک کا کوئی بھیدی اگر طمع دنیا سے کچھ لے کر ان کو لے آئے تو آسکتے ہیں، یہ سن کر آپ نے فرمایا کچھ اندیشہ نہیں اللہ تعالے ہمارے ساتھ ہے۔

اس کے اگلے روز مخبر نے آکر خبر دی کہ آج سکھوں کا لشکر دریا کے اس پار اُترتا ہے مگر ادھر نہیں آتا، اور طرف جاتا ہے، آپ نے سن کر فرمایا خیر لشکر ادھر آئے، اعد کہیں جائے،

اللہ تعالےٰ ہمارا محافظ و ناصر ہے، پھر وہ لشکر شام تک نہ معلوم ہوا کہ دریا اُتر کر کہاں چلا گیا۔

اس کے اگلے روز ظہر کے اخیر وقت مرزا احمد بیگ کے پہاڑ پر یکبارگی بندوقیں چلنے لگیں ادھر سب غازی ہوشیار ہو گئے اور کہنے لگے دیکھو تو یہ بندوقیں کیوں چلتی ہیں، اسی اثنا میں پہاڑوں پر جابجا گوجر لوگ پکارنے لگے کہ سکھوں کا لشکر آپہنچا آپ نے فرمایا کہ کچھ لوگ مرزا احمد بیگ کی کمک کو جلد جائیں اور ان کو وہاں سے اِدھر لے آئیں اور وہاں ان سے مقابلہ نہ کریں، مگر ابراہیم خیر آبادی کہ نشان بردار تھے، اور ان کے جوڑی دار فرج اللہ رشیدی کو حکم ہوا کہ تم نشان لے کر جاؤ ان کے پیچھے سید اللہ نور شاہ ولایتی کو مع جماعت اور ان کے پیچھے آپ نے ایک اور نشان بھیجا، اس کے ہمراہ بھی کچھ لوگ تھے، ان چاروں نشانوں کے ہمراہ کچھ اوپر دو سو آدمی ہوں گے، کوئی پہر دن رہے، سب جا کر مٹی کوٹ پر پہنچے، ادھر سے مرزا احمد بیگ اپنی جماعت کے ساتھ آپہنچے اور کہنے لگے کہ اب آگے جا کر کیا کرو گے وہاں تو سکھوں کا لشکر آ گیا۔

مشہد بالاکوٹ

اس اثنا میں لوگوں نے آپ کو مشورہ دیا کہ بالاکوٹ سے ہٹ کر پہاڑی کے دامن میں آجائیں، اس سے یہ حملہ آور لشکر اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے گا، اس طرح کی باتیں سن کر آپ نے فرمایا کہ کفار کے ساتھ چوری سے لڑنا ہم کو منظور نہیں[1]، اسی بالاکوٹ کے نیچے ان سے لڑیں گے۔ اسی میدان میں لاہور ہے، اسی میں جنت ہے، اور جنت تو پروردگار نے

---

[1] جنگ کے سلسلہ میں ایک مقام ضرور ایسا آتا ہے، جہاں فیصلہ کن جنگ اور ثبات و (باقی ص ۲۴۵ پر)

ایسی عمدہ چیز بنائی ہے کہ ساری دنیا کی ریاست اس کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔

میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تمام جہاں سے جو عمدہ چیز ہو، اس کو اپنے پروردگار کے نذر کر کے اس کی رضامندی حاصل کروں اور اپنی جان کو اس کی راہ میں نثار کرنے کو تو میں ایسا سمجھتا ہوں، جیسے کوئی ایک تنکا توڑ کر پھینک دیتا ہے۔

اسی صلاح و مشورہ میں دو ڈھائی گھڑی رات گزر گئی اس وقت یہ بات ٹھیری کہ دریا کا پل توڑ کر غازیوں کا پہرہ اٹھا لیا جائے، چنانچہ یہی کیا گیا۔

عشا کی نماز کے بعد آپ نے ملا لعل محمد قندھاری سے فرمایا کہ بھلا تم ستبنی کے اس نالے پر ہو کر اور پہاڑ کے اوپر جا کر سکھوں پر چھاپہ مار سکتے ہو؟ انھوں نے عرض کیا کہ ہاں کیوں نہیں مار سکتے، مگر اس شرط سے کہ آپ کو یہاں تنہا نہ چھوڑیں گے، اپنی جان کے ساتھ رکھیں گے کیونکہ اتنے برس اس ملک میں رہ کر یہاں کے لوگوں کا حال خوب دیکھ لیا ان سے نفاق دور ہونا بہت مشکل ہے، سکھوں کا جو لشکر پہاڑ پر آیا ہے، ان کو بھی ملکی لوگ لائے ہیں، ورنہ کیا مجال تھی کہ آ سکے۔

آپ نے فرمایا کہ تم سچ کہتے ہو حقیقت حال یہی ہے، اتنے برس ہم نے اس کار خیر کے واسطے طرح طرح کی کوشش و جانفشانی کی، اپنی دانست میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا،

(باقی ص ۲۴۴ کا) استقامت کی ضرورت ہوتی ہے، سید صاحب نے اس موقع پر پورے مقابلہ کا فیصلہ فرمایا بظاہر بالاکوٹ چھوڑ کر چلے جانے کے مشورے قرین عقل معلوم ہوتے ہیں لیکن زیادہ گہری نظر اور ایک غیور بہادر کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ مشورہ قابل قبول اور یہ تدبیر کارگر نہ تھی، اس کا انجام صرف یہ ہوتا کہ وقتی طور پر لشکر کی جان بچ جاتی مگر سکھ بالاکوٹ کی پوری بستی کو پھونک دیتے، اور ناکردہ گناہ آبادی کو تہ تیغ کر کے رکھ دیتے۔

ہندوستان، اور ترکستان میں اپنے خلفاء روانہ کئے انھوں نے بھی حتی الامکان دعوت فی سبیل اللہ میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور ہم بھی جہاں جہاں گئے، وہاں کے لوگوں کو ہر طریقہ پر وعظ و نصیحت سے سمجھاتے رہے، مگر سوائے تم غرباء کے کسی نے ہمارا ساتھ نہ دیا، بلکہ ہم پر طرح طرح کا افترا کیا، اب ہمارے کاتب بھی خطوط لکھتے لکھتے تھک گئے، اور ہم بھیجتے بھیجتے تنگ آ گئے، اور کچھ ظہور میں نہ آیا، اب یہی خوب ہے کہ اپنے غازیوں کو پہروں پر سے اپنے پاس بلوالیں، کل صبح کو اسی بالاکوٹ کے نیچے ہمارا اور کفار کا میدان ہے، اگر اللہ نے ہم عاجز بندوں کو ان پر فتحیاب کیا تو پھر چل کر لاہور دیکھیں گے اور اگر شہید ہو گئے، تو جنت الفردوس میں چل کر عیش کریں گے۔

اس وقت تمام لوگ عالم سکوت میں تھے، کوئی کسی طرح کا چون و چرا نہ کرتا تھا، پھر آپ نے مٹی کوٹ کے سب غازیوں کو بلوا کر اپنے پاس جمع کر لیا۔

آپ نے سب غازیوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ بھائیو آج کی رات اپنے پروردگار سے بہ کمال اخلاص توبہ و استغفار کرو، اور گناہوں کی بخشش چاہو، یہی وقت فرصت کا ہے، کل صبح کو کفار سے مقابلہ ہے، خدا جانے کس کی شہادت ہے، اور کون زندہ رہے۔

جب یہ بات واضح ہو گئی کہ سکھ مٹی کوٹ سے اُتر کر بالاکوٹ پر حملہ آور ہوں گے، ایک موثر اور فیصلہ کن جنگ کے لئے انتظامات کئے گئے قصبہ کا جائے وقوع اور میدان جنگ کی طبعی کیفیت مجاہدین کے لئے سازگار تھی، اس سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی حملہ آور جب مٹی کوٹ سے اُترتے تو ان کو قصبہ پر حملہ کرنے سے پہلے (جو بلندی پر واقع تھا) اسی نشیبی میدان سے سابقہ پڑتا جو ٹیلے اور قصبہ کے درمیان واقع ہے، اس نشیبی میدان میں دھان کے کھیت تھے، آپ کے حکم سے وہاں چشمے کا پانی چھوڑ دیا گیا تاکہ مسطح میدان دلدل میں

تبدیل ہو جائے، جس کو عبور کرنا، اور وہاں جنگی نظام قائم رکھنا حملہ آوروں کے لئے دشوار ہو، اس کے بالمقابل مجاہدین کو جو قصبہ کی بلندی پر موجود اور مورچے لگائے ہوئے تھے ان پر حملہ کرنا آسان ہو، اور حملہ آور آسانی کے ساتھ ان کی گولیوں کی زد میں آجائیں۔

اس تدبیر کے علاوہ مختلف مورچوں پر جہاں سے سکھ لشکر کے دباؤ اور زور کا اندیشہ تھا، مجاہدین کی مختلف جماعتوں کو مقرر کر دیا گیا تھا، زیادہ تر مورچے ست بنے کے نالے پر تھے، جو بالاکوٹ سے شمال مغرب کے گوشہ پر ہے، اور مٹی کوٹ سے اترنے والے لشکر کا اس طرف سے بالاکوٹ پر حملہ کرنا زیادہ متوقع تھا، یہاں سب سے پہلا مورچہ ملا لعل محمد قندھاری کا تھا، جو ست بنے کے نالے اور ٹیلے کے درمیان تھا، وہاں سے سلسلہ وار قصبہ کی جانب مولانا محمد اسماعیل صاحب اور شیخ ولی محمد صاحب کی جماعتوں کے مورچے تھے، پھر ناصر خاں اور حبیب اللہ خاں کے مورچے تھے۔

قصبہ کی تینوں مسجدوں اور مناسب مقامات پر بھی مورچہ بندی کر دی گئی۔

"وقائع احمدی" میں ہے، بالاکوٹ کے جانب مغرب مٹی کوٹ ہے اس کی جڑ بھی زینے کی مانند ڈھلوان تھی، وہاں دھان بوئے جاتے تھے، حضرت امیر المومنین کی اجازت سے اس زمین میں چشمہ کا پانی رات ہی کو چھوڑ دیا گیا۔

بالاکوٹ میں تین مسجدیں تھیں، بستی کے بیچ میں ایک مسجد بڑی تھی جس میں حضرت نماز پڑھتے تھے، ایک اور مسجد اس مسجد سے تھوڑی دور تھی، اور ایک مسجد بالاکوٹ کے نیچے اتار پر تھی، سو حضرت نے رات ہی کو اپنے سب غازیوں سے فرمایا کہ جس کو جو کچھ لکڑی یا پتھر دستیاب ہو وہ اپنے اپنے ٹھکانے پر لڑائی کے واسطے مورچہ بنائے پھر اپنے پاس سے سب کو رخصت کیا، اسی وقت جاکر لوگوں نے اپنے اپنے مورچے بستی کے کواڑ تختے لکڑی پتھر لاکر

بنائے، اور چوکی پہروں کا بندوبست کر کے سونے لگے۔

آپ مسجد سے اپنے ڈیرے پر تشریف لے گئے کھانا تناول فرمایا، اور اپنے کپڑے اور ہتھیار منگوائے، آپ نے چار کپڑے منشی خواجہ محمد (حسن پوری) کو بھیجے کہ کل فجر کو یہی کپڑے پہن کر مقابلہ کو چلیں اور تین کپڑے حکیم قمرالدین پھلتی کو کہ وہ بھی کل فجر کو یہی پوشاک پہنیں، اور ایک ارخالق، ایک دستار کاکریزی، ایک شال کشمیری پٹکا اور سپید پائجامہ، یہ چار کپڑے اپنے واسطے رکھے، اور ہتھیاروں میں سے ایک تفنگچہ، ایک ولائتی چھری، ایک ہندوستانی تلوار اور کٹار سے چار ہتھیار اپنے واسطہ رکھے، پھر لوگوں سے فرمایا کہ اب اپنے اپنے بستر پر جاکر سو رہو، ہم بھی سوتے ہیں۔

میاں عبدالقیوم صاحب کہتے ہیں کہ وہ رات اس طرح وحشتناک تھی کہ اس کا بیان تقریر سے باہر ہے، آسمان پر ابر بھی تھا، اور بوندیاں بھی پڑتی تھیں، شام سے صبح تک تمام پرند جانور شور و غل کرتے رہے، خود اس بستی کے لوگ ہم لوگوں سے کہتے تھے کہ ہم نے ایک سے ایک اندھیری اور خوفناک رات دیکھی، مگر ایسی اداس اور خوفناک رات دیکھنے میں نہیں آئی۔

میاں لعل محمد جگدیس پوری کہتے ہیں، کہ بالاکوٹ کی لڑائی سے کئی روز پہلے سے کہر کی مانند ایک سرخ غبار چھایا ہوا تھا، اور لوگوں کو ایک ہیبت اور اداسی سی معلوم ہوتی تھی، ویسا دھواں کبھی نہ دیکھا تھا، غازیوں میں اس کا تذکرہ ہوا، اور قاضی علاءالدین صاحب نے سید صاحب سے ذکر کیا، آپ کچھ دیر سکوت میں رہے، اور آسمان کی طرف دیکھنے لگے اس کے بعد فرمایا کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ہمارے لشکر کے مجاہدین میں سے کچھ لوگ راہِ خدا میں اپنی جانیں دے کر اپنی دلی مراد کو پہنچ کر کامیاب ہوں گے اور تم لوگوں میں سے کوئی شخص جدا بھی ہو جائے گا، آگے اس کی حقیقت اللہ جانے۔

شہادت کی صبح

۲۴ ذیقعدہ (۱۲۴۶ھ) کی صبح صادق اور صبح کی اذان ہوئی تو سب لوگ وضو کر کے مسلح ہو کر حاضر ہوئے آپ نے نماز پڑھائی پھر اجازت دی کہ اپنی اپنی جگہ جا کر ہوشیار رہو آپ بھی اپنے ڈیرے پر آ کر وظیفے میں مشغول ہو گئے، جب آفتاب نکلا تو نماز اشراق پڑھ کر کچھ دیر کے بعد وضو کر کے سرمہ لگایا اور ڈاڑھی میں کنگھی کی اور لباس اور ہتھیار پہن کر مسجد کو چلے، اس وقت سکھ پہاڑ سے مٹی کوٹ کی طرف اترتے تھے، لوگوں نے ان کی طرف اشارہ کر کے آپ سے عرض کیا کہ سکھوں کا لشکر پہاڑ پر سے اترتا ہے، آپ نے فرمایا کہ اترنے دو پھر آپ مسجد میں داخل ہوئے اور اس کے سائبان کے تلے بیٹھے اور ایک ایک دو دو کر کے بہت سے غازی بھی وہیں جمع ہو گئے۔

یہ وہ مبارک ساعت تھی، جب جنت آراستہ ہو کر ان کی نگاہوں کے سامنے آگئی، ایسا معلوم ہو رہا تھا، جیسے ان کی آنکھوں سے پردہ سا اٹھ گیا ہے، اور بالاکوٹ کے پہاڑ کے پیچھے سے جنت کی خوشبو ان کے مشام جان کو معطر کر رہی ہے۔

الٰہی بخش رامپوری کہتے ہیں کہ ہماری جماعت میں پٹیالہ کے ایک سید چراغ علی تھے، اور کھیر پکا رہے تھے، اور قرابین ان کے کندھے پر پڑی ہوئی تھی، سکھ مٹی کوٹ سے نیچے اتر رہے تھے، وہ اپنی کھیر بھی چمچہ سے چلاتے جاتے تھے، اور سکھوں کی طرف بھی دیکھتے تھے، اس وقت ان پر ایک اور ہی حالت واقع تھی، یکبارگی آسمان کی طرف دیکھ کر بولے کہ وہ دیکھو

ایک حور کپڑے پہنے ہوئے چلی آتی ہے، کچھ دیر کے بعد کہنے لگے کہ دیکھو ایک پوشاک پہنے ہوئے آتی ہے یہ کہہ کر وہ چمچہ دیگچی پر مارا اور یہ کہتے ہوئے کہ اب تمہارے ہی ہاتھ کا کھانا کھائیں گے سکھوں کی طرف روانہ ہوئے کتنا ہی لوگ کہتے رہے کہ میر صاحب ٹھیر جاؤ ہم بھی چلیں گے، انھوں نے کسی کے کہنے کا کچھ خیال نہ کیا اور جاتے ہی سکھوں کے مجمع میں گھس گئے اور داد جوانمردی دے کر شہید ہو گئے۔

ادھر آپ سائبان کے نیچے سے اٹھے اور سب لوگوں سے فرمایا کہ تم سب یہیں رہو، ہم اکیلے جا کر دعا کرتے ہیں، ہمارے ساتھ کوئی نہ آئے پھر سب لوگ جہاں کے تہاں ہتھیار باندھے تیار کھڑے رہے، آپ مسجد کے اندر گئے اور دروازہ اور کھڑکی کے کواڑ بند کر لئے اور دعا میں مشغول ہوئے، کچھ دیر کے بعد یکایک کھڑکی کھول کر آپ نے پوچھا مجھ کو کس نے پکارا؟ محمد امیر خاں کہتے ہیں، میں نے عرض کی کہ ادھر سے تو آپ کو کسی نے نہیں پکارا کیونکہ ادھر میرے سوا کوئی اور آدمی نہیں ہے، یہ سن کر پھر آپ نے کھڑکی بند کر لی کچھ دیر کے بعد پھر آپ نے کھڑکی کھول کر پوچھا مجھ کو کسی نے آواز دی؟ میں نے پھر عرض کیا کہ ادھر سے کسی نے آپ کو نہیں پکارا، الغرض تین بار کھڑکی کھول کر وہی پوچھا اور تینوں بار میں نے وہی جواب دیا کہ ادھر سے کسی نے آپ کو نہیں پکارا یہی حال بڑے دروازہ کی طرف گزرا۔

شیر محمد خاں کہتے ہیں کہ تیسری بار آپ نے وہی پکارنے کا سوال کیا اور لوگوں نے وہی پہلا جواب دیا، آپ مسجد سے نکلے اور جلد باہر کو روانہ ہوئے، صحن مسجد سے نکل کر بالاکوٹ کے نیچے اترنے لگے، آپ آگے تھے اور سب لوگ آپ کے پیچھے تھے، ایک مسجد جو نیچے اتار پر تھی، غازیوں کا ایک مورچہ اس میں بھی تھا، آپ اس میں تشریف لے گئے۔

میاں عبدالقیوم صاحب کی روایت ہے کہ جب آپ نیچے کی مسجد میں تشریف لائے

وہاں کے سکھوں کی گولیاں اولے کی طرح برستی تھیں، کوئی آدھ گھڑی مسجد میں ٹھیر کر دادا سید ابوالحسن سے فرمایا کہ نشان لیکر آگے چلو، پھر باواز بلند تکبیر کہتے ہوئے آپ حملہ آور ہوئے، اس وقت ارباب بہرام خاں آپ کے آگے آگے سپر بن کر چلتے تھے۔

حافظ وجیہہ الدین صاحب باغلتی کہتے ہیں کہ میں بندوق لگاتے لگاتے ایک نالہ پر پہونچا تو دیکھتا ہوں کہ چند آدمیوں کے ساتھ سید صاحب قبلہ رو بیٹھے ہوئے بندوقیں چلا رہے ہیں، اس وقت حضرت نے میرے روبرو اپنی داہنی چھاتی پر بندوق جما کر فیر کیا تو مجھ کو آپ کے داہنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی میں یا اس کے پاس والی میں تازہ خون نظر آیا، میں نے قیاس سے معلوم کیا کہ شائد آپ کے مونڈھے میں گولی لگی ہے، بندوق چھاتی پر رکھتے وقت اس کا خون آپ کی انگلی میں لگ گیا ہے، اسی دوران حضرت نے فرمایا کہ بھائیو ان موذیوں کو تاک تاک کر گولیاں مارو۔

محمد امیر خاں قصوری کہتے ہیں، اس وقت آسمان صاف تھا، نہ ابر تھا نہ غبار دھوپ پھیلی ہوئی تھی، مگر بارود کے دھویں کے سبب سے اس طرح کی تاریکی تھی کہ نزدیک کا آدمی بھی بمشکل پہچانا جاتا تھا، سکھوں کی بندوقوں کے کارتوس کے کاغذیوں معلوم ہوتے تھے، جیسے ٹیڑیاں[1] اڑتی ہیں، وہ وقت نہایت اداس اور خوفناک نظر آتا تھا، سب مجاہدین نے قرابین اور بندوقیں گلے میں ڈال کر تلواریں پکڑ لیں اور یکبارگی باواز بلند اللہ اکبر، اللہ اکبر کہہ کر حملہ آور ہوئے، اس وقت لڑائی کا یہ رنگ تھا کہ تمام سکھ پسپا ہو کر پہاڑ پر چڑھے جاتے تھے، اور مجاہدین پہاڑ کی جڑ تک پہونچ گئے تھے، اور سکھوں کی ٹانگیں پکڑ پکڑ کھینچتے تھے، اور تلواریں مار مار کر مردار کرتے تھے، اور جانبین سے پتھر چلتے تھے، اسی اثنا میں

---

[1] ٹڈیاں

سب لوگوں نے پیچھے پھر کر جو دیکھا تو سید صاحب نظر نہ آئے، مولانا محمد اسماعیل صاحب کو لوگوں نے آخری بار اس حال میں دیکھا کہ بندوق گردن میں حمائل ہے، ہاتھ میں تلوار ہے پیشانی خون آلود ہے، اور آپ اس کو اپنے ہاتھ سے پوچھ رہے ہیں، اس وقت کسی کو کسی کی خبر نہ تھی، مجاہدین کو اس معرکہ میں سخت ابتلا کا سامنا کرنا پڑا، مولانا محمد اسماعیل صاحب شہید ہو گئے، شجاعت و بسالت، شوق شہادت دنیا کی حقارت اور امام کی محبت و اطاعت کے ایسے عجیب واقعات اس معرکہ میں پیش آئے، جنھوں نے اسلام کی ابتدائی صدیوں کی یاد تازہ کردی اور وہ پرانا زمانہ ایک دفعہ پھر لوٹ آیا۔

واقعات و بیانات میدان جنگ کی شہادتیں، قرائن و وجدان سب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس کی دعوت و تربیت اور جس کی ترغیب و تحریص سے سیکڑوں بندگان خدا کو جو اپنے وطن میں عافیت و سلامتی کی زندگی گزار رہے تھے، شہادت کی لازوال دولت نصیب ہوئی، وہ اس نعمت عظمیٰ اور سعادت کبریٰ سے ہرگز محروم نہیں رہا، بلکہ جس طرح اس کو ہندوستان میں اس کی دعوت میں اولیت و تقدم حاصل ہوا، اس کے حصول میں بھی اس کو سبقت اور امتیاز حاصل ہوا، اور وہ شہدا اہل بیت میں اپنے ان آبا کرام سے جا ملا جنھوں نے مختلف طریقوں پر شہادت پائی اور ان کا جسد طاہر شہادت کے بعد بھی دشمنوں کی گستاخیوں اور جذبۂ انتقام سے محفوظ نہیں رہا۔

ایک روایت یہ ہے کہ جنگ کے اختتام پر ایک مسلمان بچہ کی رہنمائی پر سکھوں نے مسلمانوں کو اس کی اجازت دی کہ اپنے مذہب کے مطابق آپ کی تجہیز و تکفین کریں، ایک اور روایت ہے کہ آپ کا سر دھڑ سے علیحدہ ہو گیا تھا، اور دونوں علیحدہ مدفون ہیں، بہر حال آپ کی یہ دعا قبول اور یہ تمنا پوری ہوئی کہ میری قبر کا نام و نشان

باقی نہ رہے، نواب وزیر الدولہ مرحوم لکھتے ہیں، ایک مرتبہ حضرت سے ایک شخص نے کہا کہ آپ قبر پرستی اور بزرگان دین کے مزارات پر مشرکانہ اعمال اور بدعات سے اس شد و مد کے ساتھ روکتے ہیں، لیکن خود آپ کے ہزاروں مرید اور ہزاروں معتقد ملک میں ہیں، آپ کی وفات کے بعد آپ کے مزار پر وہی ہوگا، جو دوسرے بزرگان دین کے مزارات پر ہو رہا ہے، اور آپ کے قبر کی پرستش بھی اسی طرح ہوگی، جس طرح ان قبروں کی پرستش ان کی وفات کے بعد ہوتی ہے، حضرت نے فرمایا کہ میں درگاہ الٰہی میں بصد آہ وزاری درخواست کروں گا کہ اللہ تبارک وتعالےٰ میری قبر کو معدوم اور میرے مدفن کو نامعلوم کر دے، نہ قبر رہے گی، نہ اس پر شرک و بدعت ہوگی، خدا کی قدرت و رحمت ملاحظہ ہو کہ حضرت کی یہ دعا قبول ہوئی اور آپ کی قبر کا آج تک پتہ نہ چلا۔

اسی مشہد بالاکوٹ میں اسی تاریخ ۲۴؍ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ کو مولانا محمد اسماعیل صاحب نے بھی شہادت پائی، اور دلی مراد کو پہونچے، جس کی خون جگر سے پرورش کی تھی، اور اسی طرح جہد و جہاد کی اس طویل و مسلسل حیات طیبہ کا خاتمہ ہوا، جس میں شاید ایک دن بھی فراغت و راحت اور ایک رات بھی غفلت اور استراحت کی نہ تھی۔

اس معرکہ میں تین سو سے زائد مجاہد جو اپنے اپنے علاقوں کا خلاصہ اور لب لباب کہے جا سکتے ہیں، شہادت سے سرفراز ہوئے اور ان کا ایک ہی جگہ گنج شہیداں بنا۔

جب فتح بالاکوٹ کی خبر لاہور پہونچی تو رنجیت سنگھ خوشی سے باغ باغ ہو گیا، اور اس نے حکم جاری کیا کہ سرکاری طور پر سلامی کی توپیں سر ہوں اور امرتسر میں اس واقعہ کی مسرت و شادمانی میں چراغاں کیا جائے، مہاراجہ نے فتح کی اطلاع سے مسرور ہو کر قاصد کو جو یہ خبر لایا تھا، سونے کے کنگن کی ایک جوڑی اور ایک شالی پگڑی انعام میں دی، اس نے اپنے بیٹے

کنور شیر سنگھ کو خط لکھا جس میں اس کے مراسلہ کی رسید دی، اور لکھا کہ جب واپس آئیں گے تو ان کو اس خدمت کے صلہ میں ایک نئی جاگیر عطا کی جائے گی، ایک فرمان فقیر امام الدین حاکم گوبند گھر کے نام صادر ہوا کہ وہ اس واقعہ کی مسرت میں اس قلعہ کی ہر بندوق سے گیارہ فیر سلامی کے سر کریں۔....

شاہی دربار کے انگریزی سفیر نے بھی گورنر جنرل کی طرف سے مہاراجہ کو اس فتح عظیم پر تہنیت پیش کی۔[1]

تاریخ جہاد کا نیا باب

رنجیت سنگھ کو اس خوشی و مسرت سے زیادہ لطف اندوز ہونے کا موقع نہ مل سکا بالاکوٹ کے معرکہ کے بعد وہ آٹھ برس زندہ رہا، اور ۱۸۳۹ء میں اس کا انتقال ہوا، اس کی اولاد کے ساتھ مختلف مصائب پیش آئے۔

بعض عین نوجوانی میں مرے، کوئی حادثہ اور ناگہانی مصیبت کا شکار ہوا، اس کا لڑکا شیر سنگھ بھی جو بالاکوٹ کا فاتح تھا، اور ذہانت و وجاہت کے آثار اس کے چہرہ سے ظاہر تھے، جلد ہی ۱۸۴۳ء میں مرگیا، اور اس کے بعد اس کے گھرانہ میں شدید اختلاف اور رسہ کشی کی نوبت آگئی اور خانہ جنگیاں شروع ہوگئیں، اور بالآخر اس نوزائیدہ مملکت پر ۱۸۴۹ء میں انگریزوں نے قبضہ کرلیا اور یہ سلطنت اس طرح ختم ہوئی کہ اس کا نام ونشان

---

[1] نقل از گورنمنٹ رکارڈ آفس مغربی پاکستان مصدقہ حکومت پاکستان۔

تک مٹ گیا۔

مجاہدین جو اس ہزیمت، سید صاحب اور بڑی تعداد میں مجاہدین کی شہادت سے افسردہ و مایوس تھے، کچھ عرصہ کے بعد بیدار ہوئے اور انھوں نے شیخ ولی محمد پھلتی کو جو سید صاحب کے خاص رفقاء میں تھے، اپنا امیر مقرر کیا، ان کے بعد مولانا نصیر الدین منگلوری اور ان کے بعد مولانا نصیر الدین دہلوی نے یہ جگہ سنبھالی۔

آخر میں جماعت کی قیادت عالم ربانی اور شیخ کامل مولانا ولایت علی عظیم آبادی کے ہاتھوں میں آئی جو سید صاحب کے اکابر خلفاء میں تھے، یہ ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۶ء کا واقعہ ہے[1]۔ ان کی وفات ۱۲ر محرم ۱۲۶۹ھ ۵ر نومبر ۱۸۵۲ء میں ہوئی۔

ان کی وفات کے بعد ان کے بھائی مجاہد جلیل مولانا عنایت علی عظیم آبادی نے جماعت کی قیادت کی، ان کے عہد میں پنجاب اور شمال مغربی صوبہ پر انگریزوں کا تسلط مکمل ہو گیا، اور وہ مجاہدین کی سرگرمیوں اور اعلیٰ مقاصد کے لئے ایک چیلنج بن کر سامنے آئے، یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ انگریزی حکومت اپنی فتوحات، توسیع پسندانہ عزائم اور اپنی زندگی و توانائی اور حوصلہ مندی کی وجہ سے نہ صرف برصغیر کے لئے بلکہ پورے مشرق اسلامی کے لئے حقیقی خطرہ ہے، سید صاحب اور آپ کی جماعت کے لوگ اس تاریخی حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے، آپ نے مسلمان رہنماؤں سلاطین اور والیان ریاست کو اپنے مکاتیب میں جو آپ نے ہندوستان، افغانستان اور ترکستان ارسال فرمائے تھے، اس خطرہ سے

---

[1] انگریزوں نے ان کو خانہ قید کر دیا تھا، چنانچہ یہ مدت انھوں نے ماہی بے آب کی طرح گزاری، اور مدت پوری کرتے ہی مرکز مجاہدین کا اس طرح رخ کیا جس طرح کوئی چڑیا سرِ شام کو اپنے آشیانہ کی طرف پرواز کرتی ہے، ۸ر ربیع الثانی ۱۲۶۷ھ مطابق ۱۰ر نومبر ۱۸۵۱ء میں وہ وہاں پہونچے۔

پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا، آپ نے امیر کامران بن شاہ محمود درانی حاکم ہرات کو لکھا تھا کہ ان کا حقیقی مقصد ہندوستان میں جہاد کا اجرا ہے جس کو انگریزوں نے غصب کر لیا ہے، اور وہاں کے عزت والوں کو ذلیل و خوار کر دیا ہے۔

قدرتی بات تھی کہ اب مجاہدین انگریزوں کے مقابلہ پر آجائیں، اس کے آثار مولانا ولایت علی عظیم آبادی کے زمانہ ہی میں ظاہر ہو گئے تھے، جو سید صاحب کے حقیقی مقاصد و محرکات سے سب سے زیادہ واقف اور محرم راز بھی تھے، ان کے بھائی مولانا عنایت علی کے زمانہ میں یہ بات پورے طور پر ظاہر ہو گئی، اور ان کے خلفاء امیر عبد اللہ اور امیر عبد الکریم (جو مولانا ولایت علی کے صاحبزادے تھے) کے زمانہ تک جاری رہی، یہ پوری تاریخ مہم جوئیوں اور قربانیوں اور ایسے حوادث و مصائب اور ایذا رسانی و بربریت کی داستان ہے، جس کو سن کر رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں، یہ مسلسل جنگوں اور معرکہ آرائیوں کا سلسلہ تھا، جو قتل و غارت گری، املاک و جائداد کی ضبطی، طویل مقدمات، جلاوطنی اور اخراج، اور ایسی تحقیق و تفتیش پر مشتمل تھا، جو قرون وسطیٰ میں یورپ کی عدالتوں کے ساتھ مخصوص تھا، اگر جان نثاری ایثار و قربانی اور ہمت و جوانمردی کے وہ سارے کارنامے جو اس ملک کے جہاد حریت اور قومی آزادی کی تاریخ سے متعلق ہیں، ایک پلڑہ پر رکھے جائیں اور اہل صادق پور (خاندان مولانا ولایت علی عظیم آبادی) کے کارنامے اور قربانیاں ایک پلڑہ میں تو آخر الذکر کا پلڑہ نمایاں طور پر بھاری ہوگا۔[1]

جہاد، تنظیم جماعت مالی امداد، اور مجاہدین کے مرکز ستھانہ تک رضا کاروں کو پہونچانے کے لئے ایک جال بچھا دیا گیا تھا، اور اس مقصد کے لئے بہار اور بنگال میں

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" از مولانا مسعود عالم ندوی اور "سید احمد شہید" از غلام رسول مہر۔

کئی خفیہ مرکز تھے، جو ایک خفیہ زبان میں مراسلت کرتے تھے، لاکھوں کی تعداد میں وفادار رضاکار تھے، جو امیر کے ایک اشارہ پر چلنے کے لئے تیار تھے، اور انگریزی حکومت دھمکی اور لالچ کے ذریعہ بھی ان کو اس سے باز رکھنے سے قاصر تھی[1]۔

اس تحریک نے بنگال میں شجاعت و بہادری، اسلامی جوش، دینی حمیت، زندگی کی بے وقعتی، روحِ سپہ گری، راہ خدا میں شہادت کا شوق، اسلامی اتحاد کا جذبہ، اور اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت پر اپنی مصلحت کو قربان کر دینے کا حوصلہ، اور اصولوں پر ثابت قدم رہنے کی طاقت پیدا کر دی تھی، اور اس پرسکون اور امن پسند قوم کو جو شہسواری و سپہ گری اور جہاد و قتال کے میدان سے بہت دور تھی، ایک جنگجو اور بہادر قوم بنا دیا، اور بعض انگریز جنرلوں کو نہ صرف یہ اعتراف کرنا پڑا کہ بنگالی مجاہد شجاعت و بہادری میں افغان سے کسی طرح کم نہ تھا، بلکہ قوت برداشت اور ضرب کاری میں بعض وقت ان سے آگے تھا، خفیہ پولیس سی، آئی، ڈی، اپنی مسلسل دھمکیوں اور دہشت انگیزی کے باوجود ان بنگالیوں اور ان کی نازک اور دشوار مہم میں حائل نہ ہو سکی[2]۔

عقیدہ کی پختگی اور دینی دعوت و تربیت کے اثر سے شیطان ان کے اندر جاہلی حمیت اور لسانی تہذیبی یا نسلی و قومی تعصب پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا، وہ صرف اسلام پر فخر کرتے تھے، اور اس کی خدمت، اور اشاعت و تبلیغ، اعمال صالحہ، اور اخلاق عالیہ کو اصل معیار سمجھتے تھے۔

---

[1] اس کی حیرت انگیز تفصیلات W. W. HUNTER کی کتاب "INDIAN MUSALAMANS" میں دیکھئے۔

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں "ہندوستانی مسلمان" از ڈبلو، ڈبلو ہنٹر۔

اس کا اندازہ ہم اس سے کر سکتے ہیں کہ ان کی سر کوبی کے لئے انگریزی حکومت کو جو جنگی چھاپے بھیجنے پڑے ان کی تعداد بیس[2] سے کم نہ تھی، اور اس میں ساٹھ ہزار تربیت یافتہ فوجی شامل تھے۔

ڈاکٹر ہنٹر نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ پنجاب کی چھاؤنیاں بعض دنوں میں انگریزی فوجوں سے بالکل خالی ہو جاتی تھیں، اس لئے کہ یہ فوجیں مجاہدین سے جنگ میں مشغول تھیں، کئی معرکوں میں انگریزی افواج کو پسپائی پر مجبور ہونا پڑا، یہاں تک کہ حکومت پنجاب نے عاجز آکر ۱۸۶۳ء کے آخری ایام میں اپنی ساری فوجیں واپس بلالیں اور بعد میں اس چیلنج اور خطرہ کا مقابلہ اپنی قدیم و معروف سیاست سے کیا، اس نے قبائل کو ایک دوسرے کے خلاف کھڑا کیا، مجاہدین کو مقامی انصار و اعوان سے علیحدہ کر دیا اور اس طرح ان جنگوں کا ۱۸۶۸ء میں خاتمہ ہوا۔

اس کے بعد باغیوں پر عدالتوں میں مقدمات چلائے گئے، جس کا سلسلہ ایک طویل مدت تک جاری رہا، اس تحریک جہاد کے کئی رہنماؤں پر بھی مقدمے چلے، جن میں مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی، مولانا احمد اللہ عظیم آبادی، مولوی محمد جعفر تھانیسری، مولانا عبدالرحیم صادق پوری خاص طور پر اہم اور قابل ذکر ہیں، ان لوگوں کو پھانسی کی سزا دی گئی، پھر ان کو جزائر انڈمان (پورٹ بلیر) میں عمر قید کی سزا میں تبدیل کر دیا گیا، مولانا یحییٰ علی اور مولانا احمد اللہ کا جزیرہ ہی میں انتقال ہو گیا، مولوی محمد جعفر اور ان کے رفقاء اٹھارہ[3] سال کی جلاوطنی کے بعد وطن واپس آئے، یہ ایک دلدوز اور المناک داستان ہے، جو مولوی محمد جعفر تھانیسری نے خود اپنے قلم سے "کالا پانی" یا "تاریخ عجیب" میں تفصیل سے قلمبند کی ہے۔

اس جہادِ مسلسل اور قربانی و عزیمت کی تاریخ ایک مستقل دفتر اور ضخیم کتاب کی

محتاج ہے یہاں اس تاریخِ عجیب کی صرف ایک فصل آپ کے سامنے پیش کی جارہی ہے۔

پھانسی "سے کالے پانی" تک

ماہ مئی ۱۸۶۴ء (۱۲۸۰ھ) کا دوسرا دن تھا انگریز جج ایڈورڈس انبالہ عدالت کی کرسی پر بیٹھا تھا، اور اس کے پہلو میں اس کی مدد و اعانت کے لئے چار اسیسر تھے، جو شہر کے سربرآوردہ و ذمہ دار طبقہ سے تعلق رکھتے تھے، ان کا کام یہ تھا کہ اس اہم کیس میں اپنی رائے دیں، ان لوگوں کے سامنے گیارہ آدمی کھڑے ہوئے تھے، جن کے چہرہ بشرہ سے نظر آرہا تھا کہ وہ شریف و بے گناہ ہیں، لیکن اس وقت ان کا شمار صف اول کے مجرموں میں تھا، ان پر یہ الزام تھا کہ انھوں نے انگریزی حکومت کے خلاف سازش تیار کی اور وہ سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید کے خلفاء و انصار کی امداد روپیہ پیسہ اور رضاکاروں کی صورت میں کرتے رہتے تھے، جو وہ اندرون ملک سے سرحدی علاقہ تک خفیہ طریقہ سے بھیجتے تھے، انھوں نے اپنی مراسلت اور خط و کتابت کے لئے ایک خفیہ زبان بھی تیار کرلی تھی، اور انگریزی رعایا سے رقمیں وصول کر کے باغیوں کے مرکز تک بھیجتے تھے، اس کی خبر حکومت کو ایک مسلمان فوجی کے ذریعہ لگی جو انگریزوں کے لشکر میں تھا چنانچہ پٹنہ، تھانیسر اور لاہور میں ان سب کی گرفتاری عمل میں آئی اور آج کے دن ان کی سزا کا فیصلہ سنایا جانے والا تھا۔

تم نے اپنی ذہانت اور علم کو حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے استعمال کیا ہے، مجاہدین کے مرکز پر مالی امداد اور رضاکار پہونچانے میں تم درمیانی کڑی تھے، لیکن اس جرم کے باوجود

تم برابر اپنے موقف پر اڑے رہے، تم نے یہ بات ثابت کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی کہ تم حکومت کے خیر خواہ اور وفادار ہو اس لئے میں تمہارے لئے ..... پھانسی کا فیصلہ کرتا ہوں تمہاری ساری جائداد اور املاک بھی بحق سرکار ضبط کی جاتی ہے، پھانسی کے بعد تمہاری نعش تمہارے ورثہ کے حوالہ نہ کی جائے گی بلکہ بدنصیبوں کے قبرستان میں پوری ذلت کے ساتھ دفن کر دی جائے گی، اور میں تمہیں پھانسی کے تختہ پر لٹکتے ہوئے دیکھ کر بیحد خوش ہوں گا۔

نوجوان محمد جعفر نے سکون و وقار کے ساتھ یہ فیصلہ سنا اور اس کے اندر کسی قسم کا کوئی تغیر و اضطراب ظاہر نہیں ہوا، جب جج فیصلہ سنا چکا تو محمد جعفر نے کہا:

تمام انسانوں کی جانیں اللہ تعالےٰ کے ہاتھ میں ہیں، وہی مارتا ہے، اور وہی زندگی بخشتا ہے، تمہارے ہاتھ میں نہ زندگی ہے، نہ موت، ہم میں سے کون موت کا مزہ پہلے چکھے گا، یہ کوئی بتا سکتا ہے؟

جج یہ سن کر غصہ سے بے قابو ہو گیا، لیکن اس نے اپنے ترکش کا وہ آخری تیر بھی چلا دیا جس کے بعد اس کے پاس کوئی تیر نہ تھا۔

محمد جعفر نے سزا کا حکم سنا تو ان کا چہرہ فرط مسرت سے دمکنے لگا، ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے جنت اور اس کے حور و قصور ان کی نظر کے سامنے ہوں، انھوں نے یہ شعر پڑھا

للہ الحمد کہ آں چیز کہ خاطر می خواست

آخر آمد زپسِ پردۂ تقدیر پدید

لوگ یہ منظر دیکھ کر حیرت زدہ ہی تھے کہ ایک انگریز افسر (پارسن) آگے بڑھا اور محمد جعفر سے قریب ہو کر کہا کہ میں نے آج تک ایسا منظر نہیں دیکھا، تم کو پھانسی کا حکم سنایا گیا ہے، اور تم ایسے خوش اور مطمئن ہو، محمد جعفر نے جواب دیا میں کیوں خوش نہ ہوں، اللہ تعالےٰ

مجھے شہادت نصیب کر رہا ہے، تم بیچاروں کو اس کا مزہ کیا معلوم؟

جج نے دوسرے دو ملزموں کو بھی پھانسی کا فیصلہ سنایا ان میں ایک سن رسیدہ شخص تھے، جن کے چہرہ سے صلاح و تقویٰ اور زہد و عبادت کے آثار ظاہر تھے انھوں نے یہ حکم مسرت اور شکر کے ساتھ سنا یہ صاحب مولانا یحییٰ علی صادق پوری تھے، جو امیر جماعت بھی تھے، دوسرے ایک نوجوان تھے، جو امرا اور بڑے تاجروں کے طبقہ سے معلوم ہو رہے تھے، اصلاً یہ پنجاب کے رہنے والے تھے، ان کا نام حاجی محمد شفیع تھا، دوسرے آٹھ آدمیوں کو عمر قید کی سزا سنائی گئی۔

تماشائیوں اور اہل شہر نے بہت رنج و غم کے ساتھ یہ فیصلہ سنا، آنکھیں اشکبار ہو گئیں، جیل کے راستہ کے دونوں کناروں پر مرد و عورت جمع تھے، اور ان مظلوموں کو حسرت کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔

جب وہ جیل پہونچے تو ان کے عام کپڑے اتار دیئے گئے اور مجرموں کی خاص پوشاک ان کو پہنا دی گئی، ہر تین میں سے ایک شخص کو ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں ڈالدیا گیا جس میں نہ ہوا کا گزر تھا، نہ روشنی کا، رات انھوں نے بڑی سخت گرمی میں گزاری، صبح ان کو تارلا جس میں ان کو میدان میں رات گزارنے کی اجازت دی گئی تھی۔ دن میں وہ دوبارہ تنگ و تاریک کوٹھریوں میں ڈال دیئے گئے یہ کوٹھریاں ایسی تھیں، جس میں ایک ہفتہ بھی کسی انسان کا رہنا مشکل تھا، ان کا دروازہ کھول کر ایک فوجی پہرہ پر مقرر کر دیا گیا، یہ فوجی زیادہ تر غیر مسلم ہوتے تھے۔

مولانا یحییٰ علی صاحب اسوۂ یوسفی پر عمل کرتے ہوئے پہرہ دار سے مخاطب ہو کر کہتے۔

أَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۔ (سورۂ یوسف ۳۹)	کیا متفرق معبود بہتر ہیں، یا خدائے واحد قہار۔

اکثر ایسا ہوتا کہ وہ یہ سن کر رو دیتا اور اس کو ان سے ایسا اُنس ہوجاتا کہ اگر اس کی ڈیوٹی کسی اور جگہ لگائی جاتی تو اس کو سخت رنج ہوتا۔

اس طرح مولانا یحییٰ علی صاحب نے بہت سے قیدیوں کے دلوں میں توحید اور ایمان کا بیج بو دیا، بہت سے قیدی ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے، اور بہت سے لوگوں نے توبہ کی، وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کوئی موقع ضائع نہ کرتے تھے، اور جیل کے ساتھیوں کو ایمان کی دعوت برابر دیتے رہتے تھے۔

جیل کے جلاد ان کے سامنے پھانسی کا تختہ اور پھندہ تیار کرتے تھے، اور یہ لوگ نہایت اطمینان سے بلا کسی ادنیٰ خوف یا رنج کے اس نظارہ کو دیکھتے۔

مولانا یحییٰ علی ان قیدیوں میں سب سے زیادہ خوش نظر آتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جنت سے پہلے جنت میں پہونچ گئے ہیں، اور وہاں کے آرام و راحت سے پہلے اس کا مزہ لوٹ رہے ہیں، وہ بڑے ذوق و شوق سے وہ اشعار پڑھتے جو حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے تختہ دار پر پڑھے تھے۔

ولست اُبالی حین اُقتل مسلماً — علی ای جنب کان فی اللہ مصرعی

وذلک فی ذات الالٰہ وان یشأ — یبارک علیٰ اوصال شلو ممزع

(اگر میں اس حالت میں قتل کیا جاتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ کس پہلو پر مجھے قتل کیا گیا، یہ سب اللہ تعالےٰ کے راستہ میں ہے، وہ اگر چاہے تو جسم کے کٹے ہوئے اور بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو بھی زندگی اور برکت عطا کر سکتا ہے)

یہی حال ان کے رفقاء کا تھا، کھلے ہوئے چہرے، اور راضی و مسرور دل، نماز میں خشوع و انابت، عبادت میں ذوق و شوق ذکر و تسبیح، تلاوت قرآن اور درود محبت میں

ڈوبے ہوئے مناسب حال اشعار!

وہ انگریز جج جس نے ان تینوں کو پھانسی کا حکم سنایا تھا، اچانک اپنا فیصلہ سنانے کے بعد مر گیا، انگریز افسر "پارسن" جس نے مولوی محمد جعفر کو گرفتار کیا تھا، اور ایک روز ان کو آٹھ بجے صبح سے آٹھ بجے رات تک مارتا رہا تھا، پاگل ہو گیا، اور اسی پاگل پن اور جنون کی حالت میں بہت بری طرح اس کی موت واقع ہوئی، اور وہی ہوا جس سے مولوی محمد جعفر تھانیسری نے پہلے ہی آگاہ کیا تھا، صحیح حدیث میں ہے کہ "بعض گرد آلود پریشان حال آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ اگر وہ خدا کی رحمت پر ناز کرتے ہوئے قسم کھا لیتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ ان کی لاج رکھتا ہے"۔

جیل میں بہت سے انگریز اور ان کی خواتین بھی آیا کرتی تھیں جو ان قیدیوں کا تماشہ دیکھتیں اور ان کی پریشانی دیکھ کر خوش ہوتیں لیکن انگریز ان قیدیوں کے سرور و نشاط کو دیکھ کر سخت حیرت میں پڑتے اور ان سے پوچھتے کہ تم موت کے دروازے پر ہو اور کچھ دن میں تم کو پھانسی ہونے والی ہے، تم کو اس کا رنج نہیں ہوتا وہ جواب دیتے کہ یہ شہادت کی وجہ سے ہے، جس کے برابر کوئی نعمت اور سعادت نہیں؟

یہ لوگ انگریز حکام کے پاس جا کر یہ ماجرا بیان کرتے اس سے ان کے اندر لوہ غصہ پیدا ہوتا لیکن ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ ان کے ساتھ کیا کریں، اگر وہ ان کو چھوڑ دیتے ہیں، تو اپنے ان دشمنوں کو چھوڑتے ہیں، جو حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے تھے، اور پھر یہی کام کریں گے اور اگر پھانسی دیتے ہیں، تو اس طرح وہ ان کی منہ مانگی مراد دیتے ہیں۔ اور ان کی خوشی و مسرت کا سامان کرتے ہیں۔

انگریزوں پر یہ بات بہت شاق گزر رہی تھی، وہ نہ اس بات سے راضی تھے، نہ اس

بات سے مطمئن تھے!

وہ اس مسئلہ پر برابر غور کرتے رہے'۔ انگریز ایک قانونی اور ذہین قوم ہیں، آخر کار انھوں نے ایک بیچ کا طریقہ دریافت کرلیا۔

ایک دن انبالہ کا حاکم ضلع (ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ) جیل میں آیا اور اس نے ان تینوں کو یہ حکم سنایا کہ۔

اے باغیو! چونکہ تم پھانسی کے خواہشمند ہو اور اس کو راہ خدا میں شہادت سمجھتے ہو، اور ہم یہ نہیں چاہتے کہ تم اپنی دلی مراد کو پہونچو اور خوشی سے ہمکنار ہو اس لئے ہم پھانسی کا حکم تبدیل کر کے تم کو جزائر انڈمان میں عمر قید کی سزا دیتے ہیں"۔

اب ان لوگوں کی داڑھی اور سر کے بال تراش دیے گئے، مولانا یحییٰ علی اکثر اپنی ترشی ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہتے۔

وفی سبیل اللہ مالقیت۔ جو کچھ تیرے ساتھ کیا گیا سب اللہ کے راستہ میں ہے۔

اللہ کا کرنا کہ معاملہ اس کے برعکس ہوا، اور ایک انگریز کو اس پھانسی کے تختہ پر لٹکایا گیا، جو ان مجاہدین کے لئے تیار کیا گیا تھا۔

قیدیوں کو قید بامشقت کی سزا دی گئی، چنانچہ مولانا یحییٰ علی کو کنویں سے رہٹ کھینچنے کا حکم ملا یہ اتنا بڑا رہٹ تھا کہ مضبوط سے مضبوط جوان بھی اس کو آسانی کے ساتھ نہ کھینچ سکے، مولانا سن رسیدہ تھے، عبادت و ریاضت اور جیل کی مشقت نے رہی سہی قوت بھی زائل کر دی تھی، دن بیحد گرم تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ پیشاب میں خون آنے لگا لیکن وہ صبر و احتساب کے ساتھ اس کام میں لگے رہے، اور حرفِ شکایت زبان پہ

نہ لائے، پھر کوئی آسان کام ان کے حوالہ کیا گیا، جس کو وہ پوری دیانت داری اور خیرخواہی کے ساتھ انجام دیتے اور اپنے جیل کے رفقا سے کہتے کہ جب تم کو یہاں کھانا کپڑا ملتا ہے تو تم اپنی ڈیوٹی فرض شناسی اور خیر خواہی سے کیوں نہیں انجام دیتے۔

مولانا اسی طرح جیل میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے رہے، اور وعظ و نصیحت کرتے رہے، یہاں تک کہ بہت سے مجرم ان کے ہاتھ پر تائب ہوئے۔

بعد میں مولانا انبالہ سے لاہور منتقل کر دیئے گئے اور نئے جیل میں ایک سال تک رہنا پڑا، یہاں ان کا واسطہ بہت سے چور ڈاکو اور فساق و فجار سے پڑا انھوں نے ان کو وعظ و نصیحت شروع کی وہ ان کے سامنے معصیت اور فسق و فجور کی مذمت اور دین داری، تقویٰ، پاکیزگی کے فضائل بیان کرتے، اطاعت، توبہ، انابت اور اصلاح حال پر ان کو آمادہ کرنے کی کوشش کرتے اور توحید، نماز اور روزہ کے اہتمام کی دعوت دیتے اور اللہ کے عذاب سے ڈراتے ان کی کوشش سے بہت سے چور اور ڈاکو تائب ہوئے اور ان کی زندگی میں انقلاب آگیا، اور وہ خدا کے سچے اور مخلص بندے بن گئے۔

ان لوگوں میں ایک شخص بلوچستان کا رہنے والا تھا، اور بڑا ظالم و جابر اور بے رحم شخص تھا، اس نے کئی بار جیل کے عملہ کے لوگوں کو مارا پیٹا، وہ اپنی ڈیوٹی بھی انجام نہ دیتا تھا، اور غنڈہ گردی کرتا رہتا تھا اس کو کئی بار سزا بھی ہوئی، لیکن وہ باز نہ آیا آخر کار جیلر اس سے مایوس ہو گئے اور اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا، ایک مرتبہ اس کو مولانا کے قریب رات گزارنے کا موقع ملا اور مولانا کی گفتگو سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ اس کی زندگی یکسر تبدیل ہو گئی، وہ اپنی ڈیوٹی بھی خوش اسلوبی اور امانت داری سے انجام دینے لگا، اس کی بیڑیاں اور زنجیریں بھی کھول دی گئیں وہ پانچوں نمازوں کا پابند ہو گیا، خدا کے خوف سے

اس کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں، جو دیکھتا اس کو خدا کا ولی سمجھتا۔

مولانا اور ان کے رفقاء اسی طرح ایک جیل سے دوسرے جیل میں منتقل کئے جاتے رہے، یہاں تک کہ دسمبر ۱۸۶۵ء میں وہ جزائر انڈمان کے پورٹ بلیر پہونچ گئے وہاں دو سال کے بعد (جو انھوں نے عبادت اور دعوت میں گزارے تھے) مولانا یحییٰ علی اپنے مالک سے جاملے یہ واقعہ ۳ر فروری ۱۸۶۸ء بمطابق ۱۲۸۴ھ میں پیش آیا۔

۱۸ر جنوری ۱۸۸۳ء میں مولوی محمد جعفر تھانیسری کی رہائی اور معافی کا حکم آگیا اور وہ اٹھارہ سال قید بامشقت کے بعد رہا ہو گئے۔

شہداء بالاکوٹ کا مقام اور پیغام[1]

بالاکوٹ کے معرکہ میں وہ پاک نفوس شہید ہوئے جو عالم انسانیت کے لئے رونق و زینت، اور مسلمانوں کے لئے شرف و عزت اور خیر و برکت کا باعث تھے، مردانگی و جوانمردی، پاکیزگی و پاکبازی، اتقدس و تقویٰ، اتباع سنت و شریعت، اور دینی حمیت و شجاعت کا وہ عطر جو خدا جانے کتنے باغوں کے پھولوں سے کھینچا گیا تھا، اور انسانیت اور اسلام کے باغ کا جیسا "عطر مجموعہ" صدیوں سے تیار نہیں ہوا تھا، اور جو ساری دنیا کو معطر کرنے کے لئے کافی تھا، ۲۴ر ذوالقعدہ ۱۲۴۶ھ کو بالاکوٹ کی مٹی میں مل کر رہ گیا، مسلمانوں کی نئی تاریخ بنتے بنتے رہ گئی، حکومت شرعی ایک عرصہ کے لئے خواب بے تعبیر ہو گئی،

---

[1] ماخوذ از سیرت سید احمد شہید جلد ثانی۔

بالاکوٹ کی زمین اس پاک خون سے لالہ زار اور اس گنج شہیداں سے گلزار بنی جس کے اخلاص وللّٰہیت، جس کی بلند ہمتی واستقامت، جس کی جرأت وہمت، اور جس کے جذبۂ جہاد وشوق شہادت کی نظیر پچھلی صدیوں میں ملنی مشکل ہے، بالاکوٹ کی سنگلاخ وناہموار زمین پر چلنے والے بے خبر مسافر کو کیا خبر کہ یہ سرزمین کن عشاق کا مدفن اور اسلامیت کی کس متاع گرانمایہ کا مخزن ہے،

یہ بلبلوں کا صبا مشہد مقدس ہے

قدم سنبھال کے رکھیو یہ تیرا باغ نہیں

اللہ کے کچھ مخلص بندوں نے ایک مخلص بندہ کے ہاتھ پر اپنے مالک سے اس کی رضا اس کے نام کی بلندی اور اس کے دین کی فتحمندی کے لئے آخری سانس تک کوشش کرنے اور اس کی راہ میں اپنا سب کچھ لٹا دینے کا عہد کیا تھا جب تک ان کے دم میں دم رہا اسی راہ میں سرگرم رہے، بالآخر اپنے خون شہادت سے اس پیمان وفا پر آخری مہر لگا دی یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ۲۴ ذوالقعدہ کا دن گزر کر جو رات آئی وہ پہلی رات تھی جس رات کو وہ سبک دوش وسبک سر ہو کر میٹھی نیند سوئے۔

وہ خلعت شہادت پہن کر جس کریم کی بارگاہ میں پہنچے وہاں نہ مقاصد کی کامیابی کا سوال ہے نہ کوششوں کے نتائج کا مطالبہ، نہ شکست وناکامی پر عتاب ہے نہ کسی سلطنت کے عدم قیام پر محاسبہ، وہاں صرف دو چیزیں دیکھی جاتی ہیں، صدق واخلاص اور اپنی مساعی اور وسائل کا پورا استعمال، اس لحاظ سے شہداء بالاکوٹ اس دنیا میں سرخرو ہیں، اور انشاء اللہ دربار الٰہی میں بھی باآبرو کہ انھوں نے اخلاص کے ساتھ اپنے مالک کی رضا کے لئے اپنی مساعی اور وسائل کے استعمال میں ذرہ برابر کمی نہیں کی، ان کا وہ خون شہادت جو ہماری مادی نگاہوں کے سامنے بالاکوٹ کی مٹی میں جذب ہو گیا، اور اس کے جو چھینٹے پتھر و ں

پر باقی تھے، ۲۶ ذوالقعدہ کی بارش نے ان کو بھی دھو دیا، وہ خون جس کے نتیجہ میں کوئی سلطنت قائم نہیں ہوئی کسی قوم کا مادی و سیاسی عروج نہیں ہوا، اور کوئی نخل آرزو اس سے سرسبز ہو کر بارآور نہیں ہوا، اس خون کے چند قطرے اللہ کی میزان عدل میں پوری پوری سلطنتوں سے زیادہ وزنی ہیں، یہ فقیرانِ بے نوا جنھوں نے عالم مسافرت میں بے کسی کے ساتھ جان دی اور جن کی اب دنیا میں کوئی مادی یادگار نہیں یہ اللہ کے یہاں اُن بانیانِ سلطنت اور مؤسسین حکومت سے کہیں زیادہ قیمتی اور معزز ہیں، جن کی تصویر قرآن نے ان الفاظ میں کھینچی ہے "وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ وَإِن يَقُولُوا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ" (منافقون ۴)

بے شک شہدائے بالاکوٹ کے خون نے دنیا کے سیاسی و جغرافیائی نقشہ میں کوئی فوری تغیر نہیں پیدا کیا، خون شہادت کی ایک مختصر سی سرخ لکیر ابھری تھی، اس کی جگہ نہ جغرافیہ نویس کے طبعی نقشہ میں تھی، نہ مورخ کے سیاسی مرقع میں، لیکن کسے خبر کہ یہ خونِ شہادت دفتر قضا و قدر میں کس اہمیت و اثر کا مستحق سمجھا گیا، اس نے مسلمانوں کے نوشتہ تقدیر کے کتنے دھبے دھوئے، اس نے اللہ تعالیٰ کے یہاں جس کے یہاں محو و اثبات کا عمل جاری رہتا ہے، "يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ وَعِندَهُ أُمُّ الْكِتَابِ" (رعد ۳۹) کون سے نئے فیصلے کروائے، اس نے کسی مستحکم سلطنت کے لئے خاتمہ و زوال اور کسی پسماندہ قوم کے لئے عروج و اقبال کا فیصلہ کروایا، اس سے کس قوم کا بخت بیدار ہوا، اور کس سرزمین کی قسمت جاگی اس نے کتنی بظاہر ناممکن الوقوع باتوں کو ممکن بنا دیا اور کتنی بعید از قیاس چیزوں کو واقعہ اور مشاہدہ بنا کے دکھا دیا۔

یوں تو شہدائے بالاکوٹ میں سے ہر فرد کا پیغام یہ ہے کہ "يَا لَيْتَ قَوْمِي يَعْلَمُونَ"

بِمَا غَفَرَ لِي رَبِّي وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُكْرَمِينَ ۝ (یٰسین ۲۶، ۲۷) مگر گوش شنوا اور دیدۂ بینا کے لئے ان کا مجموعی پیغام یہ ہے کہ ہم ایک ایسے خطۂ زمین کے حصول کے لئے جد و جہد کرتے رہے، جہاں ہم اللہ کے منشا اور اسلام کے قانون کے مطابق آزادی کے ساتھ زندگی گذار سکیں، جہاں ہم دنیا کو اسلامی زندگی اور اسلامی معاشرے کا نمونہ دکھا کر اسلام کی طرف مائل اور اس کی صداقت و عظمت کا قائل کر سکیں، جہاں نفس و شیطان، حاکم و سلطان اور رسم و رواج کے بجائے خالص اللہ کی حکومت و اطاعت ہو "وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ" (الانفال ۳۹) جہاں طاعت و عبادت اور صلاح و تقویٰ کے لئے اللہ کی زمین وسیع اور فضا سازگار ہو، اور فسق و فجور و معصیت کے لئے زمین تنگ اور فضا ناسازگار ہو، جہاں ہم کو صدیاں گزر جانے کے بعد پھر "الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ"[1] کی تفسیر اور تصویر پیش کرنے کا موقع مل سکے، تقدیر الٰہی نے ہمارے لئے اس سعادت و مسرت اور اس آرزو کی تکمیل کے مقابلے میں میدان جنگ کی شہادت اور اپنے قرب و رضا کی دولت کو ترجیح دی، ہم اپنے رب کے اس فیصلہ پر رضامند و خورسند ہیں، اب اگر اللہ نے تم کو دنیا کے کسی حصہ میں کوئی ایسا خطۂ زمین عطا فرمایا، جہاں تم اللہ کے منشا اور اسلام کے قانون کے مطابق آزادی کے ساتھ زندگی گذار سکو، اور اسلامی زندگی اور اسلامی معاشرہ کے قائم کرنے میں کوئی مجبوری مخل اور کوئی بیرونی طاقت حائل نہ ہو، پھر بھی تم اس سے گریز کرو، اور ان شرائط و اوصاف کا ثبوت

---

[1] ترجمہ۔ وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو قدرت دیں ملک میں، تو وہ قائم رکھیں نماز اور دیں زکوٰۃ اور حکم کریں بھلے کام کا اور منع کریں برائی سے (الحج: ۴۱)

نہ دو، جو مہاجرین و مظلومین کے اقتدار اور سلطنت کا تمغۂ امتیاز ہیں[1]، تو تم ایسے کفران نعمت اور ایک ایسی بد عہدی کے مرتکب ہو گئے جس کی نظیر تاریخ میں ملنی مشکل ہے، ہم نے جس زمین کے چپے چپے کے لئے جد و جہد کی اور اس کو اپنے خون سے رنگین کر دیا، اکوڑے اور شیدو کے میدان اور نورو اور مایار کی رزم گاہ سے لیکر بالاکوٹ کی شہادت گاہ تک ہمارے خون شہادت کی مہریں اور ہمارے شہیدوں کی قبریں ہیں، تم کو خدا نے اس زمین کے وسیع رقبہ اور سرسبز و شاداب خطے سپرد فرمائے، اور بعض اوقات قلم کی ایک جنبش اور برائے نام کوشش نے تم کو عظیم سلطنتوں کا مالک بنا دیا، "ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ"[2]، اب اگر تم اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور تم نے آزادی کی اس نعمت اور خداداد سلطنت کی اس دولت کو جاہ و اقتدار کے حصول اور حقیر و فانی مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنایا، تم نے اپنے نفوس اور اپنے متعلقین، ملک کے شہریوں اور باشندوں پر خدا کی حکومت اور اسلام کا قانون جاری نہ کیا، اور تمہارے ملک اور تمہاری سلطنتیں اپنی تہذیب و معاشرت اور اپنے قانون و سیاست اور تمہارے حاکم اپنے اخلاق و سیرت اور اپنی تعلیم و تربیت میں غیر اسلامی سلطنتوں اور غیر مسلم حاکموں سے کوئی امتیاز نہیں رکھتے، تو تم آج دنیا کی ان قوموں کے سامنے، جن سے تم نے مسلمانوں کے لئے الگ خطۂ زمین کا مطالبہ کیا

---

[1] "أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ، الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَنْ يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ۔" (الحج ۳۹، ۴۰)

[2] پھر ہم نے تم کو ان کے بعد زمین میں جانشین کیا تاکہ دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔ (یونس۔ ۱۴)

اور کل خدا کی عدالت میں جہاں اس امانت کا ذرہ ذرہ حساب دینا پڑیگا، کیا جواب دو گے؟

خدا نے تم کو ایک ایسا نادر ورریں موقعہ عطا فرمایا ہے، جس کے انتظار میں چرخ کہن نے سیکڑوں کروٹیں بدلیں، اور تاریخ اسلام نے ہزاروں صفحے الٹے، جس کی حسرت و آرزو میں خدا کے لاکھوں پاک نفس اور عالی ہمت بندے دنیا سے چلے گئے، اس موقعہ کو اگر تم نے ضائع کردیا، تو اس سے بڑا تاریخی سانحہ اور اس سے بڑھ کر حوصلہ شکن اور یاس انگیز واقعہ نہ ہوگا، بالاکوٹ کے ان شہیدوں کا جو ایک دور افتادہ بستی کے ایک گوشہ میں آسودۂ خاک ہیں، ان سب لوگوں کے لئے جو اقتدار و اختیار کی نعمت سے سرفراز اور ایک آزاد اسلامی ملک کے باشندے ہیں، پیغام ہے: "فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ"[1]

---

[1] کیا یہ احتمال بھی ہے کہ اگر تمہاری حکومت ہو تو تم زمین میں فساد کرو اور قطع رحمی سے کام لو (محمد ۲۲)